# تحریک خلافت

قاضی محمد عدیل عباسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی


| | | |
|---|---|---|
| پہلی اشاعت | : | 1978 |
| تیسری طباعت | : | 2010 |
| تعداد | : | 550 |
| قیمت | : | -/67 روپے |
| سلسلۂ مطبوعات | : | 762 |


Tahreek-e-Khilafat

*by*

**Qazi Mohd. Adeel Abbasi**

**ISBN :978-81-7587-388-9**

**ناشر:** ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

**طابع:** جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

**ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ**
ڈائرکٹر

اپنی مرحومہ شریکِ حیات

نجم النساء بیگم

کے نام

# فہرست


| | |
|---|---|
| دیباچہ | 12 |
| پہلا باب :۔ مسئلۂ خلافت کی نوعیت | 15 |
| دوسرا باب :۔ مسلمانوں کی روحانی اذیّت کے اسباب | 21 |
| 1 ۔ مسئلۂ خلافت کا تقدّس | 21 |
| 2 ۔ ترکی اور بلادِ یورپ | 21 |
| 3 ۔ سلطان عبدالحمید | 28 |
| 4 ۔ معلمین امّت | 29 |
| 5 ۔ حرمین الشریفین | 30 |
| 6 ۔ ایک اور وجہ | 30 |
| تیسرا باب :۔ میدانِ عمل | 36 |
| 1 ۔ قانونی جدّوجہد | 37 |
| 2 ۔ خلافت کمیٹی کا قیام | 38 |
| 3 ۔ جمعیۃ علماء ہند | 39 |
| 4 ۔ علمائے ربّانی اور جہاد بالسیف ۔ ہندوستان میں متحدہ جمہوری حکومت کا تخیل | 40 |
| چوتھا باب :۔ جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست | 51 |
| 1 ۔ عالمگیر جنگ 1914 ـــــ 1918ء | 52 |

| | |
|---|---|
| ۲ ۔ جنگ میں ترکی کی شرکت | 52 |
| 3 ۔ دورانِ جنگ ہندوستان کا حال | 54 |
| ۴ ۔ سرسید اور سیاست ہند | 57 |
| 5 ۔ علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج | 61 |
| ۶ ۔ دوران جنگ برطانیہ کا طرزِ عمل اور ناکام مقابلہ | 63 |
| 7 ۔ لکڑی کا صندوق | 65 |
| 8 ۔ ریشمی رومال | 66 |
| 9 ۔ حکومتِ برطانیہ کے وعدے | 67 |
| 10 ۔ مولانا محمد علی کی نظر بندی | 69 |
| 11 ۔ مولانا ابوالکلام آزاد | 71 |
| 12 ۔ عارضی صلح یا التوائے جنگ | 74 |
| 13 ۔ راہِ عمل کی تلاش | 76 |
| 14 ۔ مسز بسنٹ اور عوام رد دل | 78 |
| 15 ۔ لیڈر کی آمد | 79 |
| 16 ۔ رولٹ بل | 81 |
| 17 ۔ سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر | 84 |
| 18 ۔ جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام | 86 |
| 19 ۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا ردِ عمل | 88 |
| 20 ۔ جنگِ استقلالِ افغانستان | 88 |
| 21 ۔ راولپنڈی کانفرنس | 92 |
| 22 ۔ امیر امان اللہ خاں | 93 |
| 23 ۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس | 94 |
| 24 ۔ یوم دعا | 99 |
| 25 ۔ خلافت کمیٹی اور مہاتما گاندھی | 102 |
| 26 ۔ مولانا محمد علی کی رہائی اور اجلاسِ کانگریس امرت سر | 102 |

27 ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس 103
28 ۔ عرب میں انگریزوں کی ریشہ دوانی 106
29 ۔ صلح کانفرنس لندن 108
پانچواں باب :۔ تاج برطانیہ کی وفادار رعایا کی عرضداشتیں 111
1 ۔ انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا جلسہ 111
2 ۔ مقیم لندن حضرات کی عرضداشت 112
3 ۔ وزیر ہند کا جواب 113
4 ۔ یہودی اور فلسطین 114
5 ۔ اخبارات کے تبصرے 115
6 ۔ تمام دنیا میں وفد لے جانے کا خیال 117
7 ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز 117
8 ۔ دارالعلوم دیوبند کا رویہ 118
9 ۔ وفدِ خلافت اور مہاتما گاندھی 118
10 ۔ وفدِ خلافت کی کارگزاریاں 120
11 ۔ مسٹر لائیڈ جارج سے ملاقات 121

چھٹا باب :۔ مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لیے مولانا آزاد کی کوشش 127
1 ۔ بیعتِ امامت 127
2 ۔ تحریکِ ہجرت 131
3 ۔ ہندوستان میں جوش و خروش 139
4 ۔ میرٹھ خلافت کانفرنس 140
5 ۔ دیوبند کا عظیم الشان جلسہ 142
6 ۔ 19 مارچ 1920ء ۔ یوم خلافت 143
7 ۔ لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکتہ الآرا تقریر 145

| | |
|---|---|
| 8 ۔ علمائے صوبۂ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ | 146 |
| ساتواں باب: اعلان وفاداری کا انجام | 148 |
| 1 ۔ حالات یورپ و ترکی | 148 |
| 2 ۔ اناطولیہ | 148 |
| 3 ۔ تھریس | 149 |
| 4 ۔ یونان کا حملہ | 149 |
| 5 ۔ معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح) | 151 |
| آٹھواں باب: مہاتما گاندھی کا اعلانِ جنگ | 153 |
| 1 ۔ مہاتما گاندھی کی قیادت | 153 |
| 2 ۔ دورِ خود شناسی | 155 |
| 3 ۔ گورنمنٹ کو الٹی میٹم | 155 |
| 4 ۔ دھماکے کا وقت آرہا ہے | 157 |
| 5 ۔ یکم اگست 1920ء "زیرو آور" | 157 |
| 6 ۔ پانچ سو علماء کی جانب سے ترک موالات کا فتویٰ | 159 |
| 7 ۔ لوکمانیہ تلک | 161 |
| 8 ۔ کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس | 162 |
| 9 ۔ ناگپور کانگریس | 163 |
| 10 ۔ امن سبھا | 165 |
| 11 ۔ ضلع کانگریس کانفرنس الہ آباد | 166 |
| 12 ۔ مولانا محمود حسن کی آمد اور جمعیۃ علمائے ہند کی کارگزاری | 167 |
| 13 ۔ جمعیۃ علماء کا دوسرا سالانہ اجلاس | 168 |
| 14 ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام | 169 |
| نواں باب: تحریک عروج پر | 174 |
| 1 ۔ نیا ہندوستان | 174 |
| 2 ۔ علی گڑھ پر دھاوا | 176 |

3 - مدرسہ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزاد کا دھاوا 177
4 - ایک کروڑ روپے کی فراہمی کی کہانی 179
5 - کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ 180
6 - مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ 181

دسواں باب:- حکومت کا ردعمل 183
1 - کراچی کا مقدمہ 183
2 - عدالت سیشن کی کارروائی 186
3 - افغانی ہوّا 186
4 - حکومت کا رویہ 191
5 - خواتین 192
6 - چند مثالیں 193
7 - مولانا آزاد کا پیغام 196
8 - باپ کا خط بیٹے کے نام 196

گیارھواں باب:- جنگ ترکی و یونان 199
1 - سمرنا پر یونانی قبضہ 199
2 - مصطفیٰ کمال کا تدبر 210
3 - اماسیہ کا اہم جلسہ 202
4 - ترکی کی فوجی حالت اور یونانیوں کے مظالم 203
5 - مصطفیٰ کمال برخاست 204
6 - بولشویکوں سے تعلقات 201
7 - ترکانِ اناطولیہ کا جوش 208
8 - اختصار فتویٰ شیخ الاسلام با اجلاس مجلس جدید
مشیران سلطنت و داماد فرید پاشا 210
9 - فتویٰ حجۃ الاسلام جناب شیخ الاسلام قسطنطنیہ 211

۱۰۔ یونان کا حملہ 212

۱۱۔ یونان کا دوسرا حملہ 213

12۔ یونان کا تیسرا حملہ 214

۱۳۔ ترکی وفد کے نتائج 215

۱۴۔ فرانس سے جنگ 218

15۔ لوزان کانفرنس 218

16۔ معاہدہ سیورے میں ترمیم 219

17۔ تحریکِ خلافت کا اثر فتح ترکی پر 221

بارھواں باب:۔ تحریکِ خلافت کا دوسرا دور 225

۱۔ حکومتِ بمبئی کا کیمونک اور مہاتما گاندھی کا جواب 225

2۔ بردولی میں سول نافرمانی 227

3۔ پرنس آف ویلز کی آمد 228

۴۔ حکومت کا رویہ اور تحریک میں نیا خون 230

5۔ آنکھوں دیکھا حال 231

6۔ آگرہ صوبائی خلافت و کانگریس کانفرنس 234

7۔ احمد آباد کانگریس 237

8۔ مسٹر محمد علی جناح 239

9۔ اندرا گاندھی 240

۱۰۔ صلح کی بات 240

۱۱۔ احمد آباد کانگریس کے بعد 241

12۔ آل پارٹیز کانفرنس 241

13۔ بردولی میں پھر سول نافرمانی 242

۱۴۔ چورا چوری کا واقعہ 243

15۔ گاندھی جی کی گرفتاری 244

| | |
|---|---|
| 16۔ گاندھی اور مالوی | 245 |
| ١٦۔ کونسلوں میں داخلہ | 247 |
| 18۔ ترکی کا حال | 247 |
| ١٩۔ شبہات۔ کانگریس میں اختلاف آرار | 248 |
| 20۔ گاندھی جی کی رہائی | 250 |
| 21۔ طلاپ کانفرنس | 250 |
| 22۔ خلافت کانفرنس بلگام | 253 |
| تیرھواں باب:۔ خلافت کا خاتمہ | 254 |
| 1۔ احیائے خلافت اسلامیہ کی ایک اور کوشش | 258 |
| 2۔ خلافت کانفرنس لکھنؤ | 265 |
| 3۔ ایک آخری سوال | 268 |
| ۴۔ تحریکِ خلافت کے انعامات و تاثرات | 269 |
| 5۔ وطنی جذبہ | 271 |
| 6۔ انگریز سے دشمنی | 274 |
| 7۔ سادگی اور خود آگاہی | 276 |
| 8۔ عصر جدید | 276 |
| ضمیمہ: کتابیں جو مطالعے میں آئیں | |

# دیباچہ

جب مجھ سے فرمائش کی گئی کہ ایک ہفتہ وار اخبار میں "تحریکِ خلافت" پر ایک سلسلۂ مضامین لکھوں تو میں نے فوراً اسے منظور کر لیا اور بطورِ تمہید چند قسطیں "تاریخِ ترکی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے لکھ بھی دیں۔ خیال تھا کہ اس کے بعد بس قلم برداشتہ لکھ دوں گا کیونکہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ چونکہ خود اس تحریک میں شریک تھا اور بہت سا آنکھوں دیکھا حال ہے اس لیے دقت کیا ہوگی لیکن پھر کچھ دنوں دوسرے کاموں میں لگے رہنے کے بعد جب اچانک اس وعدے کی تکمیل کا ایک دن خیال آیا اور خیالات کو مجتمع اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کام بے حد مشکل ہے۔

"تحریکِ خلافت" پر قلم اٹھانے کے معنی یہ تھے کہ عہدِ قدیم کی رعنائیوں اور عہدِ جدید کے طلوع ہونے والے آفتاب کی تابناکیوں کا مطالعہ کیا جائے — بستی جیسے دور افتادہ مقام پر نہ اس کے لیے کتابیں میسر تھیں اور نہ اخبارات اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں تلاش میں سفر کروں۔ اس لیے جو کچھ میسر ہو سکا اسی پر اکتفا کرنی پڑی۔

جہاں تک تحریکِ خلافت کی تاریخ کا سوال ہے دیکھا گیا ہے کہ اکثر مصنفین و مؤلفین اس پر سرسری گزر گئے اور جس نے کچھ لکھا بھی تو تاریخ تو کجا سنہ تک موجود نہیں۔ اس کے تحقیقاتی مطالعہ کے لیے اخبارات کی فائلیں درکار تھیں لیکن بجز مشرق اور زمیندار لاہور کے چند پرچوں کے جو ایک عزیز کے ہاں محفوظ تھے ہمدم (لکھنؤ) سیاست (امرتسر) مدینہ (بجنور) اور بندے ماترم (لاہور) وغیرہ کی کوئی فائل نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اخبارات کی کل فائلیں جلا دی گئی ہیں۔ البتہ گاندھی جی کی زندگی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور اس سے کافی امداد ملی۔ کیونکہ 1918ء سے 1925ء تک گاندھی جی کی زندگی اور تحریکِ خلافت ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔

اسلامی خلافت کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ لیکن آج وہ ایک بھولا ہوا سبق ہے ممکن ہے اس کا یاد دلانا بعض لوگوں کے نزدیک نہ صرف غیر ضروری بلکہ زمانۂ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں نامناسب ہو لیکن اس سلسلے میں دو باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اوّل یہ کہ جو لوگ اسلام کی ہر ہر چیز پر عقیدہ رکھتے ہیں ان کے لیے ان داغہائے سینہ کی یاد تازہ رکھنا ضروری ہے جو اصولاً صحیح اقدام ہوتے ہوئے محرومی کا شکار ہو گئے اور جن پر عمل درآمد ہو یا نہ ہو بطور عقیدہ ان کا ذہنوں میں رہنا از بس لازمی ہے۔ تحریک خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اسی سے ہمارے ملک میں آزادیٔ کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ اوّل مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلّت سے نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خود اعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریکِ خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اُجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پا لیا۔

یہ صحیح ہے کہ تحریکِ خلافت کے روحِ رواں مہاتما گاندھی تھے لیکن اس طرح یہ بھی صحیح ہے کہ تحریکِ خلافت نے گاندھی جی کو ہندوستان کو متحد کرنے اور اسے آزادیٔ کامل کی منزل کی جانب گامزن کرانے کا مواد فراہم کیا اس لیے جن لوگوں کو تحریکِ آزادیٔ ہند کی تاریخ سے دلچسپی ہے ان کو تحریکِ خلافت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔

یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ میری غرض ہندوستان کے اندر تحریکِ خلافت کا ذکر کرنا ہے اور جنگِ یونان و ترکی اور عزلِ خلافت اسی بحث سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ اور جو امور آئے ہیں اور جن کا تعلق بیرونِ ہند سے ہے ان پر سے سرسری گزر جانا ہی مناسب نظر آیا۔ ان کا تذکرہ صرف اس لیے آیا ہے کہ یا تو ان کا تعلق اندرونِ ہند تحریکِ خلافت و تحریکِ آزادی سے تھا یا حالاتِ ترکی پر وہ اثر انداز ہوئے۔ اس عظیم کام کا بوجھ اٹھانے کے لیے میرے کندھے کمزور تھے لیکن میں نے ہمت کر کے اس کو انجام دیا۔ اگر اسے نقشِ اوّل تصور کر کے کسی صاحبِ عزم میں نقشِ ثانی کی ترغیب پیدا ہو تو میں اسے اپنی کامیابی تصور کروں گا۔

میں حکیم ابو الکلام صاحب گورکھپور، جناب داعد صاحب مالک داعد لائبریری گورکھپور، سید محمد یسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، جناب صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ، مقبول احمد صاحب پرنسپل خیر انٹر کالج بستی، مولانا عبد الحمید صاحب سابق ناظم اہل حدیث کانفرنس اور ان تمام لوگوں کا شکر گذار ہوں جنھوں نے کتابیں فراہم کیں اور اخبارات و رسائل مہیا کیے اور میری ہمت افزائی کی۔ خاص طور پر عزیزی حامد علی صاحب میونسپل کمشنر گورکھپور نے میری معاونت کی۔ عزیز موصوف کی ذاتی وسیع لائبریری واقع کوٹھی گلفشاں محلہ قاضی پور سے مشرق کے اکثر اور زمیندار کے کچھ نایاب پرچے مجلد شکل میں اور بہت سی کتابیں ملیں جن کے بغیر یہ کتاب مکمل نہیں

چونکہ تھی میں عزیز موصوف کی اس معاونت کے لیے دعا گو ہوں

میں نے یہ کتاب اپنی مرحومہ شریکِ حیات کے نام معنون کی ہے۔

میری شادی 21 اپریل 1918ء کو نجم النساء بی بی سے ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر 18-19 سال اور اس کی عمر 16-17 سال تھی۔ 1920ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے یونیورسٹی آف الہٰ آباد میں داخلہ لیا اور ناگپور کانگریس کے بعد ترکِ موالات کی تحریک میں شریک ہو گیا۔ ترکِ تعلیم کے بعد جب میں گھر پہنچا تو وہاں غصہ اور نا امیدی کا ایک طوفان پایا اور میرے اوپر ہر طرح کا دباؤ اس تحریک سے الگ رہنے کے لیے ڈالا جا رہا تھا۔ میں بہت مغموم تھا اور چپکے چپکے بھاگ کر جیل جانا چاہتا تھا لیکن میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا تم اتنے مغموم اور رنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ میں نے کہا تم گھر کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہی ہو میں بھاگنا اور جیل جانا چاہتا ہوں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے بلا ایک لمحہ توقف کے کہا "تو پھر بھاگ جاؤ اور جیل جاؤ" اب میں نے کہا لیکن میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے "بھاگ کر کہیں جاؤں تو کیسے" اس نے بڑی خندہ پیشانی سے فوراً کہا "کل مجھے ابا دس روپے دے گئے ہیں اس کو لے لو اور بھاگ جاؤ" حالانکہ رسم و رواجِ وقت کے مطابق یہی اس کی کل پونجی تھی۔ یہ رقم میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ میں رات میں بھاگ کر نکل گیا اور کانپور مولانا حسرت موہانی کے پاس پہنچا وہاں سے بجنور "مدینہ" اخبار میں گیا۔ احمد آباد کانگریس کے بعد اخبار "زمیندار" لاہور کا بحیثیت چیف ایڈیٹر چارج لیا اور گرفتار ہو کر ایک سال لاہور سنٹرل جیل میں رہا۔ زندگی میں آسودگیِ نفس کے بہت سامان ملے لیکن یہ دس روپے جو اس نے دیے تھے اور جس طرح اس نے مجھے تحریک میں کود پڑنے اور جیل جانے کی ترغیب دی تھی حالانکہ وہ ایک اردو خواں پردہ نشین کمسن لڑکی تھی اور اس وقت جیل کا خیالی منظر بڑا ہولناک تھا مجھے ہمیشہ یاد رہا۔ 15 دسمبر 1972ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اسی کی یاد سے اس کتاب کو نسبت دینا میں انسب ترین سمجھتا ہوں۔

محمد عدیل عباسی

# پہلا باب

# مسئلۂ خلافت کی نوعیت

خلافتِ مرکزیۂ اسلامیہ کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام کا۔ فروری 1920ء میں بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مبسوط خطبۂ صدارت میں مسئلۂ خلافت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اسلام کا قانونِ شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحبِ حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجرا و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے پوری طرح طاقتور ہو۔ ........

"صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطینِ عثمانیہ کو حاصل ہے۔ اور اس وقت از روئے شرع تمام مسلمانانِ عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور اسلام کی جگہ جاہلیت مول لی۔ جس نے ان کے مقابلہ میں لڑائی کی یا ان کے دشمنوں کا ساتھ دیا، اس نے خدا اور اس کے رسول سے لڑائی کی۔ اسلام کا حکمِ شرعی ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے یا اس کو خلیفۂ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیرِ اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا مسئلہ نہ ہو گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائے گی یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا پس اس حالت میں تمام مسلمانانِ عالم کا اولین فرض ہو گا کہ یہ اس قبضہ کو وطن سے ہٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے

لیے وقف کر دیں۔

"اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں بیت المقدس اسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریف۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جان کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں نہ جانے دیں۔ علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں۔ اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا بلکہ بیک وقت و بیک دفعہ تمام مسلمانانِ عالم کا فرض ہوگا[1]

مشہور نو مسلم انگریز مصنف و مترجم قرآن مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال، سابق ایڈیٹر بمبئی کرانیکل، نے ڈاکٹر سید محمود کی کتاب "خلافت اور اسلام" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"مذہب اسلام حیاتِ انسانی کا مکمل قانون ہے اور تہذیب و شائستگی کا مخزن ہے جو ابھی تک اپنے عروج کو نہیں پہنچا ہے۔ خدا کے قوانین جو بنی نوع انسانی پر کلیتاً حکمران ہیں اور وہ قوانین جن کی پابندی پر انسانی زندگی کی اخلاقی ترقی مبنی ہے سوائے قرآن شریف کے اور کسی کتاب میں صراحت کے ساتھ درج نہیں ہیں۔"

"اسلامی تہذیب قوانینِ الٰہی پر مبنی ہے، خلیفہ اس کا دنیوی سردار ہے خواہ اہل عرب ہو یا غیر اہل عرب۔ خواہ اس کا دارالحکومت بغداد ہو، مدینہ ہو یا قسطنطنیہ اور اسلامی تہذیب اور ترقی کا مرکز، مرکزِ خلافت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔"[2]

اب پچاس سال گزرنے کے بعد جب خلافت کا وجود بھی باقی نہیں ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ نہ تھا اور تمام ہندوستانیوں نے اسے غلط سمجھا تھا تو یہ بڑی جسارت کی بات ہوگی۔ اسلام کے مذہبی مسائل وقت کے ساتھ بدلا نہیں کرتے۔ معذوری دیگر چیز ہے۔

تحریکِ خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں رہی بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہوگا کہ اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہو کر اس کا کل بار اپنے کندھوں پر

---

[1] مولانا آزاد کا یہ خطبۂ صدارت نظر ثانی اور ضمیموں کے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں "رسالہ مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے نام سے البلاغ پریس (کلکتہ) سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس وقت میرے پیش نظر حالی پبلشنگ ہاؤس (دہلی) کا نسخہ ہے جو 1961ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس اسی ایڈیشن کے صفحہ 265 سے اخذ کیا گیا ہے۔

[2] خلافت اور انگلستان:۔ ڈاکٹر سید محمود (مطبوعہ 1921ء) دیباچہ

نہ لیتے تو تحریکِ خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی اس اعلان کے ساتھ تحریکِ خلافت میں شریک ہوئے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے۔ اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بارہا کہا ہے کہ تحریکِ خلافت کو مسلمانوں کا ایک مقدس معاملہ سمجھ کر میں اس میں شریک ہوا ہوں۔ عزلِ خلافت کے بعد مہاتما گاندھی نے کہا کہ اگر میں ایک نجومی یا غیب داں بھی ہوتا اور مجھے معلوم ہوتا کہ ترکی میں خلافت توڑ دی جائے گی تب بھی میں اس میں اسی عزم و حوصلے سے شرکت کرتا۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو، سی آر داس، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالوی وغیرہ اسی موقف کے حامی تھے۔ مسلمانوں میں ہر طبقۂ خیال اور ہر نقطۂ نظر کے علماء، دلیڈرانِ خلافت" خلافت" کو خالص مذہبی معاملہ سمجھتے اور اسی کے مطابق استدلال کرتے تھے۔ تمام علماء اور صوفیاءِ ہند فرنگی محل، ندوۃ العلماء، بریلی، بدایوں اور امرتسر وغیرہ میں حنفی، دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث علماء اور خانقاہوں کے سجادہ نشینوں میں اختلاف کی نوعیت مذہبی حیثیت کی نہ تھی۔ شاید کسی ایک مسئلہ پر علمائے ہندوستان کبھی اس طرح متفق نہیں ہوئے۔ لیڈرانِ قوم میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسرت موہانی، رہبرانِ علی گڑھ اور لیڈرانِ مسلم لیگ سب مضطرب و بے چین اور خلافتِ اسلامی اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔

بعض لوگوں نے اسلامی خلیفہ کو رومن کیتھولک کے پوپ سے تشبیہ دی ہے جو ملک رانی سے محروم ہونے کے بعد بھی اپنا نظام اور دفار قائم کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جب مولانا محمد علی کی قیادت میں خلافت وفد لائڈ جارج سے ملا اور ان سے بحث کی کہ خلافت مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اور حکومت برطانیہ کو اس میں مداخلت نہ کرنی چاہیئے تو لائڈ جارج نے اپنی جوابی تقریر میں کہا:

> "خلافت کی دنیوی طاقت کا ایک دوسرا مسئلہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر محمد علی اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ایک روحانی پیشوا کی دنیوی طاقت کا مسئلہ صرف اسلام کے ساتھ لاحق نہیں ہے۔ عیسائی دنیا میں بھی یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ رومن کیتھولک گرجا کے سربراہ سے دنیوی اختیارات کے سلسلے میں ایک نسل سے زیادہ مدت کے خوفناک تنازع جاری ہیں۔ کچھ رومن کیتھولک تو دنیاوی اختیارات کے حق میں ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اپنی رائے تو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں لیکن جب پوپ کو اس کی دنیاوی طاقت سے محروم کر دیا گیا تو اس کی روحانی قوت ویسی ہی عظیم رہی بلکہ عظیم تر ہو گئی۔"

مسٹر لائڈ جارج نے یا تو تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا یا وہ اسلام کے بنیادی اصول سے ناواقف تھے۔

عیسائی مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صرف تین سال کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ عیسائی مذہب میں نہ کوئی قانون ہے اور نہ حکمرانی کے قواعد میں بلکہ حکمرانی کا ذکر تک نہیں ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے قوانین وضع کیے ہیں، حکمرانی کے دستور بتلائے ہیں اور غوغائے عالم سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دی ہے جو بلا قوت و حکومت ناممکن ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تعلیمات تزکیۂ نفس و اخلاق عالیہ کے ساتھ ایک سپاہی، ایک سپہ سالار، ایک مدبر اور ایک حکمران بھی تھے۔ اور اسی کی جانشینی کا نام خلافت یا نیابت ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اسلام میں کسی ایسی روحانی خلافت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے جس میں سیاست ضوابط رول آف لا حکمرانی اور طاقت و شوکت نہ ہو۔ مولانا محمد علی نے اپنے آخری جواب میں یہ بات کہہ کر ختم کر دی کہ:۔

> "ہم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ خلیفہ کی دنیاوی طاقت برقرار رکھنے، مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اس کی نگرانی کو بحال اور ان پر قبضہ تسلیم کرانے کے معاملات کو اچھی طرح پیش کریں۔ ہم نے وائسرائے اور مسٹر فشر کے سامنے یہ مسائل پیش کیے۔ آپ سے یہ بھی کہنا ہے کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مضمون "مسئلہ خلافت اور جمہوریہ ترکیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ سلطنت اور خلافت کی تفریق کی تائید میں جس قدر توجیہات کی جارہی تھیں اور وظائف اور اعمال کی تقسیم کے رنگ میں اسے دکھلایا جارہا تھا، محض کاغذی نمائش تھی عملی طور پر کسی ایسی تقسیم کا وجود نہ تھا اور نہ وجود میں آسکتی تھی۔
>
> پوپ سے جب سلطنت علیحدہ کر دی گئی تو اس کے کاروبار کے بہت سے صیغے باقی رہ گئے۔ مثلاً گناہوں کی معافی، پروانہ ہائے تجارت کی تقسیم، احکام شرع میں ترمیم و تنسیخ اور رومن کیتھولک چرچ کی بادشاہت، کلیسائی اعمال اور جمعیات کی نگرانی وغیرہ۔ لیکن اس نئے منصب پر متمکن ہو کر خلیفہ عبدالمجید خاں کے لیے کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ گناہوں کی معافی اور جنت و دوزخ کا کاروبار تو یہاں تھا ہی نہیں۔"[2]

ترکی خلافت یورپ ایشیا اور افریقہ کے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ یہ زوال پذیر تھی اور مغرب والوں نے اس کا نام "یورپ کا مرد بیمار" رکھا تھا مگر اس مرد بیمار سے اعزا اور خاندان والے اس وقت تک امید افاقہ و صحت رکھتے ہیں جب تک کہ واقعی اس پر موت نہ طاری ہو جائے۔ ترکی کے حصے بخرے ہو رہے تھے لیکن اس کے ساتھ اس کے اصلاح و احیاء کی تدبیریں بھی جاری تھیں جن میں خاص کر نوجوان ترکوں کا منظر عام پر ظہور تھا اس لیے

---

[1] معارف اعظم گڑھ۔ جنوری 1973ء محمد علی کی یاد میں۔ از صباح الدین عبدالرحمٰن۔

[2] تبرکات آزاد۔ مرتبہ۔ غلام رسول مہر ص 266

امیدیں جاگ رہی تھیں۔ اب ایک دم جب ایسی صورت پیش آئی کہ امید کی نبضیں ڈوبنے لگیں تو اضطراب اپنی حد کو پہنچ گیا۔

رائٹ آنریبل سر امیر علی نے جو سرکار برطانیہ کے معاملے میں معتدل اور محتاط رویہ رکھنے والے تھے وہ بھی اسی مجبور تھے۔ انھوں نے ٹائمز آف انڈیا آف لندن میں ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھا جس کا ماحصل وہی تھا جو اوپر بیان ہوا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر خلافت ترکیہ قائم نہ رہی تو مسلمانانِ عالم مایوسی کے گرداب کی نذر ہو جائیں گے۔ وہ آج تک ترکی کو محافظِ اسلام سمجھتے آئے ہیں اور اس کے زوال کو اسلام کا زوال تصور کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تحریکِ خلافت اس وقت شروع ہوئی جب دُوَلِ یورپ کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ایشیا اور افریقہ موت کی نیند سو رہے تھے۔ مگر اسی وقت سے ایک کے زوال اور دوسرے کی بیداری کا بھی آغاز ہوا۔ یعنی ایک عہد رخصت ہو رہا تھا اور دوسرا عصر جنم لے رہا تھا۔ بقول علامہ اقبال ایک نئی دنیا اور اس میں بسنے کے لیے نئے آدم کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ماضی اور حال کی تاریخ اور دونوں عہد کی قدروں کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اسی زمانہ میں روس میں انقلاب آیا اور زار روس کی عظیم الشان حکومت کے پرخچے عوام نے اڑا دیے۔ بولشویک اور مانشویک کی جنگ بھی اسی وقت ہوئی۔ لینن اور اسٹالن نئے فلسفۂ حیات یعنی مارکسزم کو لے کر نمودار ہوئے اور امریکہ نے یورپ کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔

جہاں تک ترکی اور بلادِ اسلامیہ کا سوال ہے، وہ سب کچھ ہوا جس کا خطرہ ایک عرصے سے چلا آ رہا تھا لیکن مملکتوں کے سوال کے ساتھ مسلمانوں میں خود شناسی کے جوہر بھی چمکے۔ شریف حسین، سلطان عبدالحمید امیر حبیب اور سلطان وحیدالدین کی غداریاں اور ضمیر فروشیاں بھی بام عروج پر پہنچیں اور ان کا زوال بھی ہوا — ہندوستان نے بھی انگڑائی لی کیونکہ تلک کی انتہا پسند پارٹی معتدلین پر غالب نہ آسکتی تھی اور انگریز معمولی اصلاحات کے جال میں پھنسا کر ہندوستان میں اپنا پنجہ انھیں معتدلین کے ذریعہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک عظیم انسان گاندھی نے پورے ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور معتدلین عوام کے جذبہ خودشناسی کے طوفان میں جو گاندھی کا پیدا کردہ تھا تنکوں کی طرح بہہ گئے۔

تحریکِ خلافت کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ اسی سے ہمارے ملک میں آزادیِ کامل کی بنیاد پڑی اور ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ اول مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے باہر نکلا اور ہر باشندۂ ملک نے خودداری اور خود اعتمادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریکِ خلافت ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپکو دیکھا اور پا لیا۔

یہ صحیح ہے کہ تحریکِ خلافت کے روحِ رواں مہاتما گاندھی تھے لیکن اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ تحریک خلافت نے گاندھی جی کو ہندوستان کو متحد کرنے اور اسے آزادیٔ کامل کی منزل کی جانب گامزن کرنے کا مواد فراہم کیا۔ اس لیے جن لوگوں کو تحریکِ آزادیٔ ہند کی تاریخ سے دلچسپی ہے ان کو تحریکِ خلافت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔

تحریکِ خلافت ہی کے زمانہ میں جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا جس کے روشن خیال علماء نے آخر وقت تک کانگریس اور گاندھی جی کے پیامِ عمل کی تائید کرتے ہوئے ملک کی آزادی کے لیے دار و رسن کو دعوت دی اور مسلم لیگ کا تادمِ آخر مقابلہ کرکے تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوئے۔

جس وقت تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا مسلمانوں میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے دانشور موجود تھے۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد حسین مدنی مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الٰہ آبادی، مولانا احمد سعید، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی مشیر حسین قدوائی، ظفر الملک علوی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود آغا صفدر (پنجاب) اور ظفر علی خان وغیرہ۔

یہ وہ لوگ تھے جو تحریر و تقریر، علم و فن، فکر صالح اور تحقیق کے علاوہ میدانِ عمل کے بھی مجاہد تھے۔ ان میں انشاپرداز بھی تھے اور شاعر بھی، علومِ دینیہ کے مجتہد اور محقق بھی۔ اور علومِ دنیا اور علومِ مغرب کے شناسا اور امام بھی۔

یہ تمام اکابرینِ ملت اس سرفروشانہ جدوجہد میں پورے انہماک اور بے جگری سے شریک ہو گئے اور تحریکِ خلافت تحریکِ آزادیٔ ہند میں تبدیل ہو گئی اور ہندوستان کے تمام لیڈر گاندھی جی کی قیادت میں یک دل ہو کر منزلِ آزادی کی جانب عزم و یقین کے ساتھ چل پڑے۔

## دوسرا باب

# مسلمانوں کی روحانی اذیّت کے اسباب

## مسئلۂ خلافت کا تقدّس

ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے اجراء کے وقت مسلمانوں کے عظیم اضطراب کے متعدد اسباب تھے۔ پہلی وجہ خلافتِ مرکزیۂ اسلامیہ سے مسلمانوں کی قلبی وابستگی، جذباتی لگاؤ اور گہرے عشق و محبت کی تھی۔ خلافت گویا اسلام کی روح اور مذہب کی بنیاد ہے۔ خلافت کا قیام، اس کی بقا اور اس کے استحکام کو مسلمانانِ عالم نے ہمیشہ اپنا مذہبی فریضہ جانا۔ چنانچہ جب ہلاکو نے بغداد پر حملہ کیا تو علامہ ابن تیمیہ اپنے عبادتی اور تصنیفی گوشے سے باہر آکر شمشیر بدست اس کی حفاظت کے لیے میدان میں کود پڑے۔ علامہ ابن کثیر مشہور مورخ اس قلیل مدت میں جب طوفانِ ہلاکو کے بعد کچھ دنوں کوئی خلیفہ نہ تھا تو نہایت رنج کے ساتھ ہر سال کے شروع میں یہ تحریر کیا کرتے تھے کہ افسوس اس وقت مسلمانانِ عالم کا کوئی خلیفہ نہیں ہے۔ مولانا محمد علی جب وفد کو لے کر لندن پہنچے اور لائڈ جارج نے خلافتِ اسلامیہ کی برقراری سے انکار کر دیا تو مولانا محمد علی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ اٹھے اور برملا کہا کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ اور آخر میں یہ کہا کہ ہم اپنے مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے۔ یہ گویا ایک چیلنج تھا جو خلافت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے بے سروسامان قوم کے جری لیڈر نے دنیا کی عظیم ترین طاقت کے سربراہ کو دیا تھا۔

## ترکی اور بلادِ یورپ

دوسری بڑی وجہ جو مسلمانوں کو بے چین کیے ہوئے تھی وہ دولِ یورپ بالخصوص برطانیہ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مسلم ممالک کے خلاف بالعموم اور ترکی کے خلاف بالخصوص اس کی معاندانہ کارروائیاں تھیں۔ مسلمان فخر سے وہ زمانہ یاد کرتے تھے جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے رچرڈ جیسے شیردل شہنشاہِ برطانیہ اور دیگر مسیحی مجاہدین ممالک یورپ کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا۔ تاریخ کے علاوہ افسانے، ناولوں اور طرح طرح کی روایتوں سے اس کے لیے ایک جذبۂ افتخار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس پر بھی فخر کرتے تھے کہ سلطان محمد فاتح نے کس طرح قسطنطنیہ

پر قبضہ کرکے یہ شعر پڑھا تھا۔

پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت　　بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اور یہ بات بھی خون کو گرماتی تھی کہ جب یورپ کے ۵۲ شہزادے " سگ برگنڈی " کی قیادت میں مسیحی جہاد کا اعلان کرتے ہوئے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے تھے تو بایزید یلدرم گھوڑے پر سوار ان پر بجلی کی طرح گرتا تھا۔ اسی لیے اس کو " یلدرم " کا خطاب ملا جو ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی " بجلی " کے ہیں اور بایزید یلدرم نے سردار لشکر مسیحی سگ برگنڈی کو بعد فتح و گرفتاری شہزادگان بلا زرِ فدیہ تلوار دے کر اور یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ جاؤ اور پھر عیسائیوں کو جمع کرکے آؤ۔ بایزید کو تم بروقت میدان جنگ میں تیار پاؤ گے۔ پھر وہ بے شمار لڑائیاں جن میں ترک شان و شوکت کے ساتھ فتحیاب ہوئے اور جس پر اکبر مرحوم یوں زمزمہ سنج ہوئے ؎

جہاں میں مظفر ہیں منصور ترک　　عجب لوگ ہیں چشم بد دور ترک

وہ یہ سوچ کر بھی فخر سے گردن اونچی کرتے تھے کہ ترکی کی بحری طاقت سمندر کا سینہ چیرنے کے لیے کافی ہے۔ علاوہ ازیں ان مسیحی جہادوں اور عیسائی اور مسلم کے نعروں سے یورپ والوں نے خود ترکوں کے وجود کو اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر محافظِ اسلام میں تبدیل کر دیا تھا۔

برطانیہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سعی و جدوجہد میں سب سے آگے تھا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل اس نے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر کرنے کا پورا سامان کر لیا تھا۔ مصر پر انگریز کا آہنی پنجہ گڑا ہوا تھا۔ ایران، روس اور برطانیہ کا غلام ہو چکا تھا۔ مراقش پر فرانس قابض تھا۔ ترکی طرابلس المغرب کا صوبہ افریقہ میں کھو چکا تھا۔ ترکی ایک مردِ بیمار کی طرح اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اسی کو علامہ شبلی نے اس طرح ادا کیا ہے :۔ ؎

مراقش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے　　کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ نیم جاں کب تک

اور پھر ان اشعار سے مسلمانوں کے صحیح جذبات و احساسات کا اندازہ ہوگا ؎

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو　　یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی　　دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

ترکی اور کل یورپ سے قریب پانچ سو سال کی جنگ سب کے سامنے تھی اور مسلمان بجا طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اگر یہ خلافتِ عثمانیہ کا جھلملاتا ہوا چراغ گل ہو گیا تو مسلمانوں کا کوئی وقار دنیا میں باقی نہیں رہے گا اور مسلمان دنیا کے صحرائے ریگ زار میں ایک گم کردہ کارواں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس میں مسلمانانِ ہند نے جو جوش اور ولولہ اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خلافت کا زوال مسلمانوں کی برداشت سے باہر ہے۔

انگریزوں نے استعماریت کے ذریعہ کمزور قوموں کی لوٹ کھسوٹ اور اس کی وساطت سے اپنے مرض جوع الارض کے علاج اور حرص و آز کی تکمیل کا نام "تہذیب" رکھا تھا جس کو وہ اپنا فرض کہہ کر اور اس کی اشاعت کے بلند بانگ دعویٰ کی تہہ میں خود غرضانہ ملوکیت کو چھپا کر عالم میں پھیل رہے تھے۔ چنانچہ گلیڈسٹون کا ایک قول اس کی صداقت کو ظاہر کرے گا۔ گلیڈسٹون وہ شخص تھا جو کسی ایسے شخص کو جسے عیسائی بپتسمہ نہ دیا گیا ہو، دیکھ کر کانپ اٹھتا تھا۔ وہ کہتا ہے:۔

> مجھے یقین ہے کہ ہم سب اس عظیم الشان ملک کی محبت میں متحد ہیں جو ہمارا وطن ہے۔ اور اس سلطنت سے وابستہ ہیں جس نے ہمارے ملک کو خدا کی ایسی امانت سونپی ہے جو کبھی پہلے کسی خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔"

اس "امانت" کا حق ادا کرنے کے لیے انگریزوں نے تلوار سے زیادہ مکارانہ تدبر اور سیاسی چالبازیوں سے کام لیا جس کے شکار عام طور پر خود غرض مسلمان اور ضمیر فروش سلاطین و زعماء ہوئے۔ انگریزوں نے ایک نہایت منطقی پروپیگنڈا اختیار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد دنیا میں تہذیب پھیلانا ہے۔ اور اس بہانے سے وہ پسماندہ قوموں کے درمیان گھس آئے اور ان کو مفلس اور جاہل بنا کر لوٹا اور اپنے تن کو فربہ کیا۔ یہ پروپیگنڈا کچھ اس انداز کا تھا کہ بہت سے لوگ اس کے شکار ہو گئے کیونکہ اس نے مراتب خسروانہ سے ان کو نوازا۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ جب اٹلی سے نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوا اور سائنس کی ترقی میں یورپ کی جانب نظر ہوئی تو اس نے نتیجہ کے طور پر یورپ نے اپنے کو صنعتی ملک بنایا اور اس صنعتی ملک کی پیداوار کے لیے بازار کی ضرورت تھی۔ استعماریت کے زیر سایہ تجارت کی غرض ظاہر کر کے یہ ملکوں میں گھسے اور اس کا کچا مال لے کر اور اپنا تیار شدہ مال ان کے ہاتھ بیچ کر خود کو مالدار بنانے گئے۔ چنانچہ انگلستان کا مشہور انشاپرداز ایڈیسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے لوگ ہمارے ملوا ہے اور حبشی ہمارے کہار ہیں۔" اس استعماریت کی بنیاد جارحانہ حب الوطنی پر تھی۔ اس لیے باہمی رقابتیں بھی رونما ہوتی رہیں لیکن یہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ اس سے پسماندہ ملکوں کو کچھ نہیں ملا۔ چونکہ مقصد ہی پاک نہ تھا ذریعہ پاک ہونے کا امکان کیا ہو سکتا تھا چنانچہ انھوں نے رشوتیں خوب دیں اور زیادہ تر ان سے بھی اپنا کام نکالا۔ غالباً دنیا کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں ان کے قدم نہ گئے ہوں اور وہاں رشوت کے ذریعہ انھوں نے اس ملک کو غلام نہ بنا لیا ہو۔ انقلاب فرانس کے بارے میں مورخین عالم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کی تحریک کا پٹ وزیر اعظم برطانیہ کے سونے نے حاصل کی۔ پٹ ایک بڑا مدبر تھا۔ اور اس کا لقب ہے "وہ ملاح جو کشتی کو طوفان پر سے چلا کر ساحل پر لے گیا" اس نے بے شمار دولت رشوت میں خرچ کر کے ایسے لوگوں کو انقلاب کا حامی بنا کر کھڑا کر دیا جنھوں نے ساتھی بن کر وحشت و بربریت اور قتل عام کا بازار گرم کیا تا آنکہ سارا یورپ لرز اٹھا۔ ہر تحریک کے ایسے رہنما تلاش کرنے میں انگریز کو ملکہ تھا جو تحریک کو بگاڑ دینے، برباد کر دینے اور وقت پر

نہ کرنے کا گُر خوب جانتے تھے۔ ان رشوت خوروں سے انھوں نے کتنے ملکوں کو تاخت و تاراج، کتنی نیک تحریکوں کو برباد کر ڈالا اور کتنے صادق العمل رہنماؤں کو ناکام بنا دیا۔ صرف ترکی کے سپاہی اور سپہ سالار ایسے تھے جو دامِ حرص میں گرفتار نہیں ہوئے۔ مصر کی غلامی کی وجہ یہی رشوت ستانی تھی۔ افغانستان کی سرحد بندی کرتے وقت وہاں کے نمائندے کو رشوت دے کر صوبہ سرحد کو ہندوستان میں شامل کر لیا۔ انگریز حکومت کی طرف سے ڈیورنڈ مقرر ہوا تھا۔ وہ بڑا عیار تھا اور اس نے افغانی نمائندے کو کثیر رقم رشوت دی اور اس طرح سرحد مرتب ہوا جس کی حد کا نام ڈیورنڈ لائن ہے۔ ترکی میں بھی سپاہی اور سپہ سالار تو اپنی جانبازیوں میں اپنے کو یکتائے روزگار ثابت کرتے رہے لیکن وزراء اور سلاطین اس سے بچ نہ سکے۔ چنانچہ آخر زمانہ میں سلطان ترکی، سلطان عبدالحمید اور ان کے چند وزراء اسی طرح کے غلام اور حلقہ بگوش تھے۔

افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن اس زمانہ میں بہت اہم تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جنگِ عظیم اوّل کا زمانہ اسپ و شمشیر سے لڑائی کا زمانہ تھا۔ ہوائی جہاز ابھی عالمِ وجود میں آنے والے تھے۔ اس لیے افغانستان پر پنجہ مضبوط رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے امیر حبیب اللہ والیِ افغانستان کو مطیع و منقاد بنایا گیا۔ سلطان عبدالحمید خلیفۃ اسلام اور امیر حبیب اللہ سیاسی اور جنگی میدان میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کو زرپاشی اور کثیر وعدۂ رشوت سے "غلام" بنانے کے بعد اب انگریز کا دوسرا کام اس سلسلہ کا یہ تھا کہ ان دونوں کو پاکباز، متقی، محافظِ اسلام اور پرجوش مجاہد ثابت کرے۔ چنانچہ اس کے لیے بھی تجوریاں کھولی گئیں اور مختلف ذرائع سے اس فریب کو حقیقت ثابت کرنے کی سعی وجہد شروع کر دی اور اس میں ایسی کامیابی ہوئی کہ آج بھی ایسے مخلص اور بے لوث لوگوں کی کمی نہیں جو سلطان عبدالحمید اور امیر حبیب اللہ کو نجات دہندۂ اسلام سمجھتے اور یقین کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نوجوان ترکوں کو یہودیوں کی زرپاشی کا نتیجہ بتلاتے ہیں۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

امیر حبیب اللہ کے حالات ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے لکھے ہیں جو امیر حبیب اللہ کے زمانہ میں افغانستان کی جیل میں بند تھے۔ ان سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی اور انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب سنٹرل ایشیا کے نام سے شائع کی تھی اور ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ امیر حبیب اللہ کا ایک فرانسیسی باورچی تھا جو گردن مروڑی مرغی اور بلا ذبیحہ کی چڑیاں کبوتر وغیرہ پکا کر ان کو کھلاتا تھا۔ امیر نے ایک محکمہ عورتوں کا قائم کر رکھا تھا جن کے فوجی عہدے تھے۔ ان کا کام پہاڑ پر سے روزمرّہ نوجوان لڑکیوں کو لانا تھا۔ امیر حبیب اللہ کا وزیر جو مستوفی الملک کہلاتا تھا اور جس کا نام مرزا محمد حسین تھا وہ باضابطہ حکومتِ برطانیہ کی خفیہ سروس میں تھا۔ مستوفی نے ڈاکٹر عبدالغنی پر اس جماعت سے ساز باز کا شبہ کیا جو روزمرّہ ان حالات سے تنگ آکر منظم اور رفتہ رفتہ قابو یافتہ ہوتی جا رہی تھی۔

چنانچہ ان کے چودہ سالہ لڑکے کو مجرم بغاوت پھانسی دے دی اور ڈاکٹر صاحب کو قید کر دیا۔ جب امیر امان اللہ خاں امیر حبیب اللہ کے خس کم جہاں پاک ہونے کے بعد بادشاہ ہوئے تو خود جیل پر جاکر ڈاکٹر صاحب کو رہا کیا۔ اور جنگ کے بعد جو صلح کانفرنس راولپنڈی میں ہوئی اس میں بھی ڈاکٹر صاحب افغانستان کے نمائندوں کی ٹیم کے ایک رکن تھے۔

امیر امان اللہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد مستوفی کو گرفتار کرایا اور تمام ملک میں اعلان کروا دیا کہ ایک غدّار وطن کی موت کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ جمع ہوں۔ چنانچہ ایک مجمع عظیم کے سامنے اس کا سرتن سے جدا کیا گیا۔ مستوفی کی گردن اڑانے سے قبل اس سے تین خواہشیں ظاہر کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے پہلی خواہش یہ ظاہر کی کہ مجھے میری بیوی کی قبر کے پاس دفن کیا جائے۔ امیر امان اللہ نے اس درخواست کو یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ وہ ایک عفیفہ بیوی تھی۔ اس کے پہلو میں تم جیسے بدکار و شیطان صفت کو جگہ نہیں دی جاسکتی۔ دوسری خواہش اس نے یہ ظاہر کی کہ میرے بچوں کو تعلیم دی جائے۔ امیر امان اللہ نے کہا کہ اگرچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ "انعی راکشتن وبچہ اش را نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست"۔ لیکن تمہاری یہ خواہش منظور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ان معصوموں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے اور بچے اصلاح پذیر ہیں۔ اگرچہ تمہاری صحبت نے ان کے اندر جو جوہر بو دیا ہے اس کے دور کرنے میں محنت لگے گی۔ اس کے ساتھ امیر امان اللہ نے سخت تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمہارے جیسے شقی کے دل میں بھی اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی محبت کے لطیف جذبات موجود ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم ان تمام خصائص انسانی سے خالی ہو۔ تیسری خواہش مستوفی نے یہ ظاہر کی کہ میری جائداد سے میرے بچوں کو محروم نہ کیا جائے۔ امیر امان اللہ نے کہا کہ اگرچہ وہ جائداد تم نے بے ایمانی اور ضمیر فروشی سے پیدا کی ہے لیکن ان معصوم بچوں کی خاطر تمہاری یہ درخواست بھی منظور کی جاتی ہے۔

یہ واقعات مجھ سے لاہور میں ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے اور میں نے ان کا تذکرہ دو وجہوں سے کیا ہے (۱) یہ کہ کس طرح برطانیہ کا جادو ممالکِ اسلامیہ کے سربراہوں پر چل گیا تھا (۲) کس طرح انگریز ایک عالم کو بہکانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ امیر حبیب اللہ مجاہد اسلام ہے۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ جب لوگ امیر حبیب اللہ کو واقعی بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ لیکن اندر اندر آگ سلگ رہی تھی اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھنے لگی تھیں۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے پہلے وہاں کے طالب علموں نے ان کو کئی نوٹسیں دی تھیں اور ان سے اصلاح کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب کا یہ جملہ مجھے یاد ہے کہ نوجوان کہتے پھرتے تھے۔

"ہم ان خطاکار احمقوں سے بہتر حکومت کر سکتے ہیں"۔

مگر امیر حبیب اللہ ان تنبیہات اور اعلانات کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حالانکہ خود ان کے خاندان کے اندر بغاوت شروع ہو گئی تھی اور غالباً خود امیر حبیب اللہ کی بیوی علیہ حضرت ان کے قتل میں شریک تھیں۔ عوام کا غصہ ان کے خلاف بھڑک رہا تھا۔ فوج بے چین تھی۔ اس لیے کہ جب مملکت اسلامیہ خطرے میں تھی اور بار بار انور پاشا کی جانب سے اشارے ملتے تھے کہ وہ جنگ میں شریک ہوں تو امیر حبیب اللہ برطانیہ کے ایک ایلچی کی حیثیت سے ٹال جاتے تھے۔ ہندوستان میں صرف دس ہزار فوجیں انگریز نے رکھیں اور ہندوستانی فوجوں نے میسوپوٹامیہ میں جاکر ترکوں سے جنگ کی۔ اگر اس وقت افغانستان ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو انگریزوں کو وہ فوجیں وہاں سے واپس بلانی پڑتیں۔ انجام یہ ہوا کہ جب بیت المقدس کو جنرل النبی نے گھیرا تو مغرب کی جانب ہندوستانی فوجوں نے اور مشرق کی جانب عربوں نے ترکوں کا راستہ کاٹ دیا اور جنرل النبی نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات "نقشِ حیات" جلد دوم کی حسب ذیل عبارتیں ہماری تائید کرتی ہیں:۔

"امیر حبیب اللہ عام بادشاہوں کی طرح اخلاقی عیوب سے پاک نہیں تھے۔ اب یہ مرض بہت ترقی کر گیا تھا اور شرفا کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ دراز کرنے لگے تھے۔ اس میں بعض عفیف عورتوں نے عصمت دری کے بعد خودکشی کر لی۔"[1]

مولانا محمود حسن نے تمام دنیا میں جہاد کا نعرہ بلند کیا تھا اور دیوبند میں رہتے ہوئے اپنے ہاتھ پر جہاد کی بیعت لیتے تھے۔ ایک بڑا مرکز یاغستان تھا اور حاجی ترنگ زئی (فضل واحد) نے پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریزوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا اور اب افغانستان کو جنگ میں شریک کرنا چاہتے تھے انگریز کا پروپیگنڈا اغدار امیر حبیب اللہ اور ضمیر فروش ستوفی کی مدد سے کس طرح کامیاب ہوا۔

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:۔

"چند مہینوں کی جنگ میں انگریزوں کو انتہائی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور تمام بلند دعاوی اور اولوالعزمیاں خاک میں مل گئیں۔ آخر وہی پرانا طریقہ جو کہ پہلی جنگوں میں آڑے وقت میں انگریز اختیار کرتے رہے یہاں بھی کرنا پڑا۔ امیر حبیب اللہ خاں کو درمیان میں ڈالا گیا اور سرداران قبائل مجاہدین آزادی کو توڑ کر اور زرپاشی کی سبیل اختیار کر کے بچی کچی سپاہ کو واپس لانا پڑا جس کی تفصیل یہ ہے کہ اشرفیوں اور روپیوں کی بھرمار کر کے دیہات یاغستان کے سرداروں کو توڑ لیا اور یہ پروپیگنڈا کر دیا

---

[1] تبرکات آزاد صفحہ 173

کافر بادشاہ کے جہاد شریعتِ اسلامی میں درست نہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ ان اطراف میں امیر کابل، امیر حبیب اللہ خاں ہیں۔ تم ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کرکے منظم ہو جاؤ۔ جب امیر صاحب اٹھیں اور علمِ جہاد بلند کریں تب ان کے ساتھ جہاد کرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیہاتوں کے مکھیا اور سرداران قبائل ٹوٹ گئے اور عوام امیر کابل کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اپنے ہوش وحواس کو قائم نہ رکھ سکے۔ بالآخر حاجی صاحب اور ان کی جماعت کو شکست اٹھانی پڑی اور جماعت میں انتشار ہو گیا۔ لے

مولانا عبیداللہ سندھی اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ یاغستان میں تقسیم کرے اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائلِ افغانیہ سے بیعت حاصل کرے اور پشاور میں افغانیوں کو کہا جاتا تھا کہ امیرِ کابل جہاد کرے تو اس وقت تم جنگ جہاد میں شریک ہو جاؤ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے۔"

"پہلے سے چونکہ امیر حبیب اللہ خاں سے معاہدہ ہو چکا تھا اس لیے انگریز مطمئن تھے کہ وہ ہرگز انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے کھڑے نہ ہوں گے۔ اس لیے یہ کھیل کھیلا۔"

"عمومی کے اعلان کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے اولاً اور تمام ہندوستانیوں ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے ثانیاً امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں تو امیر نے ترکی، جرمنی، ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہنچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریز کے خلاف جنگ خلافِ مصلحت ہے۔"

"اسی دوران یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر روس کا خطرہ رفع ہو جائے تو سرحدی قومیں ہند پر حملہ کر سکتی ہیں خطرہ کو معلوم کرنے کے لیے ہندوستانی روسی وفد، ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا محمد علی کا وفد تجویز ہوا تھا۔ جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس مشن کی معلومات سے یہ معلوم ہو چکا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو نائب السلطنت کو جو لوگ ملتے تھے انھوں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا انھوں نے امیر حبیب اللہ سے کہا تو امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور قومی بزرگ شریک تھے۔ امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی تو سوائے عنایت اللہ خاں کے جو خود بک چکا تھا سب نے متفقانہ قرار دیا کہ لڑنا ضروری ہے۔ امیر صاحب حیران ہو گئے اور اپنے شاہانہ فیصلے سے اس کو روک دیا۔ ےھ

---

لے ایضاً صفحہ 185 ےھ ،، صفحہ 120

اس کے بعد ہمیں (مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے رفقاء) یکم رمضان 1335ھ 1955 ء کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا۔ ہماری نگرانی سردار سپہ سالار (جنرل نادر خاں) کے سپرد رکھی گئی۔ ایک عرصہ کے بعد ہماری نگرانی مستوفی الممالک کے سپرد کی گئی۔ مستوفی الممالک ہمیں جلال آباد لے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں مستقل بادشاہ بن بیٹھے بےلہ

# سلطان عبدالحمید

یہی حال سلطان عبدالحمید کا تھا۔ انگریزوں نے اس کو غلام بنایا۔ ترکی کا ایک ایک ذرہ رہن کرا دیا۔ فوج میں عیسائی بھر گئے تو جدید طریقۂ حرب کو نظر انداز کر کے عسکریت کا خاتمہ کر دیا۔ درّہ دانیال کے قلعوں پر سے توپیں اور اسلحے ہٹا دیے۔ سب سے بڑا زمیندار بن بیٹھا۔ اصلاحات کی مخالفت کی۔ جس کسی نے اصلاح کی جانب توجہ دلائی اسے روباہ صفت سلطان نے خاموشی سے قتل کرا دیا۔ مدحت کامل پاشا جیسے دانشور مصلح کے خون کے دھبّے سلطان عبدالحمید کے دامن پر ہیں۔ اور ایک مدحت کامل پاشا کیا کتنے ہی معصوم محبانِ وطن آقایانِ فرنگ کے اشارے سے اس سلطان کے جور و ستم کا نشانہ بنے۔ اس کا دامن ہی نہیں اس کا پورا جامہ معصوم بہی خواہانِ ملک و قوم کے خون سے رنگا ہوا تھا۔ اور یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟ صرف اس لیے کہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ ترکی میں کوئی اصلاح ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت روز بروز زوال کی جانب رجوع ہوتی جائے۔ اُسے تو اسلامی مرکزیت کا خاتمہ کرنا تھا اور عبدالحمید سب سے بڑا انگریز کا آلۂ کار تھا۔ لیکن اسے انگریز نے "محافظ اسلام" مشہور کر دیا اور بات اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں اتر گئی اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے انگریز کے اس پروپیگنڈے کا ترجمہ "اشاعتِ اباطیل واکاذیب" بالکل بجا طور پر کیا تھا۔ مگر یہ ایسا جھوٹ ہوتا تھا جو سچ کا قالب اختیار کر لیتا تھا اور پھر اسے فروغ دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی انگریزوں کے اثر میں اچھے اچھے تعلیم یافتہ انشاپرداز، صوفی منش علماء اور زعماء آ گئے تھے اور وہ جو چیز بھی پھیلاتا تھا اسے قرآن و حدیث کی طرح وحیِ ربانی تصور کرتے تھے۔ ان میں علماء و زاغ صفت صوفی جن کو میراث میں عقابوں کے نشیمن ملے تھے اور بہت جاہ طلب غلامانِ فرنگ تھے کس کس کا نام لیا جائے۔ ان سب نے ایسے ایسے افسانے سلطان عبدالحمید کی تعریف میں وضع کیے تھے کہ بایدوشاید اگر ان افسانوں کو یہاں درج کیا جائے تو پوری ایک کتاب ہو جائے۔ سلطان عبدالحمید نے جو غداریاں ملک اور قوم کے ساتھ کیں ان میں ایک واضح چیز درّہ دانیال

---

لے صفحہ 171

کا غیر مسلح کرنا ہے۔ درّۂ دانیال ایک ڈھلوان درّہ ہے جو ایشیا کو یورپ سے جدا کرتا ہے۔ یہ چالیس میل لمبا اور چار میل چوڑا ہے۔ یہ بحرِ ایجین کو بحرِ مارمورا سے ملاتا ہے۔ اس کے دونوں طرف پہاڑیاں ہیں اور سمندر کی جانب سے قسطنطنیہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے چنانچہ اس پہاڑی پر دونوں طرف سو سو سے زیادہ قلعے تعمیر کیے گئے تھے جو توپ اور بھاری اسلحوں سے لیس تھے۔ اگر کوئی اس کے اندر داخل ہونے کی ہمّت کرے تو دونوں طرف سے توپ کے گولے پڑتے تھے۔ اور ایک سے بچا تو دوسرے اور دوسرے سے بچا تو تیسرے سے یا اس کے بعد کے قلعوں کی زد سے بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ انگریزوں کے حکم کی متابعت میں سلطان عبد الحمید نے ان تمام قلعوں کے فوجی استحکامات کو مسمار کر کے انھیں غیر مسلح کر دیا تھا۔ اب میدان صاف تھا۔ دولِ یورپ کی بحری طاقتیں اپنا رنگ دکھا سکتی تھیں قسطنطنیہ ان کے پیروں کے نیچے تھا۔ وہ تو نوجوان ترکوں نے عبد الحمید کو معزول کرنے کے بعد ان قلعوں کو فوراً مسلح کر لیا تھا ورنہ جنگ عظیم میں وہ اتحادیوں کو شکست نہ دے سکتے تھے۔

## مصلحین امّت

لیکن ان سیاہ بادلوں میں امید کی کرن بھی تھی۔ مصلحینِ امّت جن میں زیادہ تر روشن خیال علماء تھے برابر حالات کو سدھارنے کے لیے آواز لگا رہے تھے ۔

عمر بیست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

ان میں سب سے پہلے جس کا نام زبان پر آتا ہے وہ سید جمال الدین افغانی ہیں۔ اس صاحبِ بصیرت کے تگ و تاز نے افغانستان سے لے کر مصر تک ایران، عرب اور ترکی تمام بلادِ مسلمین کو روند ڈالا اور ہر جگہ بغاوت کی آگ روشن کی۔ ان کا پیغام اتحادِ اسلام تھا جسے پان اسلام ازم کا نام دے کر انگریز نے بدنام کیا۔ انگریز نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ پان اسلام ازم کا منشا عالم پر مسلمانوں کی ملوکیت اور حکمرانی قائم کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات ان کے خیال سے بہت بعید تھی۔ اتحادِ اسلام کا منشا صرف یہ تھا کہ اسلامی سلاطین اپنے اندر اصلاح پیدا کریں اور قرآن کے قانون پر عمل پیرا ہوں۔ جن ملکوں میں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں کے مسلمان حب الوطنی کے جذبے کے ساتھ روشن خیالی سے اپنے کو دین کا متّبع بنائیں اور آزادی حاصل کریں اور سب مل کر ایک مرکزی خلافتِ اسلامیہ قائم کریں تاکہ یورپ کے دستبرد سے محفوظ رہ سکیں اور جو خطرہ بلادِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کو درپیش ہے وہ دور ہو۔

یہی تعلیم ہندوستان کے مجاہدِ اعظم اور صاحبِ فراست مولانا محمود حسن کی تھی جو ہندوستان کے اوّل درجہ کے قائد تھے جنھوں نے تمام بلادِ اسلامیہ میں اصلاح و حصولِ قوت و شوکت کا ایک زبردست کام جاری کر رکھا تھا۔

## حرمین الشریفین

تیسری عظیم وجہ جس نے مسلمانوں کا سینہ کباب کر رکھا تھا وہ مسئلہ تھا حرمین الشریفین کی حفاظت کا اور ان کے غیر مسلم اقتدار میں بوجہ معاندت دولِ مغرب چلے جانے کا خطرہ۔

حرمین الشریفین، مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ، مقامات مقدسہ، بیت المقدس اور آثار قدیمہ بغداد و نجف و کربلائے معلیٰ کی حفاظت بھی ترکی کے خلفاء کے سپرد تھی جنھوں نے کبھی اپنے آپ کو حجاز کا سلطان نہیں کہا بلکہ اپنا لقب سلطان ترکی و خادم الحرمین الشریفین قرار دیا۔ خلیفۃ المسلمین تو وہ تھے ہی اور پکارے بھی جاتے تھے۔ سلاطین ترکی حرمین الشریفین سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے بیت الحرام مکۂ معظمہ کی توسیع اور حرم نبوی کی از سرِ نو تعمیر کی۔ مگر اس طرح کہ ہر تاریخی چیز محفوظ ہے۔ حجاز سے کبھی انھوں نے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا۔ خانۂ کعبہ اور بیت الحرام کے کل اخراجات حتیٰ کہ چراغ جلانے کے لیے تیل تک قسطنطنیہ سے جاتا تھا۔ علماء اور فضلاء کے وظائف مقرر تھے۔ دوران جنگ شریف مکہ کی بغاوت اور انگریزوں کے عمل دخل اور بالخصوص فلسطین میں یہودیوں کو وطن دینے کے بعد حرمین الشریفین کی حفاظت کی کیا ذمہ داری تھی۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر مسلمان کو جان سے زیادہ عزیز ہے علامہ اقبال نے کس دردانگیز لہجہ میں اس حال کا مرثیہ لکھا ہے

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ ... خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے ... کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اور کس جذبے سے پکارتے ہیں:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے ... نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر
تا خلافت کی بِنا دنیا میں پھر ہو استوار ... لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر
ناشناسی سرِ خفی را از جلی ہوشیار باش ... اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہوشیار باش

چنانچہ مسلمانانِ عالم کا مضطرب ہو جانا لازمی تھا اور ہندوستان تو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

## ایک اور وجہ

یورپ نے ہمیشہ ترکی سے جنگ مذہبی بنیاد پر کی اور ان کو مسلمانوں کا پیشوا اور محافظ قرار دیا ہے۔ اس طرح مسلمانانِ عالم کے دل میں پیوست ہو گیا کہ ترکی کی بقا اسلام کی بقا اور ترکی کا زوال اسلام کا زوال ہے۔ ان لڑائیوں کے مختصر اشارے پہلے آچکے ہیں اور اس کتاب میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اتنا اور اضافہ

کیا جاتا تھا کہ دول یورپ اور روس ترکوں کے ان صوبوں کے بارے میں جہاں عیسائی بسے ہوئے ہیں ہمیشہ عیسائیوں کے حقوق کے نگہبان اور اجارہ دار بن کر اٹھے اور ترکی کے خلاف ان کو ہمیشہ بغاوت پر بھڑکاتے رہے یہ لوگ اسلام کو جاہلیت قرار دیتے تھے۔ چنانچہ روس کے بادشاہ لبو بارڈ نے برسلز کی ایک جغرافیائی کانفرنس میں کہا:۔

"کرۂ ارضی کے اس حصہ میں جہاں تہذیب نہیں پہنچی ہے تہذیب کے لیے داخل ہونے کا دروازہ اور اس تاریکی میں روشنی کا دریچہ پیدا کرنا جو آبادیوں کو لپیٹے ہوئے ہے ایک جہاد ہے اور ایسا جہاد ہے جو ہمارے ملک کے شایان شان ہے۔"

یہی حال فرانس اور جرمنی کا بھی تھا مگر انگلستان اس وقت دنیائے مغرب کا جو دھری تھا سب سے بڑی طاقت برطانیہ کی تھی۔ اس کا بحری بیڑا ناقابلِ تسخیر تھا اور اس لیے وہ اپنے جزیرے میں محفوظ و مامون رہ کر عالم کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کا نام رکھا تھا "اشاعتِ تہذیب" برطانیہ اور روس رقیبانہ انداز میں اس نام نہاد تہذیب کو پھیلانے کے لیے عیسائیت کا علم بلند کرتے تھے اور ترکی کی عیسائی رعایا کے حقوق کی نگہبانی اور محافظت کا دعویٰ کر کے دخل انداز ہوتے تھے۔ عالمِ اسلامی پر اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ یورپ ہمیشہ ترکوں کے مقابلے میں جو بے شمار لڑائیاں لڑتا رہا ان کو اسلام کے مقابلے میں صلیبی جہاد قرار دیتا رہا۔ بایزید یلدرم کے زمانہ سے یہ بات شروع ہوئی اور خلافتِ مرکزیہ اسلامیہ کے اختتام تک جاری رہا۔ چنانچہ جنرل النبی کو جس نے جزائر نادنشرکی ناکامی کے بعد فرانس سے آکر بصرہ، بغداد اور بیت المقدس وغیرہ فتح کیا خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے حسب ذیل الفاظ کہے تھے:۔

"ان کا (جنرل النبی کا) نام ہمیشہ کے لیے اس حیثیت سے یاد کیا جائے گا کہ وہ ایک ذہین اور قابلِ قدر فوجی سردار بن کر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ کی آخری لڑائی لڑے جس میں ان کو بہت ہی شاندار فتح حاصل ہوئی۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی جنگی صلاحیت سے ایک ایسی لڑائی کا خاتمہ شاندار طریقہ سے کرایا جس میں یورپ کی سپہ گری صدیوں سے ملوث تھی۔ اب ہم اس خیال کو فراموش کر دیں کہ نسلاً بعد نسلٍ یورپ کی جنگی قوت بیکار قسم کی جنگی لڑائیوں میں ضائع ہوتی رہے گی کیونکہ برطانوی فوج نے جنرل النبی کی نگرانی میں ایک ایسی فتح حاصل کر لی ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی لڑائی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔"

یہ یورپ اور برطانیہ کے قلب کی اندرونی گہرائیوں کی آواز تھی اور حقیقتِ حال بھی اس کا مظہر ہے۔ یہ سلسلہ ایک زمانہ سے چلا آرہا تھا اور آخر تک جاری رہا۔ ترکی کے عروج کے زمانہ میں اس کے حسب ذیل

صوبے تھے:۔

یورپ میں:۔ ادرنہ، سلالیسک، تعوضوہ، یانیہ، اشقودرہ، مناستر۔

ایشیا میں:۔ حجاز، یمن، بصرہ، بغداد، موصل، حلب، سوریہ، شام، حدارندگار، قونیہ، انگورہ، ایدین، اطنفہ، قسطومنی، دیاربکر، تبلیسل، ارض روم، معمورۃ العزیز، آران، طرابزون۔

افریقہ میں:۔ مصر، طرابلس۔

بحر سفید میں:۔ جزائر بحر سفید۔

بھلا یورپ اس عظیم سلطنتِ اسلامی کو کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اور اس کو نیست و نابود کرنے کا برطانیہ عظمیٰ نے پختہ فیصلہ کرلیا اور مسیحیت کے نام پر اٹھ کھڑا ہوا۔

پچاس سال سے زائد کا عرصہ ہوا کہ میں نے ایک انگریزی عورت کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی۔ افسوس کہ تلاش کے باوجود کتاب نہ مل سکی۔ جہاں تک یاد ہے اس کا نام "جزیرۃ العرب" تھا۔ اس میں اس نے صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ برطانیہ اور اسلام دونوں اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ دو قومیں دنیا میں برتری کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ انگریز اور مسلمان۔ دو زبانیں دنیا پر چھانا چاہتی ہیں انگریزی اور عربی۔ اور دو میں سے ایک کو فنا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے لکھا تھا کہ جب تک اسلام کی مرکزیت نہ ختم ہو اور جزیرۃ العرب اس مرکزیت سے علیحدہ کرکے ٹکڑے ٹکڑے نہ کردیا جائے اسلام کی طاقت کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے بتلایا تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ سے انگریز کیمیاوی طریقوں سے اپنے چہرے گندمی رنگ میں رنگ کر وہاں کے مدرسوں اور مکانوں میں رہتے تھے تاکہ عربوں کی کمزوریوں کو معلوم کرسکیں اور ان کو ترکوں کے خلاف اکسا سکیں۔ عرصہ کی مشقت و ریاضت اور قربانی کا نتیجہ تھا کہ کرنل لارنس کو وہ مواد ملا کہ جس سے وہ عربی لباس پہن کر ایک قائد کی طرح جنگ عظیم کے دوران عربوں سے ترکوں کو قتل کراتا تھا اور ہر ترک کے قتل پہ انعام مقرر کر رکھا تھا۔ خود کرنل لارنس نے جو تکالیف برداشت کیں اور جس طرح جان پر کھیل کر یہ تماشہ کیا وہ ایک عجیب داستان ہے۔

کرنل لارنس ایک پستہ قد آدمی تھا اور ناپ میں پورا نہ اترنے کی وجہ سے فوجی ملازمت کے لیے اس کی درخواست نامنظور ہوگئی تھی۔ اس نے عربوں کو بغاوت پر اکسانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کی ہمت کا عالم یہ تھا کہ بخار کے عالم میں ریگستان کے اندر جہاں بادِ سموم کے جھونکوں کے سوا کوئی چشمہ ملنا دشوار تھا۔ وہ سینکڑوں میل کا سفر اونٹ پر کرتا تھا۔

یہ تو آخرکار شر اور باطل کی کامیابی کا زمانہ ہے۔ عرصۂ دراز سے انگریز دو باتوں پر محنت کر رہے تھے اور ان کی عظیم محنت قابلِ داد ہے۔

(1) مسلمانوں کی مرکزیت کو ختم کیا جائے۔

(2) جزیرۃ العرب کو ترکی حکومت کے خلاف کھڑا کیا جائے۔

چنانچہ انگریز اپنی ریشہ دوانیوں سے ترکی کو برابر اندرونی و بیرونی نزاعات میں پھنسائے رکھتے تھے۔ اندرونی نزاع یہ کہ ترکی کے عیسائی باشندوں کے مسیحی رہنما ان کو بغاوت پر اکساتے تھے اور بیرونی نزاع جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ ترکوں کو کبھی چین نہیں ملا۔ وہ برابر جنگ میں مبتلا رہے۔ چنانچہ جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے اصلاح شروع کی تو ایک انگریز مورخ کے قول کے مطابق نوجوان ترکوں کو بیس سال کے امن کی ضرورت تھی لیکن اس کے بدلے میں ان کو بیس سال کی جنگ ملی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ خلافتِ اسلامیہ اور حکومتِ ترکی کے ساتھ دامے درمے قدمے سخنے شریک رہا۔ چنانچہ 1897ء میں جب یونان نے جنگ شروع کی تو مسلمانانِ ہند نے اس وقت بھی چندا کر کے ترکوں کی امداد کی تھی۔ 1912ء میں جب جنگِ بلقان ہوئی تو ایک ایک مسلمان مضطرب تھا اور کثرت سے چندہ ہوا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو گھر بار چھوڑ کر باس کے لیے نکل گئے تھے۔ مولانا محمود حسن کی قیادت میں دارالعلوم دیوبند کے طلباء تعلیم کو وقتی طور پر ترک کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک صاحب کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ تقریباً تمام جنگ کے دوران وہ گھر سے باہر رہے گاؤں گاؤں چندہ وصول کرتے تھے اور اس کا حساب اس زمانہ کے مشہور اخبار "پیسہ اخبار" میں چھپواتے رہتے تھے۔ الغرض ان تمام وجوہ سے مسلمانِ ہند کو ترکی سے ایک زبردست جذباتی لگاؤ تھا اور اگر ترکی کی ایک انگلی میں درد ہوتا تھا تو مسلمانانِ ہند کے دل سوزِ غم سے کباب ہو جاتے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں مولانا محمود حسن روزمرہ ایک حدیث جہاد کے بارے میں پڑھ دیا کرتے تھے۔ اس طرح طلباء میں ایک عظیم جوش پیدا ہوا اور ان لوگوں نے خود درخواست کی کہ دارالعلوم بند کر دیا جائے۔ خود مولانا کا تو منشا یہی تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ ایسا کرنے سے حکومت کی ناراضگی مول لینی پڑے گی جو دارالعلوم کے قیام کے لیے مضر ہو سکتی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ایسا ہی معاملہ استاذ مرحوم کے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ پیش آیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ دارالعلوم دین کی خدمت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اگر دین کی خدمت ہی کو نقصان پہنچے تو دارالعلوم کی ضرورت کیا ہے؟

جنگِ بلقان کے زمانہ میں جو سخت جوش و ہیجان مسلمانوں میں پیدا ہوا اور حرکت و عمل کے لیے مسلمانوں نے جس بے چینی کا اظہار کیا وہ ایک طویل داستان ہے۔ تمام ہندوستان کا مسلمان شب و روز مضطرب تھا۔ جوان چاہتے تھے کہ وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو کر جہاد کریں۔ چنانچہ فیاض علی صاحب فیض آباد میں ایک ایڈوکیٹ تھے جو بعد میں پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کر گئے۔ انھوں نے ایک ناول "شمیم" لکھی جو مقبول ہوئی۔ ان کا ہیرو

آخرکار ترکی جہاد کے لیے چلاگیا۔ امیروں اور غریبوں نے یکساں دل کھول کر چندے دیے تاکہ کم سے کم یہ تو ہو کہ ترکانِ احرار کو مالی امداد ملے۔ حلقہ بگوشانِ حکومت بھی اپنی وفاداریاں بالائے طاق رکھ کر علانیہ میدان میں کود پڑے۔ لکھنؤ کے ممتاز بیرسٹر مسٹر مختار حسین نے امین آباد پارک کے ایک جلسۂ عام میں دل دہلا دینے والی تقریر کی۔ حالانکہ ان کا شمار حکومت کے حامیوں میں تھا۔ ضلع کلکٹر بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو مسٹر مختار حسین نے کہا کہ یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔ علامہ شبلیؒ جو اپنی فہم و فراست اور بصیرت و دیدہ وری کے لیے نمایاں حیثیت رکھتے تھے برابر درد انگیز نظمیں لکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری طبّی وفد لے کر ترکی گئے جس میں چند سر برآوردہ لوگ بھی شریک تھے۔ جب وہ واپس آئے تو علامہ شبلی نے ان کے خیر مقدم میں ایک پرجوش نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری　　کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ترکوں نے صلیبِ احمر کے جواب میں ہلالِ احمر کمیٹی بنائی تھی۔ اس کی تقلید میں ہر شہر میں ہلالِ احمر کمیٹیاں قائم ہوگئیں۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ میں جب وفدِ انصاری کے لیے چندہ کی اپیل کی تو مسلمانوں نے کس طرح لبیک کہا اسے میر محفوظ علی کی زبان میں سنیے جو مولانا محمد علی کے ساتھی اور کامریڈ کے مینجر تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اپیل نے کامریڈ کے دفتر میں روپیوں کی بارش شروع کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے موصول ہوئے ہیں۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈر اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔"

یہی حال مولانا ظفر علی خان کے شہرۂ آفاق اخبار روزنامہ زمیندار کا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی پکار پر زندہ دلانِ پنجاب نے کس جوش سے چندے دیے وہ بھی ایک داستان ہے۔

یہی حال اس وقت ہوا جب اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا اور انگریزوں نے ترکی کا راستہ مصر میں روک دیا۔ انور پاشا وہاں بھیس بدل کر گئے اور لڑائی کی تنظیم کی۔ مسلمانانِ ہند اس وقت بھی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے جس کا اندازہ علامہ اقبال کے اس قطعہ سے ہوگا ؎

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا　　زمیں کو چھوڑ کے سوئے فلک روانہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو　　حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز　　کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگ بو آیا　　ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مانا کہ مسلمانوں کے سامنے جان و مال کی قربانی دینے کے لیے کوئی راہِ عمل نہ تھی۔ دامنگیریٔ ہندستان زیرِ اقتدارِ برطانیہ۔

ع　نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

لیکن ترکی کا معاملہ مسلمانوں نے ہمیشہ تحفظِ اسلام اور تحفظِ خلافت مرکزیۂ اسلامیہ کا معاملہ سمجھ کر اپنے مذہب، اپنی زندگی اور اپنے وجود و بقا کا معاملہ سمجھا۔

## تیسرا باب

# میدانِ عمل

مسلمانانِ ہند نے صرف زبانی ہمدردی، فریاد و فغاں، دعاہائے صبح گاہی اور اشک۔ شوئی سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا بلکہ حتی الامکان عمل بھی پیش کیا۔ اس عمل کی ایک مثال تو وہ گراں قدر چندے ہیں جو امراء، غربا و احرار کا سے "نیسانِ حکومت برطانیہ" سب نے بذوق و شوق پیش کیے۔ دوسری مثال ان انجمنوں اور مجالس کی ہے جو قفس کی تیلیوں کے اندرکی دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود قائم کی گئیں۔ اس زمانہ میں ایک صدی سے زائد سے فرنگی محل (لکھنؤ) مسلمانانِ ہند کی مذہبی و تہذیبی اقدار کا پیشوا اور ہدایت و رشد کا مرکز تھا۔ اسی فرنگی محل نے ملا نظام الدینؒ اور بحر العلوم مولانا عبد العلیؒ جیسے اہل دماغ پیدا کیے تھے جن کا نام شہرت کے پروں پر دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں از کر پہنچ گیا ہے جہاں سے مولانا عبدالحی جیسا عالم متبحر اٹھا جس نے 32 سال کی عمر میں وفات کرنے کے باوجود ایک ہزار عالم جید اپنا شاگرد چھوڑا اور کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس پر حاشیہ نہ لکھا ہو۔ اس فرنگی محل کا چراغ ایک عظیم انسان سے روشن تھا جو نہ صرف ایک عالم متبحر، اخلاق عالیہ و فاضلہ سے مزین، دیدہ وری و بصیرت سے معمور بلکہ درد ملت سے بے چین اور روشن خیالی، تدبر اور حکمت عملی سے بھی دنیائے اسلام کے لیے سرگرم عمل تھا۔ یہ تھے مولانا عبد الباری ان کا اس وقت کیا مقام تھا اس کا اندازہ حسب ذیل عبارت سے ہو گا جو صلاح الدین عبد الرحمٰن نے "محمد علی کی یاد میں" کے عنوان سے "دفترِ خلافت کی مسٹر فشر سے ملاقات کی روداد" میں تحریر کیا ہے:۔

"مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موقع پر ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنی بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاید پہلا ہندوستانی مولوی ہوں جو یہاں آیا ہوں۔ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ مولانا عبد الباری صاحب نے جو لکھنؤ کے فرنگی محل کے مشہور خاندان سے ہیں مجھ کو خاص طور پر اپنی نمائندگی کیلیے بھیجا ہے تاکہ میں بادشاہ سلامت کی حکومت پر واضح کر دوں کہ ہم لوگوں کے لیے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خالص ایک مذہبی معاملہ ہے[1]

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

# قانونی جدوجہد

خلافت ترکی کے معاملہ میں فرنگی محل قانوں کے اندر جدوجہد کا مرکز تھا۔ مولانا کی فراست نے بادلوں کے محیط ہونے سے پہلے بارش کا اندازہ کر لیا تھا اور "خدام کعبہ" کی بنیاد رکھی تھی جس میں خود مولانا خادم الخدام تھے "خدام کعبہ" نے ملت اسلامیہ ہند کے ہر فرد میں ایک ولولہ تازہ اور خلافت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ سے ایک عظیم محبت وعقیدت کا جذبہ پیدا کیا۔ گویا کہ یہ حرکت وعمل کے لیے نقش اوّل تھا۔

بعدہٗ تحریک خلافت کے زمانہ میں فرنگی محل مرکز رہا۔ مولانا محمد علی مولانا عبد الباری کے مرید تھے اور وہیں سے ان کو اور شوکت علی کو "مولانا" کا اعزازی خطاب عطا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ واقعی مولانا ہو گئے۔

---

حاشیہ صفحہ گزشتہ پر

لہ مولانا عبد الباری بڑے ہی فیاض اور بشخص سے رعایت ومروت سے پیش آنے والے بڑی جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا نام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں عزت سے لیا جاتا تھا۔ یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ مجھے مولانا سے شرف نیاز کی نعمت حاصل ہوئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ ٹرین میں بیار رہا تھا۔ نام نامی تو سنا ہی تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں ہیں۔ حاضر ہوا تو چند منٹ میں یہ معلوم ہوا کہ گویا میں ان ہی کی گود کا پالا ہوا ہوں اور مجھ سے قریب کوئی نہیں ہے۔ پتہ چلا کہ ہر شخص اسی خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ مجھ سے زیادہ کسی کی خاطر مولانا کو عزیز نہیں ہے پھر تو میں وہیں ٹھہرنے لگا۔ اللہ اللہ وہ ازدہام خلائق کون تھا جو ان کے دسترخوان کا ریزہ چیں نہ ہو۔ ایک مرتبہ حاضر تھا او ر پیچش تھی۔ بار بار خود دوڑتے تھے۔ کھچڑی کھالو۔ صابو دانہ کھالو۔ دہی چاول کھالو۔ کیلا کھالو۔ گویا میں ان کے گھر کا ایک بچہ تھا جسے وہ منا رہے تھے۔ ایک رخ پر ایک دالان تھا۔ ربیع الاول میں وہاں ایک بڑی لالٹین روشن ہو جاتی تھی اور مغرب بعد سب لوگ آ کر بیٹھ جاتے تھے جن میں حضرت مولانا بھی ہوتے تھے۔ ایک صاحب حدیث کی کتاب سے چند حدیثیں پڑھتے اور ترجمہ کرتے پھر سب لوگ اٹھ جاتے۔ سر بہار کو خزاں ہے۔ اب کچھ دن ہوتے ہیں مولانا محمد میاں فرنگی محلی سے ملنے گیا۔ مولانا ناعز میاں فرنگی محلی نے ایک رہبر ساتھ کر دیا۔ وہاں پہنچا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بے اختیار چیخ اٹھا" ارے یہ تو حضرت مولانا عبد الباری کا مکان ہے۔ رہبر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہاں کا سناٹا دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ اب لگا میں اس کوٹھڑی کو تلاش کرنے جس میں رہتا تھا۔ اور جو نیچی تھی۔ لوگوں نے سامنے والی دالان کے نیچے بتلایا۔ اور کہا کہ وہ تہہ خانہ تھا جو اب بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن حافظہ نے تائید نہ کی۔ ممکن ہے حافظہ ہی خطا کرتا ہو۔ پچاس سال سے زیادہ کی بات ہے۔ حافظہ کہتا ہے کہ وہ دونوں دالانوں کے درمیان ایک رخ ہٹ کر تھی۔

ہر وقت اور ہر پبلک جگہ اور جلسے میں عبا پہنے رہتے تھے۔ نہایت گھنی داڑھی تھی اور چہرے پر نور۔ میں نے جب دیکھا مولانا محمد علی کو اسی رنگ میں دیکھا۔ ایک دن ایک بڑے جلسے کے موقع پر نماز کا وقت ہو گیا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی کو یہ کہتے سنا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے میں مجھے بڑا لطف و کیف حاصل ہو گا۔

جب تک کہ مولانا محمد علی نے اپنے بے مثال درد دل کے ماتحت اپنی صحت کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں لے لیا مولانا عبدالباری ہی کی ذات تھی جن کا نام نامی ہر جگہ آتا تھا۔ "مہاتما گاندھی کا حکم مولانا عبدالباری کا فتویٰ" ایسے کتنے ہی اشتہار شائع ہوئے۔ تحریکِ خلافت میں راست اقدام کا جو زبردست عمل پیش ہوا اس کی زمین مولانا عبدالباری ہی کی تیار کی ہوئی تھی اور اس کے بعد تحریک خلافت کو چلانے، جمعیۃ العلماء ہند کو قائم کرنے اور تمام عالمِ اسلام اور مسلمانانِ ہند کو برطانیہ کے خلاف متحد کرنے میں مولانا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

# خلافت کمیٹی کا قیام

خلافت کمیٹی کب اور کیسے قائم ہوئی اس کا سراغ لگانے اور محقق طور پر جاننے کی میں نے بڑی کوشش کی لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس جو 18 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوئی تھی وہی کانفرنس خلافت کمیٹی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس کانفرنس میں ایک تجویز خلافت کمیٹی کے شکریے کی منظور ہوئی۔ اس طرح انہیں اسباب کی بنا پر جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ خلافت کمیٹی 1920ء میں قائم ہوئی ان کا بیان بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری نے خلافت کمیٹی قائم کی اور پھر وہ بمبئی منتقل ہو گئی کیونکہ وہاں کے لوگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے کی ذمّہ داری لی۔ اس کی تائید شاہ معین الدین ندوی کی کتاب "حیات سلیمان" کے صفحہ 175 کے ذیلی حاشیہ سے ہوتی ہے۔

---

میں نے اس امر کی تحقیقات میں بہت وقت صرف کیا کہ کوئی دستاویزی شہادت اس بات کی مل جائے کہ خلافت کمیٹی کب اور کہاں اور کس کی تحریک پر قائم ہوئی مگر افسوس ہے کہ مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ میں مولانا عبدالباری کے مکان پر گیا وہاں کے لوگوں سے ملا۔ مفتی محمد رضا صاحب سے خط و کتابت کی جو حضرت مولانا کے حالات زندگی مرتب کر رہے ہیں۔ اسی طرح میں نے مختلف کتب خانوں سے رابطہ پیدا کیا۔ ایک صاحب بمبئی گئے وہاں خلافت کے دفتر کو دیکھا معلوم ہوا کہ دفتر کب کا اجڑ چکا ایک ورق بھی نہیں اور نہ "خلافت" اخبار کی اس زمانہ کی کوئی فائل ہے۔ بمبئی کے اہل دانش نے بھی معذوری ظاہر کی میں نے مولانا امتیاز علی عرشی صاحب کو لکھا۔ عرشی صاحب نے بہت سی باتیں لکھیں جن سے کئی امور میں میرے موقف کی تائید

# جمعیۃ علمائے ہند

علمائے کرام کے باہمی افتراق سے ملّت کو جو نقصان عظیم پہنچ رہا تھا اور دنیا میں امّت مسلمہ کی حالت اس درجہ نازک تھی کہ یہ بہت ممکن ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے علماء کو یکجا کرنے کا خیال بہت سے اصحاب فہم و بصیرت کے دماغ میں آیا ہو۔ لیکن سب سے پہلے مولانا عبد الباری نے ۱۹۱۹ء میں دلی کی ایک مشہور درس گاہ سید حسن رسولنما میں چند علماء کو جمع کر کے وقت کی نزاکت و ضرورت کے پیشِ نظر اتفاق و اتحاد کی اہم ضرورت بتلائی اور سب نے حسب ذیل عہد کیا۔

> "ہم سب دہلی کے مشہور و مقدس بزرگ کے مزار کے سامنے اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ مشترک قومی و ملّی مسائل میں ہم سب آپس میں متحد و متفق رہیں گے اور فروعی و اختلافی مسائل کی وجہ سے اپنے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں کریں گے نیز قومی و ملکی جد و جہد کے سلسلے میں گورنمنٹ کی طرف سے جو سختی اور تشدد ہو گا اس کو صبر و رضا کے ساتھ برداشت کریں گے اور ثابت قدم رہیں گے۔ جماعت کے معاملہ میں پوری پوری رازداری اور امانت سے کام لیں گے۔"

یہاں جمعیۃ العلماء کی تاریخ لکھنی مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے جو الفاظ بالا سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے دل کس طرح خون سے بھرے ہوئے تھے۔ اور راہ عمل کی تلاش تھی جو وحیِ الٰہی کی طرح ایک دم نازل نہیں ہو جاتی ہے بلکہ بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

---

ہوتی تھی اور یہ بھی ایک اطمینان بخش چیز تھی لیکن اس معاملہ میں کہ خلافت کا قیام کب، کہاں، اور کیسے ہوا اس پر ان کے پاس بھی کوئی مواد نہ تھا۔

جیسا کہ لکھا گیا فرنگی محل تمام اسلامی تحریکوں کا مرکز تھا چنانچہ مفتی محمد رضا کے خط سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا عبد الباری کے مکان میں دسمبر ۱۹۱۲ء میں "خدام کعبہ" کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا عبد الباری صاحب خادم الخدام مسٹر شوکت علی بی اے (علیگ) (بعدہٗ مولانا شوکت علی) خادم کعبہ مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر معتمد خادم الخدام منتخب ہوئے۔ اور اس کے اور لوگ ابتدائی ممبران تھے۔ یہ چیز بتلاتی ہے کہ مولانا عبد الباری صاحب نے اپنی روشن ضمیری سے اندازہ کر لیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور اسی لیے خدام کعبہ کی تحریک چلائی تھی۔ عجب نہیں کہ یہی خلافت کمیٹی میں منتقل ہو گئی ہو یا اسی کے زور و اثر سے وہیں خلافت کمیٹی بنی ہو۔ بہر حال جو یقینی بات ہے وہ یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پہلے سے بمبئی میں خلافت کمیٹی کا قیام تھا۔ بقیہ ظن و تخمین و قیاس ہے۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کے موقع پر تمام اتباع ہند کی مقتدر جماعت دلی میں جمع ہوگئی تھی کانفرنس کے بعد علمائے کرام کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا عبد الباری نے فرمائی اور دہیں جمعیتہ العلما قائم ہوئی سیاہی اختلافات کو دور کر کے علمائے کرام کس طرح ایک خاص مقصد یعنی بقائے خلافت کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا چاہتے تھے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مشہور پیشوائے اہل حدیث اور صحیح معنوں میں مجاہد ملت حضرت مولانا ابوالوفا امرتسری نے صدارت کی تحریک پیش کی تھی۔ دلی کے اجتماع میں حسب ذیل علماء شریک تھے۔

مولانا عبد الباری ' مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی ' مولانا ثناء اللہ امرتسری ' پیر امام محمد سندھی مولانا اسد اللہ سندھی ' مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی ' مولانا مولوی محمد انیس ' مولانا خواجہ نظام الدین ' مفتی کفایت اللہ ' مولانا محمد ابراہیم دربھنگہ ' مولانا خدا بخش مظفر پوری ' مولانا عبد الحکیم گیاوی ' مولانا محمد اکرم ' مولانا منیر الزماں ' مولانا محمد صادق ' مولانا سید محمد داؤد ' مولانا سید اسماعیل ' مولانا محمد عبد اللہ ' مولانا آزاد سبحانی۔

اس طرح خلافت مرکز یہ کے لیے شاید اوّل بار وہ علما جو فروعی اختلافی مسائل میں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوگئے تھے کہ بعض بعض کی تکفیر بھی کرنے لگے تھے اور گروہ بندی اور مناظروں کے اکھاڑے روز مرّہ کی زندگی بن گئے تھے۔ حتّیٰ کہ مسجدوں میں لوگوں سے مار پیٹ اور کہیں کہیں کشت و خون کی بھی نوبت آئی جو ایک دوسرے کو سلام تک نہ کرتے تھے آج ایک دل اور ایک جان ہو کر پوری قوت سے میدانِ عمل تیار کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے تھے۔ یہ تھی تحریکِ خلافت کی ہمہ گیری۔ اس نے ہر مسلمان کے ضمیر کو خواہ وہ عالم ہو یا عامی بیدار کر دیا۔

## علمائے ربانی اور جہاد بالسّیف —— ہندوستان میں متحدہ جمہوری حکومت کا تخیّل

ایک اور گروہ مردانِ خود آگاہ و خدامست کا تھا جو اسبابِ دنیوی سے لا پروا میدانِ جہاد آراستہ کر رہا تھا۔

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں ——— اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیم و تلقین سے شروع ہوا اور ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز (متوفی 1924ء) نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ انھیں کے خاص مرید تھے جنھوں نے جہاد کی تیاری کر کے سکھوں سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ دراصل سکھوں کے خلاف نہ تھی بلکہ بالواسطہ حکومت برطانیہ سے تھی۔ سکھ حکومت برٹش گورنمنٹ کی وفادار اور افغانستان و ہندوستان کے بیچ

ایک درمیانی مضبوط قلعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا طرزِ عمل عوام کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص سفاکانہ تھا۔ سیّد صاحب کا منشا مولانا حسین احمد مدنیؒ نے "نقشِ حیات" میں ظاہر کیا ہے۔[۵۸]

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک کے بدیسی لوگوں کے اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراج دولت رائے سندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کو اصلی عزائم اور ملکی حکومت سے متعلق آپ کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد اس خط کو نقل کیا ہے جو طویل ہے اس کا خلاصہ خود مولانا مدنی ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"(۱) آپ انگریزوں کو بیگانگان بعید الوطن اور پردیسی سمجھتے تھے اور ان کے استیلاء اور تغلّب سے تنگ آ کر ان سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(2) آپ ہندوستان کو اپنا ملک و وطن سمجھتے تھے۔

(3) جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔

(۴) آپ مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔"

مولانا مدنی نے آگے چل کر بطور خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ تحریکِ آزادی جو علماء کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور جس کی سنگ بنیاد رکھنے والے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ان کے خاندان کے لوگ اور ان کے شاگرد و مریدین ہیں۔ ان میں فرقہ واریت اور تنگ دلی کا نام تک نہ تھا نہ ان کا مقصد دنیاوی مفادات، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں اور منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا تھا۔ اور یہ تحریک شخصی یا کسی فرقہ کی حکومتِ فسطائیت کے لیے نہیں عمل میں لائی گئی تھی بلکہ حقیقی جمہوریہ اس کا مطمح نظر تھا۔

یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اتحادِ اسلام کی روح کی عملی مثال پیش کر دی جائے۔ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اتحادِ اسلام کا منشا قیامِ ملوکیت نہ تھا بلکہ اصلاح کے لیے ہر ملک میں انقلاب لانا تھا۔ اور

---

[۵۸] ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ 13

جن ملکوں میں غیر مسلم بھی آباد تھے وہاں ان سے مل جل کر استبداد کو مٹانا اور ایک پاکیزہ جمہوریت قائم کرنا تھا۔ جس طرح مسلم ممالک میں غیروں کی دست اندازی کو ہٹا کر ایک ستھری مبنی بر اسلام وانصاف حکومت قائم کرنی تھی، تمام دنیا میں اسی طرح خیر کے قیام کے لیے ایک عظیم انقلاب برپا کرنا تھا۔

یہ تحریک صرف ہندوستان تک محدود تھی گو یا کہ نقش اوّل تھی۔ نقش ثانی کے لیے اس صدی کے قائد ورہنما کا انتظار تھا۔ وہ سوار اشہب دوران وفروغ دیدۂ امکان کا عکس خاص بن کر نمودار ہوا اور جس نے دیوبند میں بیٹھ کر تمام عالم میں زلزلہ ڈال دیا۔ وہ ذات تھی مولانا محمود حسن کی۔

مولانا محمود حسنؒ نے تمام عالم اسلامی میں انقلاب بپا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مولانا بظاہر ہندوستان کے ایک محقق، عالم، مفسر اور محدث تھے جن کا شغلہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ تعلیم دین اور تلقینِ معرفت تھا لیکن ان سب باتوں کے ماسوا وہ ایک عظیم مجاہد اور ایک اعلیٰ پایہ کے مدبر وسیاست داں بھی تھے۔ وہ دراصل علاّمہ اقبالؔ کے اس خواب کی مکمل تعبیر تھے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ظاہری احوال پر نظر ڈالی جائے تو مولانا کو دارالعلوم دیوبند کے اہتمام قرآن پاک کے ترجمہ وحاشیہ کی ترتیب وتدوین حدیث کی تعلیم، تصنیف وتالیف اور ہدایت ورشد کی مشغولیتوں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی سیاسی حکمت کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ دیں جو انتہائی جگر سوزی کا کام ہے اور جس کے نتائج بڑی محنتوں کے بعد ظاہر ہونے ہیں اور وہ بھی بدیر اور بڑی انتہائی منزل میں مگر اسے کیا کیجیے کہ مولانا نے انقلاب واصلاح کے لائحۂ عمل کو تمام عالم اسلامی میں پھیلا دیا تھا۔ ان کی دیدہ ور نگاہیں سیکڑوں سال آگے کے حالات دیکھ رہی تھیں وہ ملک وملت کے لیے ایک دائمی صلح وفلاح کا پروگرام رکھتے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز نے اپنا جال تمام دنیا میں پھیلا رکھا ہے جس کا نتیجہ ایک طرف تو ہندوستان کی غلامی ہے اور دوسری جانب خلافت مرکزیہ اور بلادِ اسلامیہ کی تباہی وبربادی۔ اس لیے مولانا نے ایک طرف تو ہندوستان میں ایک متحدہ آزاد جمہوریت بنانے کا ارادہ کیا اور دوسری جانب بلادِ اسلامیہ کی حفاظت وبقا کا پروگرام بنایا۔ اور دونوں کے لیے انگریز سے جنگ لازمی تھی۔ اس وقت انگلستان ہی دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور استعمار پسند ملک تھا اور بلا اس سے جنگ کیے موت سامنے کھڑی تھی۔

افسوس ہے کہ مولانا کے حالات پر تاریخ نے پردہ ڈال رکھا ہے اور آپ کی انقلابی تحریکات کے بارے میں اگر کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا کہ یاغستان میں مولانا نے جہاد کی مہم چلائی جس کا تذکرہ اس سے پہلے

آچکا ہے۔ اور ہندوستان میں ایک مجوّزہ جمہوریہ کا نقشہ پیش کیا جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا جو ایک بڑے انقلابی تھے۔ اس سے ان کی زندگی کے اصولوں کی جانب تو رہنمائی ہوتی ہے لیکن تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ مجوّزہ جمہوریہ کی تاریخی حقیقت تو گورنمنٹ آف انڈیا کے سابق وزیر داخلہ سر ولیم ونسنٹ نے اس کا مضحکہ اڑا کر محفوظ کر دی۔ سنٹرل کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے مجوّزہ جمہوریہ کے بارے میں کہا کہ جواب بن مجوزہ ہی ہے۔ افسوس سر ولیم ونسنٹ زندہ نہیں ہیں ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ وہ مجوزہ جمہوریہ اب حقیقت بن چکی ہے۔ یہ تو ہندوستان کے اندر مولانا کے سیاسی موقف کی نشاندہی ہے جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے شاگردِ رشید مولانا حسین احمد مدنی نے "متّحدہ قومیت" کے عنوان سے ایک کتابچہ میں بیان کیا ہے۔ اور علاّمہ اقبال نے اسی سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان پر طعن کیا۔ بحثیں ہوئیں اور آخر کار علاّمہ اقبال کو ماننا پڑا کہ وہ غلط فہمی کے شکار ہوئے تھے۔ اس ضمن میں علاّمہ اقبال سہیل نے جواب میں قطعے اور نظمیں فارسی میں لکھیں۔ افسوس ہے کہ ان سب کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ اتنا کافی ہے کہ مولانا کی وہ ذات تھی جنھوں نے بہت پہلے نہ صرف ہندوستان میں مشترکہ جمہوریہ کے قیام کا خواب دیکھا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دار و رسن کو دعوت دی لیکن دنیائے اسلام میں ان کی سرگرمیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے دیوبند میں بیٹھ کر کابل، قسطنطنیہ، قاہرہ اور حجاز میں انقلاب کی روح پھونک دی تھی۔ اس معاملہ میں مواد کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مولانا اپنا راز اپنے قریب ترین لوگوں پر بھی ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ قیادت اور فراست کے امتزاج کا یہ ایک بڑا کمال تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی شاید ان کے مقرب ترین لوگوں میں تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ انھوں نے کہا کہ حضرت کیوں؟ تو مولانا خاموش رہے۔ پھر ایک دن فرمایا کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ پھر انھوں نے کہا کہ حضرت کیوں؟ مولانا نے پھر خاموشی اختیار کی مگر چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ اب مولانا عبید اللہ کہتے تھے کہ مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ حضرت پھر فرماتے کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ تو میں فوراً تعمیلِ حکم کرتا۔ چنانچہ چند روز بعد پھر مولانا نے فرمایا کہ عبید اللہ افغانستان جاؤ۔ اب مدّعا حاصل تھا۔ مولانا عبید اللہ افغانستان چلے گئے اور کہتے ہیں کہ وہاں جا کر خود بخود معلوم ہو گیا کہ افغانستان کیوں بھیجا تھا۔ یہاں آ کر مولانا عبید اللہ پھر خاموش ہو جاتے ہیں اور تفصیلات سے پردہ نہیں اٹھاتے بلکہ ناظرین کے ذہن و فہم کو قیاس آرائیوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے مجھ سے بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اُن سے مولانا عبید اللہ سندھی نے کہا کہ مولانا کسی پر راز منکشف نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ کو حکم دیا کہ ایک شخص فلاں وقت تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے نوٹ کر لینا اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔ چنانچہ وہ شخص آیا اور اس نے کارتوس، بندوقوں اور دیگر سامان کی تعداد نوٹ کرائی۔ چنانچہ انھوں نے نوٹ کر لیا اور

وہ چلا گیا۔ نہ سوال کی اجازت تھی اور نہ سوال کیا گیا۔ بعد کو لوگوں کو پتہ چلا کہ مولانا نے غالباً اجستھان میں کوئی اسلحہ خانہ بنایا تھا جس کا انگریز کو کبھی پتہ نہ چل سکا۔ ایک واقعہ اور ہے جب مولانا سندھی کو روانہ ہونا تھا تو ان کو روپیہ کی ضرورت تھی۔ انھوں نے سیٹھ عبداللہ ہارون کو لکھا کہ دو ہزار روپیہ بھیج دو اور فلاں وقت تک آ جائے۔ وقت گزر گیا اور روپیہ نہ آیا تو مولانا کو حیرت ہوئی۔ دوسرے دن اچانک دوپہر میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مولانا نکلے تو سیٹھ عبداللہ ہارون تھے۔ دو ہزار روپیہ دیا اور کہا کہ مجھے پیغام دیر میں ملا اس لیے تاخیر ہوئی اور فوراً چلے گئے۔ مولانا سندھی سیدھے جا کر سر عبدالقیوم کے یہاں ٹھہرے اور اسے چرکہ دے کر جنگلوں کے راستے روانہ ہوئے مگر چوکیوں پر رشوت دینے میں کل روپیہ خرچ ہو گیا۔ اب یہ تہی دست تھے تو ایک شخص کو اپنے کوڈ ورڈ میں لکھا اور وہ سب کچھ بیچ کر پندرہ سو روپیہ لایا اور مولانا سندھی کو دیا۔ مندرجہ بالا باتیں کس امر کی نشاندہی کرتی ہیں میرے خیال میں ان باتوں کے جواب میں میں ایک حاشیہ بیان کرنے جا رہا ہوں جس سے ان کی تائید ہوتی ہے۔[1]

---

[1] تفصیل واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی جانتے تھے کہ پوری پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی لگی ہوئی ہے۔ ان کا افغانستان نکل جانا محال نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ انھوں نے سادہ لوح بننے کا ارادہ کیا اور براہ راست سر عبدالقیوم پشاور کے یہاں جا کر ٹھہرے جن کے داماد فوجی افسر تھے اور سرحد کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔ مولانا نے بار بار ملتجیانہ لہجہ میں ان سے کہا کہ مجھے ایک نیک کام سے افغانستان جانا ہے تمھیں بڑا ثواب ہو گا۔ تمہاری گاڑیاں جاتی رہتی ہیں۔ مجھے موقع دے کر نکال دو میں چلا جاؤں۔ فوجی افسر اپنے دل میں ہنستا رہا کہ کس درجہ کم عقل آدمی ہیں جو مجھ سے ایسا سوال کرتے ہیں۔ اور وہ ہوں ہاں کر کے ٹالتا رہا۔ مولانا کی غرض تو یہ تھی کہ وہ غافل ہو جائے اور ان کی نگرانی نہ کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مولانا نے جب سمجھ لیا کہ وہ بالکل غیر محتاط ہو گیا ہے تو ایک دن رات میں وہ نکل گئے اور راستہ بدل دیا۔ پشاور سے کوئٹہ کا راستہ لیا جو جنگل پہاڑ کا علاقہ ہے۔ جو روپیہ سیٹھ عبداللہ ہارون نے دیا تھا وہ گنّیوں کی شکل میں تھا۔ راستہ میں چوکیاں تھیں ہر جگہ رشوت دے کر نکلنا پڑا اور آخر کار یہ کل روپیہ خرچ ہو گیا اور ابھی مولانا راستے ہی میں تھے۔ چنانچہ مولانا نے شیخ عبدالرحیم کو جو حضرت مولانا محمود حسن کے ایک معتمد تھے اپنی خاص زبان میں خط لکھا۔ شیخ عبدالرحیم آچاریہ کرپلانی کے بھائی تھے اور مشرف بہ اسلام ہو کر بڑے اخلاص سے حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد میں شریک تھے۔ مولانا نے ان کو اطلاع دی کہ روپیہ بھیج دو۔ اور ایک جگہ مقرر کر دی کہ روپیہ وہاں پہنچ جائے۔ شیخ عبدالرحیم نے اپنے گھر کا سامان اور زیور بیچ کر روپیہ مقام مخصوص پر بھیج دیا اور مولانا کو مل گیا اور مولانا افغانستان نکل گئے۔

جب میں 1921ء میں بجنور کے اخبار "مدینہ" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھا تو ترکِ موالات میں بھی کرتا تھا۔ عبداللطیف کرتپوری ضلع کانگریس بجنور کے صدر رہتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ کام کرنے کی وجہ سے میرے اور ان کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ گورے بدن کے پتلے دبلے آدمی تھے۔ سنجیدہ فکر ان کی خصوصیت تھی۔ ایک مرتبہ کراچی کے مقدمے کے فیصلے کے بعد کرتپور میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا میں بھی جس میں شریک تھا۔ اس طرح ان کا وطن بھی دیکھا تھا۔ میری رائے میں وہ بڑے مبصر اور سمجھ دار آدمی تھے۔

عبداللطیف کرتپوری نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ حضرت مولانا کی خدمت میں کافی دن رہے اور ان کے سپرد حضرت مولانا کو پائنیر اخبار میں مطبوعہ خبروں کا ترجمہ اور خلاصہ سنانا تھا۔ عبداللطیف صاحب نے کہا کہ مولانا نے ایک خفیہ جماعت "مخلصین" کے نام سے بنائی تھی جس کے بہت چنے ہوئے ارکان تھے۔ وہ کسی کو سفارشی خط لکھیں تو سب کچھ لکھ دیں گے مگر "مخلص" کا لفظ نہیں لکھیں گے۔ یہ لفظ صرف جماعت کے ارکان کے لیے مخصوص تھا۔ اور اگر وہ کسی کو لکھ دیں گے کہ یہ بہت مخلص ہیں ان کو دس ہزار روپیہ دے دو تو وہ مکان اثاث البیت غرضیکہ ہر چیز بیچ کر دس ہزار روپیہ دے دے گا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت مولانا کی اسکیم یہ معلوم ہوتی تھی کہ سرحد کے قبائلیوں میں جہاد کی روح پھونکی جائے اور اس طرح مجاہدین کی ایک زبردست فوج تیار کی جائے۔ چنانچہ چند علماء وہاں بھیجے گئے جو قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن پاک کی شرح میں جہاد کی جو تعلیم ہے اور جس سے ایک زمانہ سے علماء صرف گزر جاتے ہیں۔ ان پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ قبائلیوں میں زبردست جوشِ جہاد بھر گیا اور وہ انگریزوں کے سخت مخالف ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک قبائلی اپنے پانچ سال کے بچے کو پستول کھیلنے کے لیے دے دیتا تھا۔ اور کام سے لوٹ کر آتا تو پوچھتا تھا کہ اے میرے بچے تو نے آج کے انگریز مارے۔ وہاں اسلحہ خانہ بھی قائم ہو گیا۔ رائفلیں اور پستول وہ لوگ خود بناتے تھے اور آزاد قبائل اب بھی بناتے ہیں۔ اور نشانہ باز ایسے تھے کہ بالاعلان کہتے تھے کہ خدا کی قسم ہماری گولی زمین پر نہیں لگتی ہے۔

جب وہاں کی یہ فضا ہو گئی تو مولانا عبیداللہ سندھی کو کہا گیا کہ فتحپوری میں قرآن کی تعلیم کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کریں۔ چنانچہ مولانا سندھی نے مسجد فتحپوری دلی میں 1333ھ مطابق 13-1912ء "نظارۃ المعارف" کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی اور قرآن پاک کی تعلیم دینے لگے۔ مولانا احمد علی صاحب شیرانوالہ دروازہ لاہور ان کے شاگرد اور عزیز خاص تھے۔ مولانا احمد علی صاحب ہجرت کر کے کابل بھی گئے تھے اور پھر واپس بلا لیے گئے تھے۔ وہ شیرانوالہ دروازہ لاہور کی مسجد کے ایک حجرے میں رہتے تھے اور صرف قرآن پاک پڑھاتے تھے میں نے بھی دس سیپاروں کی تفسیر بصیغۂ ترتیب آیات مولانا سے پڑھی تھی۔ وہ کل قرآن کو جہاد کی تشریح میں تبدیل کیے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ حیض و نفاس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ جس طرح بیوی حلال ہے مگر ایک خاص

وقت میں اس سے قربت ممنوع ہے۔ اسی طرح حکومت کو رعایا کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرنی چاہیے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے ایک شاگرد مولانا عبدالحی فاروقی تھے جنھوں نے سندھی صاحب کی توضیحات کو اپنی طرف سے قلمبند کر کے شائع کرایا تھا اور اس کا نام تفسیر قرآن رکھا تھا۔ سورۃ بقرۃ کا عنوان "خلافت کبریٰ" رکھا تھا۔

مورخ نجیب آبادی نے مجھ سے کہا کہ مولانا سندھی نے ان سے پوچھا کہ ایک لفظ میں بتاؤ کہ قرآن کی تعلیم کا منشا کیا ہے۔ پھر خود ہی کہا کہ حکومت۔ حضرت مولانا احمد علی کے پاس جو علماء ترتیب آیات پڑھنے آتے تھے ان سے وہ پہلے پوچھتے تھے کہ سائیکل چلانا جانتے ہو۔ وہ کہتے تھے کہ نہیں تو اپنی سائیکل دے دیتے تھے۔ اس پر مشق کرنے کے بعد ہی درس میں شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔ فرماتے تھے کہ سائیکل چلانا نہیں جانتے ہو تو ہوائی جہاز کیسے چلاؤ گے اور جہاد کیسے کرو گے۔ اس طرح قرآن کی تعلیم عام کر کے جہاد کا جذبہ ایک خاص غرض اور ایک پاک مقصد کے لیے پیدا کیا جا رہا تھا۔

بیرونِ ہند کے بارے میں انھوں نے کہا کہ افغانستان کے شیخ الاسلام، ترکی کے مفتی اعظم، شیخ الجامعہ جامعۃ الازہر، علماء و مفتیانِ مصر مولانا کے ہمنوا تھے۔ اتنا تو کتابوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ افغانستان کا شیخ الاسلام دیوبند کا فارغ تھا۔ ایران کے مجتہد العصر اس زمانہ میں جب شاہِ ایران نے تمباکو کی واحد ٹھیکہ داری انگریز کو دے دی تھی قابو میں نہیں آتے تھے تو جماعتِ مخلصین نے مزدور بن کر جہاز سے سامان اتارنے کا کام شروع کیا۔ اور انگریز مگلوں جب شراب پی کر بدمست ہو گئے تو صندوق لے جا کر مجتہد العصر کو دکھلایا۔ اس میں تمباکو کے بجائے آلات حرب تھے۔ تب مجتہد العصر نے فتویٰ دیا کہ "تمباکو نوشیدن دریں زماں حرام است"۔ رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں گیا تو خلافِ معمول اسے حقہ تیار نہیں ملا۔ آواز دی تو کوئی نہیں بولا۔ بادشاہ کو غصہ آیا اور وہ زور سے چلائے "من آواز می دہم و کس نمی شنود ایں چہ ماجرا است"۔ تب بیگم تشریف لائیں اور کہا کہ آج آپ کو حقہ نہیں ملے گا اور مجتہد العصر کا فتویٰ دکھلایا۔ بادشاہ نے فوراً دربار کیا اور مجتہد العصر کو بلا کر کہا کہ حضرت یہ کیسا فتویٰ ہے۔ اسلام تو ایک عالمگیر مذہب قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ کیا کہ تمباکو پینا اس زمانہ میں حرام اور دوسرے زمانہ میں حلال۔ ایران میں حرام اور ترکستان میں حلال ——— مجتہد العصر نے تنہائی کی خواہش کی اور کل واقعات بیان کیے۔ انجام یہ ہوا کہ تمباکو کی اجارہ داری ختم ہوئی۔

افسوس ہے کہ مولانا کا پروگرام کامیاب نہ ہو سکا جس کا واقعہ وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انیس احمد بی۔ اے نظائرۃ المعارف میں آکر شامل ہوا اور اپنے زہد و تقویٰ اور ترکوں سے محبت کا کچھ ایسا مظاہرہ کیا کہ ایک دن جنگ بلقان میں ترکوں کی شکست کی خبر سن کر بے تابی میں ایسا لڑکھڑا کر فتحپوری کی چھت پر گرا جس سے اندیشہ ہوا کہ نیچے گر کر ختم ہی نہ ہو جائیں۔ کیونکہ فتحپوری کی اوپری چھت کھلی ہوئی تھی اور کنارے کوئی دیوار نہ تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کو اس پر کامل اعتماد ہو گیا۔ انیس احمد اور ان کے والد ادریس احمد دونوں کو میں نے دیکھا تھا۔ ادریس احمد بجنور گورنمنٹ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور حکومت کی خفیہ سروس میں ایسا مقام رکھتا تھا کہ براہ راست وزیر ہند سے خط و کتابت کرتا تھا۔ انیس احمد نے راز فاش کر دیا اور حکومت نے طے کیا کہ مولانا کو گرفتار کر لیا جائے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وساطت سے مولانا کو اس کی خبر مل گئی اور اپنی اسکیم کی عملی کامیابی کے لیے حجاز چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں سے وہ دنیائے اسلام میں بہتر کام کر سکیں گے لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑ گئی۔ اور مولانا کو ترکوں کی مدد سے افغانستان آنے کا موقع نہیں ملا اور وہ مالٹا میں قید کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل اور دوسرے لوگ تھے۔

میں نے عبد اللطیف کرتپوری کی بیان کردہ جو روایتیں لکھی ہیں وہ تاریخ شمار ہوں یا نہ ہوں لیکن جب ہم کل حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بات صحیح نظر آتی ہے۔ ان حالات کو میں ذیل میں نمبر وار درج کرتا ہوں۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ مولانا نے ایک نظام جہاد و بغاوت کا پورے دنیائے اسلام میں بنایا تھا۔ ان کی غرض انگریز کی استعمار پسند پالیسی کو توڑنا اور ہندوستان میں متحدہ جمہوریہ قائم کرنا تھا۔ ہر تحریک گاندھی جی سے پہلے تشدد پر مبنی ہوتی تھی۔ یہ قطعی ناممکن ہے کہ اتنی بڑی تحریک کل ہندوستان میں جاری ہو اور اس کے لیے کوئی جماعت نہ ہو۔ اس لیے جماعتِ مخلصین کا وجود صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۲) مولانا اپنا ہر کام بصیغۂ راز رکھتے تھے۔ کسی کو کبھی انھوں نے ہمراز نہیں بنایا۔ جس کو جتنا جاننا ضروری تھا اتنا ہی اس کو معلوم ہوتا تھا۔ اس کی دو مثالیں بڑی مضبوط ہیں۔ ۱۔ یہ کہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے مولانا عبید اللہ صاحب نے کہا کہ جب وہ کابل پہنچے تو جو کام انھیں کرنا تھا اس کے بارے میں ایک لفافہ خود امیر حبیب اللہ صاحب نے ان کو دیا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ تحریک کتنی ہمہ گیر اور کس حکمت عملی اور شعور سے مرتب کی گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ امیر حبیب اللہ منافقانہ شریک ہوا تھا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب نے مولانا منظور نعمانی صاحب کو بتلایا کہ وہ کراچی میں تھے اور شیخ الہند کا ایک نامہ ملا کہ ایک شخص تمہارے پاس آئے گا وہ جو کچھ کہے محفوظ کر لینا اور اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔ چنانچہ کراچی کی مسجد میں ایک شخص آیا اور اس نے میگزین کی تفصیل بتلائی۔ بندوق گولہ بارود وغیرہ۔ مولانا عبید اللہ نے محفوظ کر لیا۔ اور جب دیوبند گئے تو شیخ الہند کو

بتلادیا۔ ان کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ یہ معاملہ کیا تھا ۔اب لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے میگزین کا کوئی کارخانہ قائم کیا تھا جہاں اسلحہ وغیرہ رکھے جاتے تھے جس کا کوئی پتہ سی۔آئی۔ڈی کو نہ چل سکا۔ یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ وہ کارخانہ راجستھان میں تھا۔

(3) کوڈورڈ کے ایجاد کرنے کا وجود بھی معلوم ہوتا ہے جو بڑی انقلابی جماعتیں ضرور رکھتی ہیں۔اسی کوڈورڈ میں مولانا عبید اللہ صاحب نے شیخ عبدالرحیم کو روپیہ کے لیے اطلاع دی تھی جس طرح وہ روپیہ فراہم کرکے لائے اس سے عبداللطیف بیگ کرتپوری کی یہ بات بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جماعت کے لوگ کسی کو سب کچھ لکھ دیں گے لیکن مخلص نہیں لکھیں گے۔اگر لکھ دیں کہ یہ مخلص ہیں ان کو اتنا روپیہ دے دو تو وہ اپنا سب کچھ قربان کرکے اتنی رقم ضرور فراہم کرے گا۔

(4) جو لفافہ امیر حبیب اللہ خاں نے مولانا عبید اللہ کو کابل میں دیا تھا اس میں متعین نمبر تھے کہ کیا کیا کرنا ہے۔

(5) مفتی اعظم قسطنطنیہ کا مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف فتویٰ نہ دینا اور مالٹا کی جلاوطنی و اسیری قبول کر لینا بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ وہ مولانا کے زیر اثر تھا۔کرتپوری کا یہ کہنا بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن نے کل دنیائے اسلام میں انگریز کے خلاف اپنا جال بچھا رکھا تھا۔

(6) راجہ مہندر پرتاپ کی افغانستان میں سرگرمیاں جو آزادی ہند کے لیے تھیں اور مولانا عبید اللہ کا اور ان کا مل جل کر کام کرنا بھی اسی سلسلے کا ایک اہم معاملہ ہے۔

مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت شیخ الہند صرف تفسیر و حدیث و فقہ و اصول منطق اور فلسفہ، حساب اور مساحت مبتینہ اور معقولات ہی کے بحر زخار نہیں تھے بلکہ ان کو ادبیات عربیہ و فارسیہ و اردو شعر و سخن، اساتذۂ فن کے مقالات و قصائد و غزلیات اور مثنویاں وغیرہ اس قدر یاد اور ازبر تھیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا۔ اسی طرح حضرت کی نظر تاریخ اور سیاسی واقعات پر وسیع اور گہری تھی۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی، انتظامی، جنگی، صحتی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے بڑے ڈاکٹر اور اکنامکس کے پروفیسر ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اخبار بینی اور واقعاتِ عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہر حال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد و مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور کسی قسم کے خطرے کو بھی مرعوب

یا متاثر کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

ایک مرتبہ میں نے مولانا حسرت موہانی سے کہا کہ مولانا محمود حسن مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریرات سے متاثر ہوئے۔ مولانا حسرت تڑپ اٹھے اور بولے کیا کہا۔ مولانا محمود حسن اور کسی کی تحریر سے متاثر ہوں۔ وہ اور چیز تھے۔ یہ تھا مقام حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا۔

عبداللہ ہارون جعفر، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور تمام مسلمانوں کے لیڈروں کا مولانا کا مطیع و منقاد ہونا ان کے مقام کو ظاہر کرنے کے علاوہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ مولانا نے اندرون ہند کتنا کام آزادی کا کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ کثرت سے انقلابی جماعتیں بھی بنی ہوئی تھیں اور غرض یہ تھی کہ جب اسکیم کے مطابق افغانستان یا آزاد قبائل کا ہندوستان پر حملہ ہو تو وہ سب مسلح نکل پڑیں۔ توڑ پھوڑ کریں، پٹریاں الٹ دیں کارخانے برباد کر دیں، انگریزوں کو گولی مار دی جائے اور ہندوستان آزاد ہو جائے۔

دوسرا نتیجہ جو اخذ ہوتا ہے "جماعت مخلصین" کے قیام کا ہے یکو ذود ڈکے ایک پرزے پر لوگوں کا ہزاروں روپے لے کر دوڑنا کیا ظاہر کرتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی اسکیم ایک اینٹ کے بھٹے کی طرح تھی جو اوپر بالکل ٹھنڈی اور اس کے اندر آگ بھری تھی۔

مولانا نے جان نثار اور فدائے ملت لوگوں کا ایک بڑا گروہ تیار کر لیا تھا جو انقلابی جذبے سے معمور اسلام کے شیدائی، آزادی کے لیے سر بکف اور بڑے عزم و حوصلے کے لوگ تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی جدوجہد کی نذر کر دی۔ ان میں سے ایک مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ مولانا سندھی گورنمنٹ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے چنانچہ جب وہ افغانستان چلے ہیں تو سی۔ آئی۔ ڈی ان کو گرفتار کرنے کے لیے حرکت میں آئی اور زوروں سے کام شروع کیا۔ ایک شخص جو مولانا سندھی سے مشابہت رکھتا تھا گرفتار کر لیا گیا اور وائسرائے کو تار چلا گیا کہ عبیداللہ گرفتار ہو گیا۔ جو شخص گرفتار ہوا تھا وہ اسی جماعتِ مخلصین کا فرد تھا۔ وہ خاموشی سے جیل چلا گیا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ اب مولانا افغانستان پہنچ گئے ہوں گے تو اس نے شور مچایا کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے میں عبیداللہ سندھی نہیں ہوں۔

عبداللطیف کرتپوری یہ بھی بتلاتے تھے کہ مولانا کے رضا کار تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بڑے متقی اور پرہیزگار، عابد اور خدا شناس ہوتے تھے لیکن ان کو اجازت تھی کہ اگر شراب پلا کر کوئی کام نکالنا ہو تو شراب تک پلا سکتے ہو۔ چنانچہ ایران میں اسلحے کی آمد کا پتہ رضا کاروں نے انگریزوں کو شراب پلا کر چلایا تھا۔ مشہور ہے کہ انگریز بہت جلد نشہ میں بدمست و متوالا اور مدہوش ہو جاتا ہے۔

الغرض یہ ایک وسیع میدان جہاد بالسیف کا تھا جہاں سرفروشوں کا گروہ اسی طرح حکومت برطانیہ

کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لیے کام کر رہا تھا جس طرح انگریز اسلام کو دنیا سے مٹا دینے کے لیے سرگرمِ عمل تھا اور یہ سب صرف خلافتِ اسلامیہ کے بقا و قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی جا رہی تھی، ہندوستان کی آزادی تو دیگر اقوامِ مشرق کی آزادی کی طرح ان رہنماؤں کا مقصد بالذات تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک نفع یہ بھی تھا کہ خلافتِ مقدسہ کو بچانے کے لیے ہندوستان جیسے زرخیز ملک سے برطانیہ کو نکال باہر کر دینے کے بعد اس کا نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر اس کی تیزیٔ دندان اور شوخیٔ چشمِ شرر افشاں کا وجود باقی نہ رہے گا۔

آج کے حالات دیکھنے کے بعد یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ ناکامیاب ہوئے یا تحریکِ خلافت ناکامیاب ہوئی۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ تاریخ اور سیاست اور علت و معلول کے مسئلہ میں مطالعہ کی کمی اور فکر کی خامی رکھتے ہیں۔

## چوتھا باب

# جنگِ عظیم اور ہندوستانی سیاست

## عالمگیر جنگ 1914ء — 1918ء

سربیا، مانٹیلی، انگرو، یونان اور بلغاریہ نے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ترکی سے جنگ شروع کی۔ سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کے بعد نوجوان ترکوں نے زمامِ حکومت سنبھالی۔ ابھی صرف چند سال ہوئے تھے کہ اکتوبر 1912ء سے یہ جنگ شروع ہوگئی۔ جنگ شروع ہونے پر سب کا گمان یہ تھا کہ ترکی کامیاب رہے گا اس لیے انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر اسکوئتھ اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو گلے مینو دونوں نے ایک متفقہ بیان جاری کیا کہ کوئی بھی کامیاب ہو جغرافیائی حدود برقرار رکھے جائیں گے۔ مگر نتیجہ برعکس نکلا اور ترکی کو شکست ہوگئی۔ تب ان دونوں وزیر اعظموں نے اپنا رخ بدل دیا اور دیدہ دلیری سے یہ اعلان کیا کہ کوئی وجہ نہیں کہ فاتحین کو فتح کا ثمرہ نہ ملے۔ یہ لڑائی مئی 1913ء میں ختم ہوگئی۔ اور 13 مئی 1913ء کو لانڈ کے مقام پر معاہدہ ہوا جس سے ترکی کے یہ صوبے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد سربیا یونان اور رومانیہ نے بلغاریہ پر حملہ کر دیا اور یہ دوسری جنگ بلقان اگست 1913ء میں ختم ہوئی اور رومانیہ کے دارالسلطنت بوخارسٹ میں آخری معاہدۂ صلح مرتب ہوا۔ اس معاہدہ کی رو سے سربیا کی مملکت میں کافی اضافہ ہوگیا۔

28 جون 1914ء کو مملکت آسٹریا کے تاج و تخت کے ولیعہد آرچ ڈیوک فرینک فرڈ مینڈ کو سرجیو کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ سرجیو آسٹریا کے صوبہ باسنیا کا دارالسلطنت تھا۔ باسنیا پہلے سربیا کی قدیم حکومت میں شامل تھا۔ آسٹریا نے سربیا کو اس قتل کا ذمہ دار قرار دیا اور سربیا کے خلاف 28 جولائی 1914ء کو اعلان جنگ کر دیا۔ روس عرصہ سے سربیا کا حامی اور سرپرست تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ جرمنی نے روس کو منع کیا اور روس کے نہ ماننے پر اس کے خلاف 30 جولائی 1914ء کو جس دن بلگریڈ پر گولہ باری ہو رہی تھی روس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس روس کا حلیف تھا اس لیے 3 اگست 1914ء کو جرمنی نے فرانس کے خلاف بھی اعلان جنگ کر دیا اور فرانس پر حملہ کرنے کے لیے بلجیم سے راستہ مانگا۔

برطانیہ، پروشیا، فرانس، آسٹریا اور روس نے 1839ء میں بلجیم کی غیر جانبداری کے تحفظ کی گارنٹی کی تھی۔ اس لیے برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم دیا کہ وہ بلجیم سے راستہ نہ طلب کرے (پروشیا اب جرمنی کا ایک جزو ہے) جرمنی کے کچھ جواب نہ دینے پر 4 اگست 1914ء کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 23 اگست 1914ء کو جاپان نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور رفتہ رفتہ یہ عالمگیر جنگ بن گئی جس میں 1917ء یعنی آخر میں امریکہ بھی شریک ہو گیا، جس کی پالیسی اب تک یورپ کی سیاست سے علیحدگی کی تھی۔ برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کا نام اتحادی رکھا گیا۔ اتحادیوں میں حسب ذیل ممالک شامل تھے۔

(1) برطانیہ (2) فرانس (3) اٹلی (4) امریکہ (5) جاپان (6) بلجیم (7) بولویا (8) پیرپل
(9) چین (10) کیوبا (11) زیکوسلوویکیا (12) یونان (13) پولینڈ (14) پرتگال
(15) رومانیہ۔ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کو لے کر مجموعی تعداد 17 تک پہنچتی ہے۔

## جنگ میں ترکی کی شرکت

برطانیہ کے کارنامے ترکوں کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ جس طرح ایک ایک صوبہ کو ترکی کے قبضے سے نکال کر دوسروں کو ان پر اقتدار جمانے میں برطانیہ نے امداد و اعانت کی تھی وہ عیاں تھے۔ مثلاً 78-1877ء میں روس و ترکی کی جنگ میں ترکی کے دو صوبے بوسینا اور ہرزی گووینا آسٹریا کے زیر انتظام برطانیہ ہی کی سازش سے دیے گئے تھے۔ بعد کو 1908ء میں آسٹریا نے ان دونوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ مصر پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور طرابلس کی جنگ میں ترکوں کا راستہ مصر سے روک دیا تھا۔ الغرض ایک داستان پھیلی ہوئی تھی۔ نوجوان ترکوں نے اصلاحات نافذ کر کے برطانیہ کی حمایت حاصل کرنی چاہی تھی لیکن جو طرزِ عمل بلقان میں برطانیہ اور فرانس نے اختیار کیا اس نے نوجوان ترکوں میں آخر مایوسی پیدا کر دی اور کچھ بھی ہو نومبر 1914ء میں ترکی بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا۔

جرمنی کی فوجی طاقت کا اس وقت ایک عالم لوہا مانتا تھا۔ اس نے اپنی سائنسی اور تکنیکی معلومات کی برتری کی بنا پر ایسے آلاتِ حرب تیار کیے تھے جن کا دنیا کو تصور بھی نہ تھا۔ بلجیم کا وہ قلعہ جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، جرمنی کی ہاوٹزر توپوں نے روئی کے گالے کی طرح اڑا دیا۔ سربیا کے پرخچے اڑ گئے۔ فرانس بھاگنے لگا۔ شروع میں جو جرمنی کے سامنے آیا اس نے مُنہ کی کھائی۔

ترکوں نے جنگ میں داخل ہوتے ہی انور پاشا کی قیادت میں کوہ قاف کے علاقوں پر زبردست حملہ کیا۔ لیکن اس کو پسپا ہونا پڑا اور روس نے ارض روم پر قبضہ کر لیا۔ 2 فروری 1915ء کو مصر میں

نہر سویز پر ترکوں نے یلغار کیا لیکن وہاں بھی ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکی کو جنگ سے خارج کرنے کا پروگرام بنایا اور برطانیہ اور فرانس کی متحدہ بحری قوت نے 19 فروری 1915ء کو درّہ دانیال پر بھرپور بحری طاقت سے وار کیا۔ اتحادیوں کا خیال تھا کہ درّہ دانیال جو ایک ڈھلوان درّہ ہے اور جس کے دونوں کناروں پر قلعے بنے ہوئے ہیں، ان قلعوں پر توپیں نہیں ہیں اور وہ بآسانی درّہ دانیال ہو کر قسطنطنیہ پر قابض ہو جائیں گے۔ کیونکہ سلطان عبدالحمید نے ان قلعوں کو زیرِ حکم آقایانِ برطانیہ غیر مسلح کر دیا تھا۔ لیکن ان کو سخت مقابلے کا سامنا ہوا نوجوان ترکوں نے آتے ہی ان قلعوں پر توپیں چڑھا دیں اور ہر طرح کا ساز و سامانِ حرب مہیا کر دیا تھا۔ سینکڑوں توپوں کی زد سے جبکہ اس زمانہ میں ہوائی جہاز نہ تھے بحری جہازوں کا بچ کر نکل جانا محال تھا۔ لیکن اب یہ معاملہ اتحادیوں کی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ 19 فروری 1915ء کو پسپا ہونے کے بعد 23 فروری 1915ء، 6 مارچ 1915ء، 18 مارچ 1915ء کو زبردست تیاریوں سے حملے کیے گئے جن کی نگرانی کے لیے لارڈ کچنر بنفسِ نفیس ایک موقع پر آئے لیکن سب بے سود۔ اتحادیوں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو 25 اپریل 1915ء کو بحری و برّی مشترکہ حملہ شروع ہوا۔ اسکیم یہ تھی کہ گیلی پولی کے ذریعہ خشکی کے راستے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا جائے لیکن ترکوں نے جس طرح بحری حملہ رد کر دیا تھا اپنی روایتی شجاعت اور دلیری کو قائم رکھتے ہوئے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں اتحادیوں کو شکستِ فاش دی اور آخر کار خود اتحادیوں کے قول کے مطابق 31389 ہلاک 78740 مجروح اور 9708 گمشدہ کو چھوڑ کر اتحادی وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس جنگ میں ترکوں نے جس جانبازی و جوانمردی کا ثبوت دیا وہ ان کی شجاعانہ کارروائیوں میں بھی عدیم المثال ہے۔ لیکن میسوپوٹامیہ میں ہندوستان کی ہندو مسلم فوجوں اور عربوں کی بغاوت سے ترکوں کو شکست پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع میں تو ترکوں نے اپنی بہادری کا سکّہ جمایا لیکن بعد کو موصل اور دریائے فرات پر ترکوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ 28 ستمبر 1916ء کو تکریت پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر جنرل ٹاؤنشنڈ برطانوی اور ہندوستانی فوجوں کے ساتھ غازہ کی طرف بڑھا۔ ادھر فلسطین کا یہ حال ہوا کہ برطانوی اور ہندوستانی فوجیں غازہ تک بڑھتی چلی گئیں اور 26 مارچ 1917ء کو غازہ کے مضبوط مسلح شہر پر حملہ ہوا۔ دو دن کی خونریز جنگ کے بعد انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ تب فرانس سے جنرل الینبی کو بھیجا گیا۔ جنرل الینبی نے 31 اکتوبر 1917ء کو بیر شیبہ پر قبضہ کر لیا اور 7 نومبر 1917ء کو غازہ کا سقوط بھی عمل میں آیا۔ اس کے بعد 16 نومبر 1917ء کو جنرل الینبی نے ترکوں کو جافہ تک دھکیل دیا اور 9 دسمبر 1917ء کو بیت المقدس فتح ہو گیا۔

1917ء موسمِ بہار میں جنرل الینبی نے دریائے اردن کو عبور کر لیا اور جنرل الینبی کی سوار فوجوں نے ترکوں کے لیے مغرب کی طرف پیچھے ہٹنا ناممکن کر دیا۔ مشرق کی طرف امیر فیصل اور کرنل لارنس کی قیادت

میں تعاون کرنے والے عربوں نے راستہ کاٹ دیا۔ اکتوبر 1917ء کے آخر میں جنرل النبی الیو میں داخل ہوا اور فلسطین کی فتح مکمل ہوگئی۔ آخرکار 30 اکتوبر 1918ء کو مڈراس کے مقام پر عارضی صلح کی بات چیت کا آغاز ہوا اور اسی دن ترکی کی جنگی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

"مشرق" مورخہ 13 مارچ 1919ء کے صفحہ 18 پر نوٹ اور خبروں کے زیرعنوان حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"ہزاکسلنسی کمانڈرانچیف نے وائسرائے کی مجلس قانون ساز میں ایک بیان پیش کیا ہے جس میں دکھلایا ہے کہ ہندوستان نے مختلف رزم گاہوں میں اب تک 579252 جنگجو آدمی بھیجے ہیں جن میں 3,02,199 عارق عرب، 1,40,419 مصر 86382 فرانس 34511 مشرقی افریقہ 24401 خلیج فارس 9717 دّرہ دانیال وسالونیکا اور 11573 عدن میں بھیجے گئے ہیں۔ ان افواج کے نقصانات کی تفصیل میں یہ دکھایا گیا ہے کہ 19010 آدمی مارے گئے" 61916 زخمی ہوئے" 3341 لاپتہ ہیں اور 6146 قید ہیں اور 1223 آدمیوں کے متعلق بھی قید کا گمان ہے۔ غیر جنگجو جو ہندوستان سے بھیجے گئے تھے ان کی تعداد 5 لاکھ سے زائد ہے۔"

9 نومبر 1918ء کو جرمنی نے صلح کی درخواست کی۔ قیصر جرمنی ولیم دوم نے تاج و تخت سے دستبرداری دے دی اور فرار ہوگیا اور جنگ بندی کے شرائط طے ہوئے اور بعدہٗ ہر محارب ملک سے اتحادیوں نے الگ الگ صلحنامے کیے۔

## دورانِ جنگ ہندوستان کا حال

کانگریس اس وقت تک ایک معتدل جماعت تھی جس کا نصب العین ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان دوستی قائم کرکے ہندوستان میں آہستہ آہستہ زیرسایہ حکومت برطانیہ حکومت خوداختیاری قائم کرنا تھا۔ کانگریس برطانیہ کے ساتھ تھی اور مہاتما گاندھی جنگ میں انگریزوں کے حامی تھے اور رنگروٹ بھی بھرتی کرتے تھے۔ ابھی ان کا عدم تشدد کا عقیدہ ان کے ضمیر پر حاوی نہیں ہوا تھا۔ سیاسی انقلابی جماعتوں کو جو بذریعہ تشدد اپنی حکومت لانا چاہتی تھیں اس جنگ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ یورپ کا معاملہ تھا اور ابھی دنیا آج کی طرح سمٹ کر اتنی چھوٹی نہیں ہوئی تھی حتیٰ کہ جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں امریکہ یورپ کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ 1917ء میں اوّل بار امریکہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرکے یورپ کی سیاست میں

اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ عجیب مخمصے کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ہر ایک فرد کو ترکانِ آلِ عثمان سے گہری عقیدت تھی۔ دوسری جانب علی گڑھ تحریک جو سرسید نے چلائی اس نے برطانیہ کی عظیم وفاداری کا سبق دے کر ان کو حکومت کا پختہ حامی بلکہ غلام بنا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں ان کی بقا کا انحصار برطانوی حکومت کے قیام میں مضمر ہے۔ اس لیے ایک طبقہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو سرکاری نوکریوں اور سرکاری مراعات پر تکیہ کیے ہوئے تھے یا جاگیردار یا نواب یا تعلقدار تھا یا وہ جوان کے زیر اثر تھا۔ اس مخمصے کی زیادہ تر وجہ علی گڑھ تحریک تھی جس کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو عظیم شخصیت ابھری وہ سرسید کی تھی۔ سرسید ایک بڑے ذی علم روشن خیال، ذہین اور عالی دماغ انسان تھے۔ ان کو اگر عہد آفریں کہا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ سرسید مسلمانوں کی پسماندگی اور مفلسی سے حد درجہ متاثر تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پاس نہ اسکول ہیں اور نہ کالج اور نہ زمانہ حاضرہ کے علوم جدید کی روشنی ہمارے بچوں تک پہنچتی ہے۔ لے دے کر چند عربی مدارس ہیں جہاں قدیم علوم اور درسِ نظامیہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مغرب کی اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ قدامت پرستی مسلمانوں کے رگ و پے میں اس درجہ سرایت کر گئی تھی کہ کسی جدید خیال کا قبول کرنا آسان نہ تھا۔ خاص کر جبکہ مسلمان گردابِ مایوسی میں پھنسے ہوئے تھے اور سوچتے تھے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کو دیکھا۔ وہاں کے کلب اور مباحثے دیکھے، کھیل کے میدان دیکھے اور ان کے دل میں یہ آواز پیدا ہوئی کہ مذہبی علم کے ساتھ ساتھ ان باتوں کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہمارا ملک بھی آکسفورڈ اور کیمبرج بن جائے۔ یہاں بھی طالب علموں کے کلب ہوں جہاں وہ مباحثے کریں۔ کھیل کے میدان ہوں جہاں ہر قسم کے کھیل میں امتیاز لائیں اور مسلم معاشرے کا ایک نیا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔

سرسید ایسے روشن ضمیر اور دانا تھے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کوئی اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکا تھا آج کا منظر دیکھ لیا تھا اور اسی کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی تھی حتیٰ کہ درسگاہ کا افامتی کردار جس کی ضرورت اور جس کے محاسن کا تصور جدید ہے سرسید کا وہ بھی ایک خواب تھا۔ انھوں نے آکسفورڈ اور اور کیمبرج کی نقل کی۔ لیکن انھوں نے مذہب پر بھی نظر رکھی انھوں نے کہا کہ جس طرح وہاں لڑکے گرجا میں جاتے ہیں یہاں مسجدوں میں جانا، نماز پڑھنا اور دین کی تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ انھوں نے ولایت کی طرح یہاں بھی لڑکوں کا لباس مقرر کیا لیکن ان کا لباس نہیں لیا بلکہ ترکی ٹوپی۔ پائجامہ اور ترکی کوٹ

شو اور موزہ لباس قرار دیا۔ جو اسے نہ پہنے وہ ڈائننگ ہال میں گھس نہیں سکتا جہاں سب مل کر ہی ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ الغرض سرسید نے دینداری اور مذہب کو جدید علوم اور جدید تہذیب سے ملا کر ایک نیا معاشرہ تعمیر کیا اور ان کی عظمت کے لیے اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ آج وہی چیز ہر شخص کو محبوب و مرغوب ہے۔ سرسید انتہائی مخلص انسان تھے۔ اور استقلال مزاج، صبر، بردباری، سنجیدہ شعور میں یکتائے روزگار تھے۔ انھوں نے مراسم کی زنجیریں توڑیں اور نئے آئینِ تہذیب و تمدن مرتب کیے جو آج بھی رائج ہیں۔ سرسید ایک عظیم انسان تھے۔ ایسے انسان جن کا مثل صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے قوم کو ایک فکر دی اور ایسی فکر جس نے مسلم قوم کے دماغ پر قبضہ کر لیا اور بے شمار دانشور اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ علامہ شبلی جیسا مورّخ، حالی جیسا شاعر و مفکر، ڈاکٹر نذیر احمد جیسے انشاپرداز و ادیب، نواب محسن الملک، مولوی ذکاءاللہ، نواب وقار الملک جیسے فاضل، مدبر و مخلص سب سرسید کے ہمنوا، معین و مددگار تھے اور سب نے مل کر ایک ایسا کالج بنایا جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جس نے ملّتِ اسلامیہ ہند کو سچّے خدمت گزار اور وہ سب کچھ دیا جو اسے درکار تھا۔ سرسید نے علی گڑھ میں فرقہ واریت کو کبھی گھسنے نہیں دیا اور وقت کے قانون کے مطابق اگر وہ علی گڑھ کو صرف مسلمان بچوں تک محدود رکھتے تو کوئی امر مانع نہ تھا لیکن سرسید نے انتہائی وسعتِ قلب کا اظہار کرتے ہوئے کالج کو ہر طبقۂ خیال، ہر مذہب و ملّت کے لیے کھلا رکھا، تنگ نظری سے گریز کیا اور سب سے پہلا طالب علم جو علی گڑھ سے گریجویٹ ہو کر نکلا وہ مسلمان نہیں ہندو تھا۔ اس طرح سرسید کے صحیح خیالات اور مزاج کا اندازہ ہوگا۔

1883ء سے 1894ء تک سرسید کی یہی کیفیت رہی۔ اس زمانہ کی تحریریں اور تقریریں یہی بتاتی ہیں کہ سرسید قوم سے مراد ہندو اور مسلمان دونوں لیتے تھے اور مشترک حکومت ہی نہیں مشترک تہذیب کے بھی قائل تھے، جسے آج سیکولرازم کہا جاتا ہے اس کی بنیاد سرسید نے رکھی۔ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج ہندو مسلمان بچوں، ہندو مسلمان اساتذہ کا ایک خوش گوار امتزاج تھا۔ یہیں سے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد نکلے اور یہاں علامہ شبلی اور ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کے ساتھ چکرورتی جا بن چندر، چکرورتی بھوانی چندر بھی اساتذہ میں تھے اور 47 اساتذہ میں 17 ہندو تھے اور وہ کلیدی جگہوں پر فائز تھے۔ سب سے پہلا سپاسنامہ علی گڑھ کالج کی طرف سے مہاراجہ پٹیالہ کو دیا گیا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے لوحِ سرسید سے حسبِ ذیل پیغام اخذ کیا ہے جو بالکل صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں — ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے　　دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

علی گڑھ کالج میں سرسید نے ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی اور سیکولرازم کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ سرسید نے نوجوان نسل کے لیے پوری طرح اسلام پر قائم رہتے ہوئے علوم جدیدہ کی تعلیم وتحصیل کا جو خواب دیکھا تھا وہ بھی پورا ہوا۔ علی گڑھ کے لڑکے اس پیغام کے مصداق ثابت ہوئے۔

زمانے با ارسطو آشنا باش　　دمے با ساز بیکن ہمنوا باش
ولیکن از مقام شاں گزر کن　　مشو گم اندریں منزل سفر کن

کالج پھلا پھولا۔ میرے ایک انگریز پروفیسر نے مجھ سے کہا کہ ان کا ایک دوست کلکتہ میں ملا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ پروفیسر نے کہا علی گڑھ۔ تو اس نے کہا اچھا علی گڑھ؟ جہاں کے لڑکے فیز کی بنی لال ٹوپی پہنتے ہیں اور کرکٹ اتنا عمدہ کھیلتے ہیں؟

سرسید نے قوم کو ہمت دلائی، کام کرنے کے لیے اکسایا، ناامیدی میں امید کا چراغ جلایا۔ ان سے کہا کہ اپنی خامیوں کا احساس کرو اور ان کو دور کرو کیونکہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر انقلاب پیدا نہ کرے۔ خودشناسی وخوداعتمادی اور قول وعمل میں راستبازی کی تعلیم دی اور اپنے صبر واستقامت سے قوم مسلم کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑایا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آج بھی وہی ہے۔ اس کا کردار بھی وہی ہے، اس کا ضمیر بھی وہی ہے اور اس کا اندازِ فکر بھی وہی ہے۔

اس طرح سرسید کی عظیم شخصیت ایک انقلاب آفریں شخصیت تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاالٰہ الااللہ کا تاج ہمارے سر پر، وہ انھوں نے کر دکھایا۔ انھوں نے سیکولرازم کا جو بیج کالج کے اندر رکھا تھا وہ آج تناور درخت بن چکا ہے اور بادِ حوادث کے کسی جھونکے سے بھی وہ سرنگوں نہیں ہوا۔

## سرسید اور سیاست ہند

لیکن سرسید ہندوستان کی سیاست پر اس وقت نمودار ہوئے جب 1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان بری طرح کچلا گیا تھا۔ قتل، پھانسیوں اور جائدادوں کی ضبطی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جو عرصہ تک جاری رہا تھا۔ اور مکمل تسلط ہونے کے بعد ہی انگریز حکومت نے جونیر ملازمتوں سے مسلمانوں کا مکمل اخراج کر دیا تھا۔ بڑی نوکریاں تو خیر ہندوستانیوں کو ملتی ہی نہ تھیں۔ سرسید ان حالات سے بے انتہا متاثر تھے

اور اس کا انھوں نے کچھ زمانے کے بعد یہ حل سوچا کہ :۔

(1) مسلمانوں کے افلاس کو دور کیا جائے۔

(2) ملک کی آزادی کو جہاں تک ممکن ہو ٹالا جائے۔ اور مسلمانوں کے افلاس کو دور کرنے اور باعزت زندگی حاصل کرنے کے لیے حکومت کی مکمل وفاداری کا تمغہ حاصل کیا جائے کیونکہ اگر ملک آزاد ہوا تو $\frac{3}{4}$ ہندو اور $\frac{1}{4}$ مسلمان ہوں گے تو پیس دیے جائیں گے چنانچہ 11 اور 12 جنوری 1888ء کے پانیر میں سرسید کی ایک تقریر شائع ہوئی جو انھوں نے 28 دسمبر 1887ء کو ایک مجمع کے سامنے کی تھی جس میں تعلقداران اودھ حکومت کے سول اور فوجی افسران، وکلاء، نمائندگانِ اخبارات، فضلاء اور دانشور، ہر فرقہ و خیال کے ہندو بین سنّی و شیعہ علماء ہندوستان اور انگلستان کے نوجوان تعلیم یافتہ موجود تھے۔ تقریر میں انھوں نے زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو ہرگز کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم ہوئی تو ان کا مستقبل تاریک ہوگا اور ان کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اور اس سے مسلمانوں کو دائمی غلامی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سرسید نے اس کے تین وجوہ بتلائے تھے۔

(1) ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ فرض کیجیے کہ انگریز اپنی فوجیں وغیرہ لے کر چلے جائیں تو کون یہاں حکومت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ تختِ حکومت پر ہندو اور مسلمان دونوں نہیں بیٹھ سکتے۔ کوئی ایک دوسرے کو مغلوب کرے گا۔ یہ امید کرنا کہ دونوں مساوی اختیارات رکھیں گے امر ناممکن اور ناقابلِ عمل تصور کی تمنا کرنا ہے۔

(2) انتخابی حکومت ہندوستان کے لیے غیر موزوں ہے اس لیے کہ اگر ووٹ لیے گئے تو مسلمان مسلمانوں کو اور ہندو ہندوؤں کو ووٹ دیں گے۔ ایسی صورت میں $\frac{3}{4}$ اور $\frac{1}{4}$ کی نسبت ہوگی

(3) مسلمانوں کو انگریزی حکومت پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ ان کے حقوق کا تحفظ کرسکتی ہے اور ان کو انتظامیہ میں باأثر نمائندگی عطا کرسکتی ہے

یہ تقریر جس عظیم الشان مجمع میں اور جس ماحول اور زمانہ میں کی گئی تھی اس کی وجہ سے اس کی بہت اشاعت ہوئی۔ ہندوستان کے اخبارات میں غصہ اور نفرت ٹپکنے لگے۔ البتہ لندن ٹائمز نے 15 جون 1888ء کی اشاعت میں اس تقریر کو ایک ہندوستانی کی زبان سے یکے از بہترین مباحثِ سیاسی قرار دیا۔

سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہیں اور صرف تعلیم تک اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دینے میں سرسید کا منشا یہ تھا کہ مسلمان انگریز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے

رہیں۔ انگریز ہندوستان سے نہ جائیں کیونکہ وہی مسلمانوں کا تحفظ کرسکتے ہیں۔ سرسید مسلمانوں کو زیادہ عرصہ تک روک نہ سکے اور دھیرے دھیرے مختلف نیم سیاسی سوسائٹیاں قائم ہوتی رہیں اور آخرکار 1906ء میں مسلم لیگ کا ظہور ہوا۔ مسلم لیگ پر امراء اور تعلقداران کا قبضہ تھا اور اس کا رنگ رخ بالکل غلامانہ تھا۔ بعد کو رائے عامہ سے مجبور ہو کر اس نے سلف گورنمنٹ کا نام بھی لیا تو "سُو ٹیبل" کا لفظ اس کے ساتھ لگا دیا۔ مسلم لیگ جس کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا۔

ع وہ لیگ برس بھر میں بدلتی ہے جو کروٹ

صرف سالانہ جلسے کرتی ہے اور تحریکِ خلافت کے ایک قلیل عرصے کے سوا بقیہ تمام اوقات میں اپنے اس نظریے پر قائم رہی تاآنکہ ہندوستان تقسیم ہوگیا اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کرنا پڑ رہا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہے۔

کم و بیش نوے سال سے زائد گزرنے کے بعد آج جب ہم سرسید کی تقریر پڑھتے ہیں تو جہاں تک سیاسی فکر کا سوال ہے ہمیں سرسید عظیم نہیں معلوم ہوتے البتہ جہاں تک ان کی تعلیمی خدمتوں کا معاملہ ہے وہ آسمانِ عظمت کے مہر و ماہ نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ سرسید کی بعض تقریروں کے جستہ جستہ فقروں سے سرسید کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ مثلاً مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے سرسید کے سیاسی عقائد پر بحث کی ہے[1] اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ صرف نیشنلسٹ نہیں بلکہ انقلابی تھے۔ مولانا نے سرسید کی 1884ء کی دو تقریریوں کو اساس بنایا ہے جو 1888ء کے اعلان بالجبر سے قبل کی ہیں۔ بلاشبہ اس وقت جن وسائل سے وہ مسلمانوں کا افلاس اور ان کی پستی کو دور کرسکتے تھے، پختہ نہیں ہوئے تھے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ان میں فرقہ پروری برائے نام بھی نہ تھی۔ سرسید کشادہ قلب اور صاف دماغ انسان تھے لیکن بعد کو بطور وسیلہ حصولِ مقصد ان کے خیالات میں جہاں تک ملک کی آزادی کا تعلق ہے ایک زبردست انقلاب آیا چنانچہ 1887ء میں یعنی اس کے تین سال بعد انھوں نے ایک عظیم الشان مجمع میں اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں اور ہندوستان نمائندہ حکومت کا اہل نہیں ہے۔

اس طرح سید امیر علی کی مجوزہ نیشنل محمڈن کانفرنس میں سرسید کی عدم شرکت سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سیاست میں فرقہ واریت کے خلاف تھے بلکہ اصل وجہ وہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے تحفظ کے لحاظ سے ہندوستان کو انگریزوں کے زیرِ سایہ رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے

---

[1] "برہان" دہلی ماہ ستمبر 1972ء صفحہ 158 سے صفحہ 166 تک

کے خلاف تھے اور اسی لیے انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی، اس کے خلاف "دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" بنائی جو ہندوستان کے گلے میں ابدی غلامی کا طوق ڈالے رکھنا چاہتی تھی۔ انھوں نے سید جمال الدین افغانی کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کو غلط ٹھہرایا۔ ان سب باتوں کو تاریخ کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مولانا اکبرآبادی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ "ہندوستان اور مسلمانوں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہو یا کوئی انجمن صرف مسلمانوں کی ہو۔ سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونا مضر ہوگا۔

مگر یہ یقین کیوں تھا؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ موجودہ نظامِ حکومت میں کسی ادنیٰ ترین تبدیلی کے خواہاں نہ تھے اور یہ تھا فرق سرسید اور معتدل کانگریسی رہنماؤں میں۔

مولانا اکبرآبادی نے مولانا حالی کا وہ قول بھی نقل کیا ہے جس میں مولانا حالی نے مسلمانوں کی سیاست میں شرکت مسلمانوں کی نااہلی قرار دیا ہے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں "اصلی بات یہ ہے کہ جب کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ علوہ خوردن روئے باید۔"

لیکن انگریز بھی تو یہی کہتا تھا کہ ہندوستانی حکومت کے لیے نااہل ہیں اور ہم ان کو تربیت دے رہے ہیں۔ پھر مولانا حالی کے قول کو کسی نظریے کی تائید میں جس کا تعلق سرسید سے ہو پیش کرنا فعل عبث ہوگا حالی ایک بہت بڑے شاعر، بڑے حق پرست اور مخلص انسان تھے لیکن مسدس حالی ہی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے مرثیہ خواں ہیں جن کو ہر جگہ زخم ہی زخم نظر آتے ہیں اور اس کے علاوہ سرسید کے وہ ہمیشہ حامی اور ذہنی ساتھی تھے۔ بقول اکبر مرحوم ؎

سید کا حال حضرت حالی سے پوچھیے　　بالے میاں کا حال موفالی سے پوچھیے

سرسید صرف انگریزوں کی حکومت ہی سے مرعوب نہ تھے بلکہ ان کی تہذیب سے بھی اتنا ہی مرعوب تھے۔ جس کسی نے تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا مطالعہ کیا ہے یا سرسید کی تحریروں کو دیکھا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ انگریزوں کی عادات اور ان کے اطوار سے، ان کے رہنے اور کھانے کے طریقوں کے کتنے مداح تھے۔ بلکہ مشرقی طرز کو غیر مہذب اور دیہاتی پن قرار دیتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں بھی ان کی مرعوبیت کا یہی عالم تھا چنانچہ کلام پاک کی جو تفسیر انھوں نے لکھی اس میں ملائکہ، اجنہ، معجزات، معراج جسمانی سب کا انکار کیا۔ جبریل امین کا بھی انکار کیا۔ خود کہتے ہیں کہ

بجبریلِ امیں قرآں بہ پیغام نمی خواہم　　ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

سرسید کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اندازہ ہی نہ کرسکے کہ ملک ضرور آزاد ہوگا اور نہ یہ سوچ سکے کہ تب مسلمانوں کا کیا حال ہوگا" ان کے پاس ہندوستان کی مختلف قوموں اور خاص کر ہندو مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا اس لیے انھوں نے راہ فرار اختیار کی یہ بڑی جرأت کا کام ہے۔ جس شخص نے اتنا بڑا ذہنی انقلاب پیدا کر دیا ہو، جس نے ماحول کی پروا نہ کی ہو اور جملہ فرسودہ توہمات کو کچل ڈالا ہو وہ اتنا کم نظر تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرسید نے اپنی دیدہ وری سے اس کو سمجھ لیا ہو کہ جو جال بچھا ہوا ہے اس کا توڑنا ان کے بس کا کام نہیں۔ اور ایک عبوری دور کے لیے ایک پالیسی اختیار کرلی ہو۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سرسیّد نے سیاسی کام آخرِ عمر میں شروع کیا۔ اور ان کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے جلدی تھی۔

مسلم لیگ جو خالصتاً مسلمانوں کی جماعت تھی اور جس نے ہمیشہ سوائے تحریکِ خلافت کے ایک عارضی وقفہ کے درمیان جب پبلک کا زور شباب پر تھا آزادیِ ہند کی مخالفت اور سرسید کی پالیسی کا ایک لازمی نتیجہ تھی۔ علامہ شبلی نے مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی پر حسب ذیل قطعہ لکھا ہے ؎

| | |
|---|---|
| معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم | جرم یہ ہے میں نے کیوں بدلا وہ اندازِ کہن |
| میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے | کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن |
| کانگرس سے مجھ کو اظہارِ برأت کیوں نہیں | کیوں حقوقِ ہند میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن |
| خیر میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں سو ہوں | آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن |
| آپ نے شملہ میں جا کر کی تھی جو کچھ گفتگو | ماحصل اس کا یہی تو تھا پس از تمہیدِ فن |
| نذر بازو گلیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق | اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہرِ پنجتن |

یہ قطعہ سرسید کے جسم کا پیراہن نہ بن سکا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے نظامِ حکومت میں ادنیٰ ترین تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریز اسی طرح ملک پر حکمراں رہے اور مسلمان کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہ لیں اور اسی کا نام علی گڑھ تحریک ہے۔

## علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج

علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ کالج میں بعض لوگوں نے امتیاز نہیں کیا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے کالج کو علی گڑھ تحریک کا ایک خیمہ سمجھ کر اس سے بغض و عداوت کا اظہار کیا حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ علی گڑھ کالج ایک تعلیمی ادارہ ہے اور تمام دیگر تعلیمی اداروں کی طرح یہاں سے مختلف الخیال لوگ نکلے ہیں۔ اس کالج نے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حسرت موہانی، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، خواجہ

عبدالمجید، تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ جیسے احرار بھی پیدا کیے۔

انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈے کی فن کاری مظاہرے سے یہاں بھی تساہلی نہیں برتی اور اپنے ریزہ چینوں کی معرفت یہ مشہور کر دیا کہ علماء نے سرسید پر جو کفر کا فتویٰ دیا تھا وہ اس لیے تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کذب صریح ہے۔ انگریزی زبان، علوم جدیدہ اور سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی کسی عالم نے کبھی مخالفت نہیں کی۔ سید جمال الدین افغانی جس نے سرسید پر برملا کفر کا فتویٰ دیا تھا، خود ان علوم کی تعلیم کا زبردست مبلغ تھا حقیقت یہ تھی کہ سرسید جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے تھے اور پھر جس طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قدموں میں اس وقت ڈال رہے تھے جب دنیا میں اسلام کی تباہی کا انگریز زبردست جال بچھا رہا تھا۔ ان سے علمائے حق نے بیزاری ظاہر کی تھی۔ سید جمال الدین نے اپنے مضمون " شرح حالِ اگموریان" میں سرسید کو بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے۔ (اس میں نوٹ ہے کہ ہندوؤں میں ایک فرقہ اگھور ناتھ کی نسبت سے اگھوری کہلاتا ہے اور اپنے عقائد کی وجہ سے بدنام ہے۔ یہاں اگھوریان سے نیچری مراد ہیں) پس سرسید پر کفر کا فتویٰ اس لیے تھا کہ انھیں نیچری قرار دیا گیا تھا، انگریزی تعلیم دلانے کی وجہ سے نہیں۔

اس مسئلہ پر ایک ایسے عظیم ترین عالم محقق و عارف کی رائے ذیل میں درج کی جاتی ہیں جس کے بعد کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی بنیاد رکھنے کے لیے جو اجتماع کیا گیا تھا اس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں فرمایا:

> " آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"

اسباب بغاوت ہند میں خود سرسید نے لکھا:-

> " بڑے بڑے کالج جو شہروں میں قائم تھے اول اول گو ان سے بھی کچھ وحشت لوگوں کو ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے زندہ تھے مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا۔ انھوں نے صاف جواب دیا کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔"

یہ سب باتیں یہاں اس لیے درج کی گئیں کہ 1888ء سے انگریزوں کی غلامی کا جو طوق گلے میں پڑا تھا اور جس طرح انگریز پر اعتماد کرنے کی تعلیم دی گئی تھی وہ ایک طبقہ پر اپنا کام کر گئی تھی۔ اس لیے جب حکومت

برطانیہ نے خلافتِ مرکزیہ اسلامیہ اور اماکنِ مقدسہ کے تحفظ کا وعدہ کیا تو اس طبقہ نے یقین کر لیا اور انگریز کی فوج میں ہی نہیں بلکہ بیت المقدس تک میں ترکوں کے خلاف جنگ کرنے میں کوئی قلبی خلش محسوس نہیں کی اور کثیر تعداد میں اسلام کا قلعہ خود ڈھانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ اس سے اس کا بھی اندازہ ہو گا کہ بعد کو جو ہنگامہ ہندوستان میں پیدا ہوا وہ اس امر کا مظہر ہے کہ یہ سب اوپری باتیں تھیں۔ دل کی اندرونی گہرائیوں میں کچھ اور بھرا تھا جس طرح سرسید اپنی تمام کوششوں کے باوجود مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے باز نہ رکھ سکے اور دھیرے دھیرے مختلف سوسائٹیاں بنتے بنتے آخر کار مسلم لیگ وجود میں آ گئی۔ اسی طرح علمائے اسلام نے دینِ برحق کے سایہ میں آزادیٔ ہند کا جو آوازہ بلند کیا تھا ناکام نہیں رہا اور دلوں میں جگہ کرتا چلا گیا۔

## دورانِ جنگ برطانیہ کا طرزِ عمل اور ناکام مقابلہ

جب 1914ء میں ترکی عالمگیر جنگ میں شریک ہوا تو خلیفۃ المسلمین نے اعلانِ جہاد کر کے تمام دنیا کے مسلمانوں کو شرکت کے لیے حکم دیا۔ ایک انگریز جریدہ گریفک GRAPHIC میں سلطان المعظم ترکی کی تصویر بھی تھی جو ایک عام جلسہ میں جہاد کا فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

*THE SULTAN PROCLAIMING JEHAD (HOLYWAR)*
*TURKEY PRONOUNCING HER OWN DEATH*

یعنی سلطان جہادِ مقدس کا اعلان کر رہے ہیں۔ ترکی اپنی موت کا فتویٰ خود ہی دے رہا ہے۔

افغانستان میں مولانا عبید اللہ سندھی نے امیر حبیب اللہ کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا لیکن امیر حبیب اللہ انگریزوں کا دوست اور وظیفہ خوار تھا۔ ایسے شخص کو انگریزوں سے لڑنے پر آمادہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ مگر اسی امیدِ موہوم پر کتنے ذہین اور ہونہار اور دولتمند گھرانوں کے طلباء اور نوجوان بڑی مشقت اٹھا کر افغانستان بھاگ کر پہنچے جن میں مولوی محمد علی قصوری بھی تھے جو کیمبرج یونیورسٹی کے ایم اے اور رنگلر تھے اور قصبہ قصور (نزد لاہور) کے معزز تعلیم یافتہ اور ذی حیثیت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ بعد کو ہندوستان آ گئے تھے۔ قصوری خاندان کے لوگوں سے میرے خصوصی تعلقات تھے شرعی وضع و لباس اور تبلیغ کا کام اور تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ دیندار تھے، ذی علم تھے اور صاحب ثروت بھی۔ اللہ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتیں عطا کی تھیں۔

ترکی اور جرمنی محاذ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ہندوستان پر حملہ ہو جائے۔ شیخ الہند کو یہ شبہ تھا کہ

شاید صرف امیر حبیب اللہ کے ذریعہ یہ کام نہ ہو سکے گا اس لیے قبائلیوں سے حملہ کرانے کے لیے بھی آپ نے یاغستان کا انقلابی مرکز بنایا تھا۔ خلیفۃ المسلمین نے جہاد کا حکم نامہ امیر حبیب اللہ کو بھیج دیا تھا اور ایک ترکی جرمن مشن بھی اس غرض کے لیے افغانستان آیا۔ ایبک لکھتے ہیں:۔

"لیکن افغانستانی حکومت سے جس میں انگریز پرستوں کا زور تھا یہ مشن اپنی تجویزیں نہ منوا سکا۔ امیر حبیب اللہ خاں ایک طرف اس مشن کے ساتھ تھے اور دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ وہ ایک طرف تو اس مشن سے کہتے رہے کہ اگر ترک جرمن افواج افغانی سرحد تک پہنچ جائیں تو فوراً انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں گے اور دوسری طرف مشن سے جو بات چیت ہوتی تھی اس کی انگریز حکومت کو خبر دیتے تھے"

امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد لارڈ کرزن وزیر خارجہ برطانیہ نے جو بیان دیا اس سے امیر حبیب اللہ کی اسلام سے غداری پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے:۔

"لارڈ کرزن نے ایک صاحب سے دوران گفتگو بیان کیا کہ گورنمنٹ کو امیر حبیب اللہ خاں کے انتقال کا حال معلوم کر کے سخت رنج و افسوس ہوا ہے۔ وہ گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ اور دوست تھے۔ دورانِ جنگ وہ مشکلات کے موقع پر ہمیشہ ایک کھرے دوست ثابت ہوئے۔"[۱]

ترکی اور جرمنی کا رخ ہندوستان کی طرف پھیرنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں وہ بھی چنداں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے ایک ترکی فوجی دستہ ایران کے راستہ افغانستان کو روانہ ہوا۔ اس مہم کے سردار رؤف بک تھے جن کا یہ کارنامہ کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں انھوں نے حمیدیہ کروزر HAMIDIACRUISAR کے یونانی بیڑوں پر کیسے جاں نثارانہ و بہادرانہ حملے کیے تھے ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن افسوس یہ مہم ناکام رہی اور ایران میں انگریزی اور روسی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے ترکی فوجی دستہ افغانی سرحد کی طرف نہ بڑھ سکا اور اس کو ترکی واپس جانا پڑا۔ ترکی جرمن مشن بھی ناکام 1916ء میں افغانستان سے واپس گیا۔ مولانا محمود حسن نے مکہ معظمہ سے بھی اپنی مجاہدانہ سرگرمی کو جاری رکھا چونکہ مولانا حکومتِ ہند سے خفیہ حجاز گئے تھے جو انگریزی کی جاسوسی قابلیت کے مقابلہ میں ایک بڑا کارنامہ تھا۔ حکومت ہند کو جیسے ہی مولانا کی روانگی کی خبر ہوئی بمبئی گرفتاری کے لیے تار دے دیا۔ مگر مولانا وہاں سے بھی نکل گئے۔ پھر جہاز کے کپتان کو تار دیا مگر کپتان کو تار اس وقت ملا جب آپ جزیرۂ سعد میں قرنطینہ کے لیے اتر چکے تھے۔ آپ وہاں اور لوگوں کے علاوہ انور پاشا اور جمال پاشا سے ملے جو مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے اور اس سے چند وثیقے تحریر کرائے جن میں قبائل کے باشندوں کو امداد

---

[۱] ہفتہ وار مشرق گورکھپور 13 مارچ 1919ء صفحہ 3

کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ مولانا نے مولانا ہادی حسن کی معرفت بڑی ہوشیاری سے یہ وثیقے مکتوب الیہم کو پہنچائے اور سرکاری خفیہ دھوکا کھا گئی۔ انور پاشا کی رائے تھی کہ مولانا خود قبائلیوں میں جائیں اور مولانا کی بھی یہی خواہش تھی مگر راستہ مسدود ہو گیا۔ تب آپ استنبول کی راہ سے جانے کے لیے تیار ہوئے اور طائف میں غالب پاشا سے ملے اور استنبول جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن اسی زمانہ میں شریف مکہ نے طائف پر چڑھائی کر دی اور ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ مولانا بہت مشکلات جھیل کر مکۂ معظمہ آئے یہاں پر مولانا سے ایک فتوٰی پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا جس میں ترک قوم کی تکفیر تھی۔ سلاطین آلِ عثمان کی خلافت سے انکار کیا گیا تھا اور شریف مکہ کی بغاوت کو حق بجانب اور مستحسن ٹھہرایا تھا۔ فتوٰی خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی نے باشارہ حکومت ہند حجاز آکر شریفی علماء کے دستخط سے بطور استفسار مرتب کرایا تھا۔ اور اس کا عنوان تھا "مکہ مکرمہ کے علماء کی جانب سے جو حرم شریف میں درس دیتے ہیں" مولانا نے اس فتوٰی پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

"اس طرح بارود ہندوستان کے اندر علمائے ربانی نے بھر دی تھی کہ ایک چنگاری بھی روشن ہوتی تو شعلے نکلتے مگر افسوس کہ اپنوں کی غداری سے اس کا وقت نہ آیا لیکن علمائے حق نے اپنا فرضِ خلافتِ مرکزیۂ الہیہ اور جدوجہدِ آزادی کا ادا کر دیا اور ان کے روشن کارناموں میں جو مولانا سید محمد میاں کی کتاب "علمائے حق" اور "علماء کا شاندار ماضی" سے واضح ہوں گے ایک کا اور اضافہ ہوا۔

## لکڑی کا صندوق

شیخ الہند نے غالب پاشا اور جمال پاشا کی تحریریں اور وثیقے ایک صندوق میں بند کیے اور وہ صندوق اس طرح کا تیار کرایا تھا کہ اس میں اندر خانے بنے ہوئے تھے جن میں وہ کاغذات رکھ دیئے گئے تھے اور وہ خانے باہر سے بالکل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس صندوق کو لے کر حاجی ہادی حسن صاحب رئیس خاں جہانپور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی روانہ ہوئے۔ جب وہ بمبئی پہنچے تو اس خیال سے کہ مولانا اس جہاز میں ہوں گے کثیر پولیس موجود تھی۔ مولانا کے ایک مخلص نے وہ صندوق لے لیا اور سامان کے ساتھ لے کر نکل گئے اور حسب پروگرام بذریعہ پارسل روانہ کر دیا۔ مولانا محمد نبی خاں صاحب خاں جہانپور نے ان تحریرات کو نکالا اور نقل کر رہے تھے کہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ انگریز کا محکمہ سراغ رسانی بھی کتنا ہوشیار تھا اس نے پتہ لگا لیا تھا کہ چند تحریرات لکڑی کی صندوق میں آئی ہیں۔ مولانا محمد نبی صاحب نے وہ کاغذات ایک صدری میں ٹھونس کر کھونٹی میں ٹانگ دیا۔ چھ گھنٹے کی تلاشی میں پولیس کی نظر اس صدری پر نہیں گئی اور وہ چیز بچ گئی۔ پولیس کو یہ بھی خبر مل گئی تھی کہ حاجی احمد مرزا صاحب فوٹوگرافر کے یہاں ان تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ پولیس نے وہاں بھی چھاپہ مارا لیکن وہاں

تحریریں ابھی نہیں پہنچی تھیں پولیس کے جانے کے بعد وہ تحریریں وہاں پہنچیں ان کے فوٹو لیے گئے اور جہاں جہاں جانا تھا بھیج دی گئیں۔

مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ فوٹو جلا دیئے گئے یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ تحریرات وثائق بہت کار آمد ثابت ہوتے اور حکومت ترکیہ اور اس کے خلفاء کی پوری طرح امداد کرتے لیکن جب امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار اتحادیوں کی مدد کو آگئے اور عربوں نے بغاوت کر دی تو پانسہ پلٹ گیا۔"

جہاز سے اترنے پر مولانا خلیل احمد اور مولانا ہادی حسن کو گرفتار کر لیا گیا اور طرح طرح سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن یہ مولانا کے مخلصین تھے سر ہتھیلی پر اور قدم دار پر رکھتے تھے۔ پولیس کچھ حاصل نہ کر سکی اور بعدۂ یہ چھوڑ دیئے گئے۔

مولانا مکہ معظمہ میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے۔ اس سے قبل ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی اور حکیم عبدالرزاق نے مولانا کے ایک عزیز کی معرفت ایک ہزار روپیہ مکہ مکرمہ میں مولانا کی خدمت کے لیے بھیجا۔ ان سب باتوں سے اس تحریک کی ہمہ گیری معلوم ہوگی جو مولانا نے چلائی تھی۔

## ریشمی رومال

ریشمی رومال کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ رومال حضرت مولانا محمود حسن صاحب نے اپنی انقلابی جماعت کے مخلصین کارکنوں کو دیئے تھے۔ رومال ایسے بنے تھے کہ اگر دو ایک تار نکال دیے جائیں تو مولانا محمود حسن صاحب کا نام ابھر آتا تھا۔ یہ جماعت کے اندر بطور نشان کے تھا تاکہ ایک دوسرے پر بھروسہ کیا جا سکے اور یہ ان مخصوصین کو دیے گئے تھے جو انگریز کے قتل پر مامور تھے اور ایک خاص دن اور وقت مقرر تھا کہ اس درمیان میں راز فاش ہوگیا وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ کہا گیا بہت سی باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے لیکن ریشمی رومال کی تاریخی حیثیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا محمود حسن کی اسکیم کے ماتحت مولانا عبیداللہ سندھی کابل میں مقیم تھے اور قبائل کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اکسا رہے تھے اور ہندوستان کی انقلابی جماعتوں سے بھی نامہ و پیام رکھتے تھے۔ جب انور پاشا اور غالب پاشا کے خطوط لکڑی کے صندوق سے بخریت مل گئے اور قبائلیوں اور انقلابی جماعتوں اور مسلمانانِ ہند میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے وہ تقسیم ہو گئے تو ان کارروائیوں کی اطلاع مولانا محمود حسن صاحب کو حجاز میں دینا ضروری تھا تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ زمین تیار

ہے۔ اس کے علاوہ کابل میں ایک عارضی حکومت بھی قائم تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ اور دوسرے حسبِ معمول اراکین تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم ہندوستان کے صحیح نمائندے ہیں اور ہندوستان برطانیہ سے باغی ہو چکا ہے۔ اور اگر ہندوستان پر حملہ ہو تو اس کی کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔ ان کا مقصد مختلف حکومتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے ان کو انگریزوں کے خلاف اپنا اتحادی بنانا تھا چنانچہ بڑے آب و تاب سے راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر متھرا سنگھ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ زارِ روس کے پاس وفد بھیجے گئے۔ اسی طرح چین و برما و جاپان و فرانس اور امریکہ بھی مشن روانہ کیے گئے جو اس سے بڑا مشکل کام تھا کہ حکومت کے موقتہ ہند بالکل تہی دست تھی۔ ان باتوں کی بھی مختصر اً حضرت مولانا کو اطلاع دینی تھی۔

افغانستان سے حجاز کا راستہ بالکل بند تھا۔ اطلاع دینے کے لیے سوائے ہندوستان کے اور کوئی شکل نہ تھی چنانچہ دو خطوط اخطِ گلزار میں ریشمی کپڑے پر کابل کی کارروائیاں لکھ کر مولانا عبید اللہ صاحب نے شیخ عبدالحق نامی ایک نومسلم کو دیے جو اللہ نواز خاں کے باپ خان بہادر رب نواز خاں کا پروردہ تھا۔ کہ وہ لے جا کر شیخ عبدالرحیم کو سندھ میں دے دے۔ شیخ عبدالرحیم کو اسی طرح کے تیسرے خط میں ہدایت تھی کہ وہ کسی قابلِ اعتماد آدمی کے ذریعہ شیخ الہند کے پاس یہ رومال بھجوا دیں اور اگر کوئی نہ ملے تو خود حج کے بہانے چلے جائیں۔ اسی کا نام ریشمی رومال یا ریشمی چٹھی ہے۔

اللہ نواز خاں معتبر آدمی مانا جاتا تھا لیکن عبدالحق نے رومال یا چٹھی خان بہادر رب نواز خاں کو دے دی اور انھوں نے یہ خط یا رومال سر مائیکل اوڈائر گورنر پنجاب کے حوالے کر کے انعامات حاصل کیے اور اسکیم ناکامیاب ہو گئی۔ اس سلسلہ کی مزید بحث ہمارے مبحث سے خارج ہے۔

میں نے ایک پیچیدہ معاملہ کو جس میں بہت سے دماغ الجھن میں مبتلا ہیں صاف اور سادہ عبارت میں بلا تفصیلات کا ذکر کیے لکھ دیا۔ البتہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کسی نہج پر ریشمی رومالوں کا استعمال کراتے تھے اور یہیں سے مولانا عبید اللہ صاحب نے اشارہ لیا ہوگا۔

# حکومت برطانیہ کے وعدے

2 نومبر 1914ء کو حکومت برطانیہ نے ایک سرکاری اعلان شائع کیا جس کی اشاعت اعلانِ جنگ کے ساتھ ہر قصبہ و قریہ میں کی گئی۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہم یا ہمارے اتحادی اس جنگ میں کوئی

ایسی بات نہ کریں گے جس سے ان کے مذہبی جذبات وخیالات کو ٹھیس لگے۔ اسلام کے مقدس مقامات بے حرمتی سے محفوظ رہیں گے اور ان کی عزت وحرمت قائم رکھنے کی ہر ممکن احتیاط برتی جائے گی۔ اسلام کے مقدس دارالخلافہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ ہم صرف ترکی وزراء سے لڑ رہے ہیں جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہے ہیں نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے۔ برٹش گورنمنٹ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اتحادیوں کی طرف سے بھی ان مواعید کی ذمہ داری لیتی ہے۔

یہ خلیفۃ المسلمین کے اعلانِ جہاد کا جواب تھا۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور خاص کر فوج کے سپاہی اور افسران اس کے شکار ہو گئے اور یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک ملکی جنگ ہے۔

12 جنوری 1915ء کو لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے لیجسلیٹو کونسل میں اقرار فرمایا۔

"اتحادیوں نے جزیرۃ العرب اور عراق کے اماکنِ مقدسہ کو حملہ سے محفوظ رکھنے کے متعلق اعلان کیا ہے اور برٹش گورنمنٹ نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو بیرونی حملہ آوروں کے خلاف ان کی حفاظت کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ گو واقعات کا رخ کتنا ہی بدلے مگر اس میں شک نہ ہوگا کہ مقاماتِ مقدسہ کے معاملات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی اور اسلام دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوگا۔"

اسی طرح لارڈ کرو نے دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں 20 اپریل 1915ء کو حسبِ ذیل تقریر کی:۔

"مجھ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں مارکوئس آف کریو کی اس رائے سے متفق ہوں کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود ہی طے کرنا چاہیے لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ خلیفہ کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا مسلمان ہو جو کسی یورپین طاقت کے زیر اثر نہ ہو۔"

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے 5 جنوری 1918ء کو ایک تقریر میں فرمایا:۔

"ہم اس غرض سے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالسلطنت یا ایشیائے کوچک کے زرخیز ممالک سے جہاں ترکی النسل لوگ آباد ہیں، محروم کر دیں۔"

یہ سحر طرازیاں اتنی جادوگری تو کر ہی رہی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کے اعلانِ جہاد سے جو جوش و خروش پیدا ہونے والا تھا وہ مدھم پڑ گیا۔ مسلمان سپاہی اور فوجی افسران مارچ کو گئے جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی تھی۔ ہندوستان میں صرف دس ہزار فوج رہ گئی تھی۔ اگر افغانستان اور قبائلیوں کا حملہ اس وقت ہندوستان

پر ہو جاتا تو میسو پوٹامیہ سے ہندوستانی فوج کو واپس بلانا پڑتا اور تب تاریخ کا رخ بدل جاتا۔ اس اعلان سے عام طور پر لوگوں کی بیزاری میں بھی کمی آگئی۔ لیکن ایک طبقہ ان دانایان راز کا بھی تھا جو ان طفل تسلیوں میں آنے والا نہ تھا۔ اسلامی انقلابی جماعتیں اپنا کام کر رہی تھیں اور حکومت کا محکمہ سراغرسانی جس میں زیادہ تر مسلمان تھے سرگرم کار تھا جو نوجوان ہندوستان سے بھاگ کر اور چھپ کر افغانستان کا رخ کرتے تھے ان کے بارے میں حکومت کا آرڈر تھا کہ اگر وہ پکڑے جائیں تو جو پہلا درخت نظر آئے اسی پر انہیں پھانسی دے کر لٹکا دیا جائے۔ لیکن فدا کاران ملت رات بھر چلتے دن کو چھپتے، فاقے کرتے، دریاؤں کو تیرتے بھاگے جا رہے ہیں۔ ان مجنونانہ کوششوں سے دلوں کے اندرونی جذبات کی گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

## مولانا محمد علی کی نظر بندی

دانشوران ہند بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے چنانچہ ترکی کے اعلان جنگ کے بعد ہی مولانا محمد علی نے اپنے شہرۂ آفاق انگریزی اخبار کامریڈ میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "چوائس آف دی ٹرکس" یعنی ترکوں کا انتخاب۔ اس میں ثابت کیا گیا تھا کہ ترک اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دینے میں معذور تھے۔ مولانا محمد علی اس وقت مسٹر محمد علی تھے اور ان کا ماضی حکومت سے تعاون کا تھا۔ لیکن ان میں اسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس نازک وقت پر ان کے جذبات و معتقدات ان کے ماضی پر غالب آئے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی اپنی تصنیف "محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "کامریڈ کی تو دھوم مچی ہوئی تھی، ہمدرد نکلا تو اس کی بھی دھوم مچ گئی۔ بڑے چھوٹے سب اس کے گرویدہ لیکن محمد علی کا قدم اب روز بروز اسلامیت کی طرف اور زیادہ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں شہر کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا اور اس پر جب مسلمانوں نے اپنے پرجوش احتجاج کا مظاہرہ کیا تو ان کے مجمع پر گولیاں تک چلائی گئیں۔ بڑا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔ کامریڈ نے اپنے احتجاجی اور تنقیدی مضامین میں کلکٹر تو الگ رہے خود صوبہ کے حاکم اعلیٰ سر جمس مسٹن کی بھی خبر لے ڈالی۔ حکام یوں بھی اس وقت مسلمانوں کی زبان سے کسی کڑی نکتہ چینی کے عادی نہ تھے اور پھر سر جیمس مسٹن تو محمد علی کو اپنا پرانا "یار وفادار" سمجھ رہے تھے۔ قدرتاً بہت بگڑے۔ ادھر جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکی کی ہمدردی میں بھی محمد علی پیش پیش تھے

اور اب چہرے پر داڑھی بھی تھی۔

یہ توسب تھا ہی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں یورپ کی جنگِ عظیم میں ٹرکی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے برطانیہ کے مقابل آگیا اور کامریڈ نے ایک بڑے لمبے چوڑے زوردار مقالہ میں چوائس آف دی ٹرکس (CHOICE OF THE TURKS ) کے زیرِ عنوان جو ٹائمس (لندن) کے مقالہ کے جواب میں تھا، لکھا۔ انگریز اب کہیے اور کب تک درگزر سے کام لیتے۔ کامریڈ فوراً بند اور محمد علی نظربند ہوگئے۔ محمد علی جو ابھی سال دو سال قبل تک بڑے بڑے حکام کی آنکھوں کے تارے اور منظورِ نظر بنے ہوئے تھے۔"

مولانا محمد علی کے سب سے بڑے مداح اور ہندوستان کے عظیم انشاپرداز و دانشور کے قلم سے مندرجہ بالا اقتباس نے مجھے اس بات کی تفصیل سے بے نیاز کر دیا کہ محمد علی کا ماضی حکومت برطانیہ سے وفادارانہ تھا تاکہ یہ ثابت ہو کہ خلافتِ مقدسہ کے جذبے نے کتنے انقلابات پیدا کیے۔

مولانا محمد علی پہلے رامپور، پھر مہرولی پھر دہلی میں نظربند کیے گئے۔ وہاں سے لینڈاون پھر چھندواڑہ نقل کر دیے گئے اور اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا تو بیتول جیل خانہ میں قید کر دیئے گئے۔

حکومت شاید یہ سمجھتی تھی کہ مولانا محمد علی ایک ہی وار میں زمین دوز ہو جائیں گے اور معافیوں اور ضمانتوں اور آئندہ کے لیے توبۃ النصوح پر عمل پیرا ہوں گے لیکن نظربندی کا حکم مولانا محمد علی نے کس طرح نا اسے قاضی عبدالغفار صاحب کی زبان سے سنیے جو اس زمانہ کے دیگر فضلائے عصر کی طرح محمد علی کے گرد جمع گئے تھے اور ہمدرد کے رکنِ ادارت تھے:۔

"خوش وقتی کا یہ عالم تھا کہ جس وقت نظربندی کا حکم آیا ہے میں دفتر میں نہ تھا لیکن بلایا گیا اور جب محمد علی کے کمرے کے پاس پہنچا تو میں نے ایک شورِ مبارک باد سنا اور یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی بہت اچھی خبر کہیں سے آئی ہے لیکن دیکھتا ہوں کہ کمرے کے وسط میں میز پر احکامِ نظربندی کھلے رکھے ہیں اور ایک غلغلہ تہنیت برپا ہے جس میں دونوں بھائیوں کی آواز جو ایک دوسرے کو ہنس ہنس کر مبارک باد دے رہے ہیں سب سے زیادہ بلند ہے۔"

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مولانا محمد علی کی گرفتاری نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر رکھا تھا اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ نار وائسرائے وزیرِ ہند کو بھیجے گئے جن میں نظربندی منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کا انجام اگر کچھ ہوا تو صرف یہ ک افسر ایک تحریر لے کر آیا اور مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو ایک ساتھ نظربند تھے) سے کہا گیا کہ

آپ اس پر دستخط کردیں تو رہا کر دیے جائیں۔ اس تحریر میں صرف برطانیہ کی وفاداری کا اعلان تھا۔ علی برادران نے کہا کہ اگر اس میں اتنا اور اضافہ کر دیا جائے تو ہم دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں "بشرطیکہ یہ وفاداری احکام مذہب اسلام کی پابندی میں حائل نہ ہو" کیونکہ ہماری اوّل وفاداری مذہب اسلام ہے۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ علی برادران کی والدہ جو بعد کو "بی اماں" کے نام سے مشہور ہوئیں نکل کر آگئیں کہ ہمارے لڑکے کبھی حکومت سے باغی نہ تھے لیکن اسلامی فریضہ اوّلیت رکھتا ہے اور اگر وہ اس بلا شرط معاہدہ پر دستخط کر دیں گے تو اللہ تعالیٰ میرے جھرّیوں بھرے ہاتھوں میں طاقت دے گا کہ میں ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں۔ محمد علی پہلے ہی چوائس آف دی ٹرکس لکھ کر اور نظر بندی کو خوشی خوشی قبول کر کے جس میں ایک بڑی قربانی ان کو دینی پڑی تھی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہیرو بن چکے تھے۔ اس انکار نے ان کی مقبولیت و شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

## مولانا ابوالکلام آزاد

ادھر ایک اور ستارہ آسمان سیاست پر طلوع ہو چکا تھا جس کی تیز روشنی تمام دیگر روشنیوں کے بالمقابل آگئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کم عمری میں اپنے علم و فضیلت کی وجہ سے اکابرین کی صف میں آگئے ۱۹۱۲ء میں آپ کے اخبار الہلال نے تمام ہندوستان میں اپنا ڈنکا بجا دیا۔ الہلال آزادی پسند اور اسلام کا مبلغ تھا۔ مولانا اپنی خود نوشت سوانح عمری "انڈیا ونس فریڈم" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"الہلال کا پہلا پرچہ جون ۱۹۱۲ء میں نکلا۔ الہلال نے اردو صحافت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور بہت جلد اس نے بے مثال مقبولیت حاصل کر لی۔ پبلک صرف اس کی خوب صورت کتابت و طباعت ہی سے اس کی جانب راغب نہیں ہوئی بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات سے کہ اس نے مستحکم وطن پروری کی تعلیم دی اور عوام میں ایک انقلابی جذبہ پیدا ہو گیا۔ الہلال کا مطالبہ اتنا زیادہ تھا کہ صرف تین ماہ کے اندر اندر تمام پرانے پرچوں کو پھر سے چھاپنا پڑا کیونکہ ہر نیا خریدار شروع سے کل پرچے طلب کرتا تھا۔

"مسلم سیاست کی قیادت اس زمانہ میں علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ممبران اپنے آپ کو سرسید کی پالیسیوں کے امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی اصول یہ تھا کہ مسلمان تاج برطانیہ کے وفادار رہیں اور تحریک آزادی سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھیں۔ جب الہلال نے اس سے مختلف آواز بلند کی اور اس کی مقبولیت اور اس کی اشاعت روز افزوں ترقی کرنے لگی تو ان لوگوں نے اپنی قیادت کو خطرے میں محسوس کیا۔ اس لیے الہلال کی مخالفت شروع

کردی۔ حتیٰ کہ اس کے مدیر مسئول (مولانا آزاد خود) کو قتل کر دینے کی دھمکی دی لیکن جس قدر یہ قیادت الہلال کی مخالفت کرتی تھی اسی قدر اس کی مقبولیت بڑھتی تھی۔ دو سال کے اندر الہلال کی اشاعت 26 ہزار ہو گئی۔ یہ تعداد اردو صحافت میں اس وقت تک کبھی سنی نہیں گئی تھی۔"

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ مولانا کو بہت سے خطوط ملے کہ اگر آپ لکھنؤ آئے تو جان سے مار ڈالے جائیں گے۔ مولانا لکھنؤ آئے اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "میں تنہا چار باغ اسٹیشن پر اترا اور حملہ آوروں کا انتظار کرتا رہا مگر کوئی نظر نہیں آیا افسوس ہماری قوم میں اب ایسا بھی کوئی نہیں جو کسی کی آبرو رکھے۔"

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ الہلال 1912ء میں نکلا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں نے خلافت مرکزیہ اسلامیہ کو نوجوان ترکوں کے عزم و ارادے، ہمت و شجاعت سے سنبھلتے دیکھنے کا خواب دیکھا تھا اور جنگ بلقان سے وہ سخت اضطراب و تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے دل کی آواز کو اس شعر میں بھر دیا ہے ؎

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے　　اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

الہلال نے اپنے ادعا و تحکم پر جوشِ اظہار بیان اور ایک نئی جاذب اسلوبِ تحریر کے ذریعہ ان جذبات کو جو دلوں کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے جرأت و بے باکی کی پوری طاقت سے ترجمانی کر کے حق قیادت ادا کیا اور ان کا مقبول ہونا لازمی تھا کیونکہ یہ تو انہی کے دل کی آواز تھی۔ علی گڑھ تحریک کے قائدین کے پاس اسلام کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر نہ تھی۔ اس کے علاوہ الہلال کا لب و لہجہ خصوصیت سے جاذب تھا۔

"ہیں وہ صور کہاں سے لاؤں جو خفتگانِ خوابِ غفلت کو بیدار کر دے۔"

الہلال واقعی صور اسرافیل تھا جس نے موت کی نیند سونے والوں کو بھی چونکا دیا۔ انگریز الہلال کو ایک باغی رسالہ تصور کرتا تھا اور وہ اس میں حق بجانب تھا چنانچہ اس نے دس ہزار کی ضمانت مانگی۔ جس وقت یہ ضمانت مانگی گئی ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا۔ تار پر تار مولانا آزاد کو روپے کے لیے ملتے تھے۔ اگر وہ لینے پر راضی ہوتے تو لاکھوں روپیہ جمع ہو جاتا مگر مولانا آزاد نے سب کو جواب دے دیا اور الہلال میں لکھا کہ الہلال ان کا اخبار ہے اس کا منافع ان کو ملتا ہے تو اس کا خسارہ بھی انھیں کو برداشت کرنا چاہیے ضمانت دی گئی اور جلد ہی ضبط کر لی گئی۔ دوبارہ بیس ہزار کی ضمانت طلب ہوئی اور وہ بھی دی گئی اور

وہ بھی بعدہٗ ضبط کرلی گئی۔ اور یہ کل روپیہ مولانا نے دیا۔

مولانا آزاد پہلے ایک انقلابی جماعت کے رکن تھے۔ انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:-

"ان ایام میں انقلابی گروہ کے اندر صرف متوسط طبقہ کے ہندو تھے۔ درحقیقت کل انقلابی جماعتیں مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ حکومتِ برطانیہ مسلمانوں کو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے خلاف استعمال کررہی ہے اور مسلمان گورنمنٹ کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہیں۔ مشرقی بنگال ایک علیحدہ صوبہ بن گیا تھا۔ اور اس کے لیفٹیننٹ گورنر بمفلیڈ فلر نے اعلانیہ کہا تھا کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو اپنی محبوب زوجہ تصوّر کرتی ہے۔ انقلابیوں کا خیال تھا کہ مسلمان آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور دوسری رکاوٹوں کی طرح اس رکاوٹ کو بھی دور کرنا ہوگا۔"

مولانا آزاد حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے۔ ان پر ہر وقت ایک سی آئی ڈی لگا رہتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا جس کو ایک مرتبہ دیکھ لیں پھر کبھی دیکھیں خواہ کتنی مدت بعد فوراً پہچان لیتے تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ذکرِ آزاد میں لکھتے ہیں کہ ان کو آٹھ سال بعد دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ میرے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا مجھے اول مرتبہ بریڈلا ہال لاہور میں دیکھا اور پھر ۴ـــ5 سال کے بعد جب میں اول مرتبہ دلی اسٹیشن پر محمد علی قصوری کے ساتھ ملا تو فوراً کہا "کہیے عدیل صاحب مزاج تو اچھے ہیں"۔ اسی حافظ کا نتیجہ تھا کہ وہ کتابوں کی عبارتیں، صفحہ وسطر کے حوالے بلا کتاب سامنے رکھے نقل کردیتے تھے اور کبھی ایک شوشہ بھی غلط نہیں ہوا۔ چنانچہ روایت ہے کہ اسی حافظ کی وجہ سے اکثر یہ ہوتا تھا کہ مولانا ٹرین میں جارہے ہیں سخت سردی ہے۔ ایک فقیر کانپتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے اللہ کی راہ پر فقیر کو ایک پیسہ دے دیا جائے تو فوراً فرماتے ہیں "خان بہادر فلاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کیوں پریشان ہورہے ہیں، آئیے چائے پیجیے"۔ وہ رخصت ہوئے تو دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر ایک اور آیا اور اس نے کہا بھگوان کے نام پر ایک پیسہ دے دیا جائے۔ پھر مولانا بولے "رائے بہادر فلاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی تشریف لائیے بیٹھیے کیوں پریشان ہوتے ہیں"۔

الہلال کے مضامین اور مولانا کی انقلابی روش کا ایسا غلغلہ تھا کہ ضلع بستی میں ایک انگریز کلکٹر آر پی ڈیوہرسٹ تھا جو مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا شاگرد اور عربی و فارسی کا ایک بڑا عالم تھا، وہ یہیں سے "الہلال" کا ترجمہ انگریزی میں کرکے انڈیا گورنمنٹ کو بھیجتا تھا۔ ڈیوہرسٹ کے زمانے کے عجیب واقعات لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ کسی وکیل کو انگریزی میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا بلکہ اردو میں بحث کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ ایک صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا ان کا کیا نام ہے انھوں نے کہا نصرت علی اس نے فوراً درست کیا

نصرت علی۔ انھوں نے کہا غلطی ہوئی۔ پھر اس نے کہا غلطی ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں لڑائی شروع ہونے کے بعد گورنمنٹ نے پریس ایکٹ کا استعمال کر کے الہلال پریس کو ۱۹۱۵ء میں ضبط کر لیا مگر مولانا کی جانبازی میں فرق نہ آیا اور نہ ان کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی۔ اور مولانا نے پانچ ماہ بعد ایک دوسرا پریس "البلاغ" قائم کیا اور "الہلال" کو اسی پریس سے پھر جاری کیا۔ الہلال کلکتہ سے نکلتا تھا اور وہیں الہلال پریس تھا۔ اور وہیں البلاغ پریس قائم ہوا تھا۔ حکومت کسی حال میں الہلال کو بزمانہ جنگ جاری رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اور مولانا کے استقامت اور قوت مقابلہ سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب صرف پریس ایکٹ سے کام نہ چلے گا اس لیے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشن کا استعمال کر کے مولانا کو کلکتہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ پنجاب، دلّی، یوپی اور بمبئی کی حکومتیں اسی ریگولیشن کے ماتحت ان صوبوں میں مولانا کا داخلہ پہلے ہی ممنوع قرار دے چکی تھیں۔ صرف بہار باقی تھا لہٰذا مولانا رانچی چلے گئے چھ ماہ بعد رانچی میں نظر بند کر دیے گئے اور وہیں 31 دسمبر ۱۹۱۹ء تک نظر بند رہے۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو شاہی فرمان کے تحت مولانا دوسرے قیدیوں اور نظر بند اشخاص کے ساتھ رہا ہوئے۔ یہ ایک دانشور مرد مجاہد اور اسلامی علوم کے ایک عظیم ماہر کی سرفروشانہ جدوجہد کے زریں کارناموں کا ایک مختصر باب ہے۔

مولانا نے ایک جماعت "حزب اللہ" بھی بنائی تھی۔ مولانا کا منشا یہ تھا کہ مذہب کے راستے مسلمانوں کو سیاست میں لایا جائے۔ اس طرح کی ایک کوشش مولانا نے اور کی جس کا ذکر بعد کو آئے گا۔ جماعت حزب اللہ نے صرف ابتدائی منزلیں طے کی تھیں۔ دارو گیر کا وہ سلسلہ جاری ہوا کہ حزب اللہ کا کوئی عملی ریکارڈ نہ بن سکا۔ میں نے لکھا ہے کہ مولانا کا خیال تھا کہ مذہب کے راستے مسلمانوں کو سیاست میں لایا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سیاست مولانا کے نزدیک مذہب کا ایک جزو تھی اور ان کا عقیدہ شروع سے برطانیہ کی غلامی سے نکل کر ایک متحدہ قومیت کی مشترکہ جمہوریت ہندوستان میں قائم کرنا تھا۔ اسی لیے وہ نہایت دلیری اور اپنے روایتی حسین و پرجوش انداز سخن کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی مخالفت کرتے تھے۔ مولانا ایک عشر و قیع کے لیے بھی علی گڑھ تحریک کے موافق نہ ہو سکے اور پوری سرگرمی سے اس کے نقائص اور مہلک اثرات مسلمانوں پر ظاہر کرتے تھے۔

## عارضی صلح یا التوائے جنگ

آپ نے مدبرین برطانیہ اور حکومت برطانیہ کے اعلانات ملاحظہ کیے اب دیکھیے کہ انھوں نے جنگ میں کامیابی کے بعد کن شرائط کو عائد و نافذ کیا۔

30 اکتوبر 1918ء کو رؤف بے وزیر بحریہ اور برطانوی امیر البحر کالتھراپ کے دستخطوں سے حسب ذیل شرائط طے ہوئے:۔

(1) درّہ دانیال اور باسفورس اور ان کے علاوہ وہ قلعے جو ان پر ہیں سب کو خالی کر کے اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(2) کل فوج غیر مسلح کر دی جائے۔

(3) تمام جہازات اتحادیوں کے حوالے کر دیے جائیں۔

(4) اتحادیوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ فوجی نقطۂ نظر سے جو بھی مقام وہ اہم سمجھیں اس پر قبضہ کریں۔

(5) ترکی ریلوں کا انتظام اتحادیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

(6) تمام ترکی بندرگاہ اتحادیوں کے لیے کھول دیے جائیں گے۔

(7) تمام تار کی لائنیں اتحادیوں کے اقتدار میں دے دی جائیں گی۔

(8) ترکی افواج کے جو لوگ گرفتار ہو گئے ہیں وہ سب قید رہیں گے۔

(9) ترکی افواج جو حجاز اور طرابلس میں ہیں ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا جائے گا۔

(10) اتحادی فوجوں کے جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں وہ فوراً رہا کر دیے جائیں گے۔

ایسی ذلّت خیز شرائط شاید ہی کسی فاتح نے کسی مفتوح پر عائد کی ہوں۔ جرمنی سے جن شرائط پر التوائے جنگ کا مسودہ تیار کیا گیا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔ اب کل اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے کر قسطنطنیہ پر انگریزوں نے قبضہ کر کے اور ترکانِ احرار کے سربرآوردہ لوگوں کی تلاش ہوئی کہ ملیں تو فوراً تہ تیغ کر دیے جائیں۔ وزیر اعظم طلعت پاشا، وزیر حرب انور پاشا، وزیر بحریہ جمال پاشا وغیرہ یورپ بھاگ گئے اور روپوش ہو گئے۔ ان کی عجیب داستان ہے کہ کس طرح وہ لوگ اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے بھیس بدلتے اور مختلف قسم کی تدبیریں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین عبد الحمید خان نے طوقِ غلامی اپنے گلے میں لٹکا لیا اور یہ آس لگائی کہ اس کی پنشن مقرر ہو جائے گی اور وہ زیر سایۂ دولتِ برطانیہ آرام و آسائش کی زندگی گزاریں گے۔ مفتیِ اعظم اور علمائے اسلام بھی احساس کمتری کے شکار ہو گئے۔

عارضی صلح کی شرائط سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اب ان کو اندازہ ہوا کہ مستقل صلح جب ہوگی تو نہ ترکی باقی رہے گا نہ خلیفۃ المسلمین نہ اماکنِ مقدسہ نہ فلسطین نہ بیت المقدس۔ بدحواسی اور بے چارگی میں مسلمانوں نے جلسے اور تجاویز کا انبار لگا دیا۔ غرض یہ تھی کہ حکومت برطانیہ دب کر وہ سب کچھ نہ کرے جس کا اندیشہ تھا۔

# راہِ عمل کی تلاش

30 اکتوبر 1918ء کو ترکی نے التوائے جنگ کے صلح نامہ پر دستخط کیے اور مئی 1920ء میں سیورے کے مقام پر اتحادیوں نے شرائط صلح ترکی پر نافذ کیے۔ یہ وقفہ انتہائی پر آشوب تھا، خیالات میں ہیجان تھا۔ راہِ عمل کی تلاش تھی۔ ایک طرف حکومتِ برطانیہ کے ذمّہ داروں نے مسلمانانِ عالم سے خلافت مرکزیہ اسلامیہ اور اماکنِ مقدسّہ کے قیام کا وعدہ کر رکھا تھا۔ دوسری جانب صیہونی جماعت سے ان کو فلسطین میں وطن دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ان دو متضاد وعدوں کا نبھانا آسان نہ تھا۔ اس لیے ایک رائل کمیشن مقرر کیا گیا۔ رائل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ان دونوں کا تذکرہ کر کے لکھا کہ ہم نے دو متضاد وعدے کیے اور ہم کو ایک وعدے سے منحرف ہونے اور وعدہ خلافی کے مجرم بننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ دوسری طرف اس نے لڑائی میں شرکت کے بدلے کانگریس سے ہندوستان کو اصلاحات دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس کی ایک اعلیٰ طاقتی کمیٹی لندن میں جانچ کر رہی تھی۔ ہندوستان کو ذمّہ دار حکومت دینے کا وعدہ مسٹر مانٹیگو نے بذریعہ اعلانِ شاہی مورخہ 18 اگست 1917ء کو کیا تھا اور چند ماہ بعد خود ہندوستان آکر وائسرائے کے ساتھ تمام ہندوستان کا دورہ کیا تھا تاکہ پبلک کے خیالات معلوم ہوں معتدلین انگلستان وفدے کر گئے اور اپنے نقطۂ نگاہ کو پیش کر رہے تھے۔ اس میں یہ بھی سوال تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کیا ہوں۔ کیا سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے کیا سرحد کو بھی اصلاحات دیے جائیں؟

1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ ہو کر ایک باہمی معاہدہ مرتب ہوا تھا جس کا نام تاریخ میں "میثاق لکھنؤ" ہے۔ اس میں حسب ذیل باتیں طے ہوئی تھیں:-

(1) صوبائی کونسل کے متعلق طے ہوا تھا کہ بڑے صوبوں میں 125 ممبروں کی اور چھوٹے صوبوں میں 50 سے 75 ممبروں تک کی کونسلیں ہوں۔

(2) 4/5 حصہ ممبروں کا انتخاب کے ذریعہ ہو۔ حق رائے دہندگی میں توسیع ہو۔ ہر اقلیت کے انتخاب کے لیے معقول انتظام ہو 1/5 کے نامزد کرنے کا اختیار گورنر کو ہو۔

(3) مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعہ ہو جس کی صوبہ وار تفصیل یہ تھی۔

| نام صوبہ | فیصد آبادی | کونسل میں مسلمان ممبروں کی فیصدی تعداد |
|---|---|---|
| پنجاب | 55 | 50 |
| بنگال | 53 | 40 |
| یو پی | 14 | 30 |
| بمبئی (سندھ) | 20 | 33 |
| بہار واڑیسہ | 10 | 25 |
| صوبہ متوسط (سی پی) | 4 | 15 |
| مدراس | 7 | 15 |

جس وقت یہ میثاق ملی مرتب ہوا تو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نظربند تھے مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس میثاق سے نہ مسلمان مطمئن ہوئے نہ ہندو۔ دونوں کو اعتراض یہ تھا کہ اکثریتی صوبوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور ہندو اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کو ناپسند کرتے تھے۔ مورخین اور ماہرین سیاست کا فیصلہ ہے کہ کانگریس نے اس پر رضامندی دے کر بھیانک غلطی کی کیونکہ اس میں جداگانہ انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر آئندہ پاکستان کا محل تعمیر ہوا۔ یہ میثاق بھی راستہ کا ایک روڑا تھا۔ اس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان کی نظر حصولِ آزادی سے ہٹ کر حصے بخرے پر لگ جاتی تھی اور اختلاف رونما ہوتا تھا۔

مسلمانانِ ہند کے سامنے جزیرۃ العرب فلسطین اور بیت المقدس ہی کے مسائل نہ تھے۔ خلافتِ مرکزیۂ اسلامیہ ترکی کا قیام مذہبی حیثیت سے اوّلیت رکھتا تھا اور وہ مدینہ اور بیت المقدس کو خلیفہ کے اقتدار سے باہر دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انگریز نے ہندوستان کو اصلاحات دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ تو لندن میں زیرِ تحقیقات تھا اور یہاں 18 جنوری 1919ء کو رولٹ بل شائع ہوا، جس پر رولٹ کمیٹی 1917ء سے کام کر رہی تھی اور جس کے مسودہ سے سب کو اختلاف تھا۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ تمام ہندستان میں آگ لگ گئی۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ سارا غوغا بیکار ہے اب رولٹ ایکٹ بن کر رہے گا بجز گنے چنے کاسہ لیسانِ حکومت کے پوری قوم نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ کل سیاسی جماعتیں اور لیڈران ایک رائے ہو گئے۔ اس بل کا منشا ہندوستانیوں کو ہر قسم کی آزادی سے محروم کرنا اور انھیں غلام بنانا تھا۔ لوگ سوچتے تھے کہاں شاہی اعلان 1917ء اور کہاں یہ بل؟

مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے کا نادر موقع پایا اور ہندو بھائیوں سے مل گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کا دل افروز نظارہ سامنے ناچنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ہندوستان کوہ آتش فشاں بن گیا جو آگ اگل رہا تھا۔ رولٹ بل پر تو زبردست شورش آئینی طرز کی ہو رہی تھی لیکن مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آیا تھا چنانچہ جگہ جگہ علماء کے جلسے ہو رہے تھے۔ ہر صوبہ میں علماء کی کانفرنسیں ہوئیں۔ علمائے کرام سیاسی جماعتوں میں بھی شریک ہونے لگے جو ایک نئی بات تھی۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۱۹ء میں علماء بنگال کا دوسرا سالانہ جلسہ مولانا آزاد سبحانی صاحب پرنسپل مدرسہ الٰہیات کانپور کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں علاوہ دیگر اکابرین کے مولانا عبد الباری صاحب نے بھی شرکت فرمائی جو اس وقت صدر علمائے ہند تصور کیے جاتے تھے۔ اسی سال علمائے کرام نے مسلم لیگ کے جلسہ میں بھی شرکت کی جس کے لیے مسلم لیگ نے اپنی ایک تجویز میں علماء کرام کا شکریہ ادا کیا۔ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے آمادہ تھا۔ کوئی شہر یا قریہ ایسا نہ تھا جہاں جلسے نہ ہوئے ہوں اور مسلمانوں نے اپنے اضطراب کا اظہار نہ کیا ہو۔

## مسز بسنٹ اور ہوم رول

یکم ستمبر ۱۹۱۶ء سے مسز اینی بسنٹ (جو ایک انگریز خاتون ہندوستان کی حمایت کی دعویدار تھیں) کی قیادت میں ہوم رول لیگ نے اپنا کام شروع کیا۔ اس کا مقصد بھی آئینی ایجی ٹیشن سے ہندوستان کے لیے حکومتِ خود اختیاری حاصل کرنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میدانِ جنگ میں ہندوستان نے انگریز کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ اس کا حق ہے اور انصاف کا تقاضہ ہے لیکن مسز بسنٹ کی تحریک کا منشاء اب معلوم ہوتا ہے کہ آزادیِ کامل سے محض توجہ ہٹانا تھا۔ وہ ہندو مذہب سے بھی ہمدردی کا دعویٰ کرتی تھیں۔ لیکن جب ہندوستان نے واقعی انگڑائی لی اور منزلِ آزادی کی جانب قدم اٹھایا تو وہ مخالف ہو گئیں۔ چنانچہ جب مہاتما گاندھی کی تحریکِ ترکِ موالات کا زور ہوا اور طلباء کالجوں سے نکلنے لگے تو الٰہ آباد کے مقام پر طلباء اور پبلک کے سامنے تقریر کرتے ہوئے مسز بسنٹ نے جو ایک بڑی مقرر تھیں خطابت کی پوری طاقت سے سوال کیا "ہندو مذہب نے کب یہ جائز رکھا ہے کہ بیٹا باپ کی حکم عدولی کرے۔ یا کوئی مثال ہے کہ کسی بیٹے نے باپ کے حکم کے خلاف کیا ہو" میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کا ایک لڑکا کھڑا ہوا۔ تقریر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ اس نے بھی انگریزی میں گرج کر کہا "پرہلاد نے اپنے باپ کے حکم کی خلاف ورزی کی" مسز بسنٹ مبہوت رہ گئیں اور بیٹھ گئیں۔

اس سے پہلے لوکمانیہ تلک یہ نعرہ دے چکے تھے کہ سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور یہ کہہ چکے تھے کہ سوراجیہ ہم ہر ممکن ذریعے سے حاصل کریں گے۔ اسی زمانہ میں تلک کا مقدمہ لندن میں چل رہا تھا جس پر کثیر مصارف

ہو رہے تھے۔ مولانا حسرت موہانی تلک کے چیلے اور ان کے بڑے معتقد تھے۔ تلک کے بارے میں حسرت موہانی نے کہا تھا۔

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حب وطن — حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ قوم — خدمتِ ملک و وطن میں محنتِ رنج و محن

یہ طرح طرح کے اضطراب یہ قسم قسم کی بےچینیاں ظاہر کرتی تھیں کہ دل کا چین اور دماغ کا سکون غائب ہو چکا تھا اور مسائل کے حل کی تلاش تھی خواہ کتنی قربانی دینی پڑے۔ لیکن کوئی راہِ عمل سامنے نہ تھی۔

## لیڈر کی آمد

الغرض مادرِ ہند کو دردِ زہ تھا اور مکمل آزادی کا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ایک دایہ کی ضرورت تھی عوام و خواص تیار تھے۔ ایک لیڈر درکار تھا جو سب کے دلوں میں اتر جائے اور جس کا ہاتھ سب کی نبض پر ہو جو حالات کو پہچان سکے اور صحیح قیادت اور سنجیدہ و قابلِ عمل پروگرام عطا کرے جس کا دماغ روشن اور جس کا دل صاف ہو اور جس پر پوری قوم بھروسہ کر سکے۔ چنانچہ اس وقت موہن داس کرم چند گاندھی مطلع ہندوستان پر آفتاب و ماہتاب بن کر طلوع ہوئے اور بہت جلد دوسرے لیڈروں کا ستارہ غروب ہو گیا اور سب نے ان کے آگے سر خم کر دیا۔ یہ وہی مہاتما گاندھی ہیں جن کے بارے میں ایک لطیفہ بستی کے ایک ڈپٹی کلکٹر جو بعد کو کمشنر ہوئے مسٹر یادو نے مجھے سنایا انھوں نے کہا کہ لندن گیا تھا اور ایک گھر میں بالمعاوضہ مہمان تھا۔ ایک دن سب لوگ آگ کے گرد بیٹھے تھے کہ ایک چھ سات سال کے بچے نے اپنی ماں سے کہا کہ "مدر کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں" ماں نے منع کیا اور کہا کہ پہلے وہ سوال میرے کان میں بتلاؤ۔ مگر یادو صاحب نے لجاجت سے کہا کہ بچے کو پوچھ لینے دیجیے۔ تھوڑی تکلّفانہ گفتگو کے بعد لڑکے نے جو سوال کیا وہ یہ تھا "کس قسم کا طاعون گاندھی ہے۔" یادو نے کہا کہ گاندھی طاعون نہیں ہے ایک انسان کا نام ہے۔ تو لڑکا تعجب سے کود پڑا اور حیرت سے منہ پھیلا کر بولا "کیا؟ گاندھی ایک انسان ہے میں نے تو سمجھا تھا کوئی طاعون ہے۔

مہاتما گاندھی واقعی غلامی کے لیے طاعون تھے۔ انگریز کے غرور و تکبر و جعل سازی و وعدہ خلافی کے لیے طاعون تھے۔

مہاتما گاندھی نے مسئلۂ خلافت سے دلچسپی ظاہر کی اور نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ اس میں شرکت کا وعدہ کیا اور نہ صرف شرکت کا وعدہ کیا بلکہ اس میں کود پڑے اور بہت جلد مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے ان کو اپنا لیڈر مان لیا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو "باپو" کہتے تھے۔ اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے تو انھوں نے کہا میں تو جیل میں ہوں۔ البتہ میں یہ جانتا ہوں کہ رسول کے بعد میرے اوپر گاندھی جی کا حکم نافذ ہے۔ مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی کے آشرم میں چلے گئے تھے اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کپنی بند تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد قولاً اور عملاً گاندھی جی کے ہمنوا تھے۔ حضرت شیخ الہند کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور اب مسلم قیادت کو کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔۔۔۔ احمد آباد کانگریس کے موقع پر مولانا عزیز گل رفیق حضرت شیخ الہند نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے، جس میں میں خود موجود تھا کہا۔

> "ہم نے گاندھی کو اپنا رہنما مان لیا ہے۔ آگے جانے کو کہے گا تو آگے جائیں گے۔ پیچھے ہٹنے کو کہے گا تو پیچھے ہٹیں گے۔ لیکن گاندھی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان اپنے خلیفہ کو بھی نہیں مانتے، جب وہ راہِ حق سے تجاوز کرتا ہے۔ گاندھی جب تک راہِ حق پر رہے گا ہمارا رہنما ہے۔"

مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں 30 اکتوبر 1918ء سے مئی 1920ء تک کا زمانہ روحی و قلبی اضطراب بے پناہ جوش اور ہر طرح کی قربانی کی تیاری اور راہِ عمل کی سرگرم تلاش کا زمانہ تھا۔

یہاں اگر حسرت موہانی کا ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی۔ مولانا حسرت موہانی ہمیشہ گاندھی جی سے کتراتے رہے۔ تلک کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ان کا نقطۂ خیال بالکل مختلف تھا۔ مولانا حسرت موہانی پکے سیاسی آدمی تھے اور ان کا نظریہ آزادیِ کامل بیرونِ حکومت برطانیہ تھا۔ اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی گوکھلے کے شاگرد ہونے کی وجہ سے معتدل خیالات رکھتے ہیں اور آخر کار حکومت سے ڈومینین اسٹیٹس یعنی زیرِ سایہ برطانیہ اپر صلح کرلیں گے۔ لیکن حسرت کا ذکر مفصل بعد کو آئے گا۔ اس زمانہ کی تاریخ میں کوئی جگہ حسرت کے ذکر سے خالی کیسے رہ سکتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اختلاف کرتے ہوئے وہ ہر تحریک میں گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ اب چارہ ہی کیا تھا۔

اسی طرح اس دور میں ایک عظیم انسان تھا جس کی بے لوث عظیم خدمات، جس کی دیدہ وری طورِ جہاں بینی جس کی فدائیت اور ستائش و صلہ کی آرزو سے بے نیازی، جس کی بلند فکری اور خاموش فداکاریاں اوراقِ تاریخ پر بکھری پڑی ہیں۔ یہ تھے ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ڈاکٹر انصاری کے کارنامے جا بجا بکھرے ہوئے ملیں گے جن کا جوڑنا اور مرتب کرنا بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے لیکن مطالعہ بتلاتا ہے کہ ان کے دل میں جذباتِ حق کی گہرائیاں کیا تھیں اور کس طرح ہر نازک وقت پر انھوں نے دلیری اور ہوشمندی

سے قوم کی رہنمائی اور تحریک خلافت اور تحریک آزادی کی خدمت کی ہے۔

## رولٹ بل

اسی وقت انگریز نے فتح کے غرور اور طاقت کے نشہ میں رولٹ بل پاس کرنے فیصلہ کیا۔ ہندستان کا حال یہ تھا کہ معتدل جماعت کے لوگ ریفارم لینے کے لیے لندن وفد لے گئے تھے وہاں بھی کام کر رہے تھے اور یہاں بھی۔ اور فرمانِ شاہی پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ مسز اینی بسنٹ ہوم رول کا پرچار کر رہی تھیں ان کے ساتھ اچھے اچھے لیڈر ہو گئے تھے جن میں گورکھپور کے منشی ایشور سرن بھی تھے۔ رولٹ بل کے خلاف پرزور ایجی ٹیشن جاری تھا کہ نہ بل مرتب ہو اور نہ وہ قانون بنے۔ مسلمان انگاروں پر لوٹ رہے تھے اور اس نے اب تک صرف یہ کام کیا تھا کہ مسئلہ خلافت پر پوری طرح متحد ہو گیا تھا اور اپنی آواز بلند کر رہا تھا۔ انگریز ان تمام باتوں سے لاپروا اپنی طاقت اور فتح کے غرور کے نشہ میں مجبور تھا اس لیے اس نے تمام مخالفتوں سے بے نیاز ہو کر رولٹ بل کے بارے میں کارروائی نہیں روکی بلکہ ہز آنر لفٹیننٹ گورنر پنجاب نے ایک تقریر میں اس بل کی مدافعت میں ایسی باتیں کہیں جن سے ظاہر ہو گیا کہ یہ بل ضرور ایکٹ کی شکل اختیار کرے گا۔ ممکن تھا کہ انگریز کی شامت نہ آئی ہوتی تو وہ اعتدال اور سکون سے کام کرتا لیکن اس نے مخالفت کے باوجود رولٹ بل مرتب کر کے شائع کر دیا اور اس رولٹ بل کے مقابلہ کے لیے گاندھی جی میدان میں اتر آئے۔ انھوں نے ستیہ گرہ سبھا بنائی اور اس پر ممبری کے دستخط لینے شروع کیے۔ تمام بڑے لوگوں نے اس پر دستخط کر دیے اور لاتعداد لوگ دستخط کرنے کے لیے ٹوٹے اور مہاتما گاندھی نے اپنی عدم تشدد پر مبنی ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔ یہ پہلا انقلابی قدم تھا جو گاندھی جی نے اٹھایا اور حصولِ آزادی کا راستہ دکھایا۔ یہاں سے تاریخ کا ایک نیا موڑ ہے، ایک نئی سیاست ایک نیا عزم و استقلال ایک انوکھا طریقہ، کامیابی و کامرانی جنم لے رہا ہے۔ قوم پرانے تخیلات سے نکل کر ایک نئے طرزِ فکر اور انقلاب آفریں دور میں داخل ہو رہی ہے جہاں وہ اپنے کو پہچانے اور غلامی سے آزاد ہو۔

رولٹ بل کے جابرانہ قانون کا مختصر تجزیہ درج ذیل ہے:۔

(1) حکام کو اختیار دے دیا گیا کہ جس شخص سے چاہیں ضمانت و مچلکہ یا صرف ضمانت طلب کر لیں۔

(2) جس شخص کو چاہیں حکم دے کر اس کو کسی ایک جگہ نظر بند کر دیں۔

(3) امتناعی احکام بعض معمولی معاملات میں بھی جاری کرنے کے حکام مجاز قرار دیے گئے مثلاً اخبار نویسی، پرچے تقسیم کرنا، جلوس یا جلسوں میں شریک ہونا وغیرہ۔

(4) حکام کسی شخص کو حکم دے سکتے تھے کہ وہ اپنی موجودگی کی رپورٹ پولیس میں اوقاتِ معینہ پر درج کرلے۔

(5) حکام جس کو چاہیں بلا وارنٹ اور بلا فردِ جرم بتائے گرفتار کریں۔

(6) حکام جس کو چاہیں بلا عدالت کی سزا کے قید رکھیں۔

(7) جو ہندوستانی ملک کے باہر ہیں ان کا ہندوستان میں داخلہ ممنوع قرار دے دیں۔

(8) اگر کسی کے قبضہ میں کوئی ضبط شدہ کتاب یا مضمون پایا جائے تو خواہ وہ بیچنے یا نشر کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو محض قبضہ میں پائے جانے کی وجہ سے مستوجب سزا ہوگا۔

یہ بل فروری 1919ء میں شائع ہوا۔ مہاتما گاندھی ابھی بیماری سے اٹھے تھے اور احمد آباد میں اپنی کمزوری کا علاج کر رہے تھے، وہ سخت بے چین ہوئے۔ ولبھ بھائی پٹیل سے انھوں نے کہا کہ اگر چند آدمی تحریری احتجاج کر دیں اور اس پر دستخط کیے جاسکیں تو ستیہ گرہ کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ 24 فروری 1919ء کو ستیہ گرہ آشرم میں ایک چھوٹی سی کانفرنس ہوئی جس میں ولبھ بھائی پٹیل، مسز نائیڈو، بی۔ جی ہارنیمین، عمر سوبانی، شنکر دیال بینکر اور انا سوئیا ہوتے اور وہاں طے کیا گیا کہ ستیہ گرہ کا ایک حلف نامہ تیار کرکے اس پر لوگوں سے دستخط لیے جائیں اور یہ بھی طے ہوا کہ ایک ستیہ گرہ کمیٹی قائم کی جائے۔ وہ جو لائحہ عمل تیار کرے اس لائحہ عمل کے سب لوگ پابند ہوں۔

مرد میدان گاندھی درویش خو پر اس جابرانہ ایکٹ نے وہی کام کیا جو آگ پر پٹرول کرتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کرنے کا عزم مصمم کرلیا اور ستیہ گرہ کمیٹی نے 23 مارچ 1919ء کو فیصلہ کرکے ستیہ گرہ کا یہ طریقہ منظور کیا کہ جو لٹریچر ضبط اور ممنوع قرار دیا جا چکا ہے اسے چھاپا اور بانٹا جائے اور اخبارات کے رجسٹریشن کے قوانین کی بھی خلاف ورزی کی جائے۔ گورنمنٹ نے بجائے اپنا طریقہ ملائم کرنے کے مارچ 1919ء کو ترمیم ضابطہ فوجداری کا ایک بل شائع کرکے 18 مارچ 1919ء کو ایکٹ بنا دیا۔ اس ایکٹ کی رو سے گورنمنٹ نے مزید اختیارات سول آزادی کو سلب کرنے کے حاصل کر لیے تھے۔ ستیہ گرہ کمیٹی کی طرف سے 6 اپریل 1919ء کا دن اس کی تجاویز پر عمل درآمد کے لیے مقرر کیا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ لوگ دن بھر بھوکے رہیں اور شام کو کسی مقام پر جمع ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں مجمع میں جائیں اور تمام کاروبار بند رکھیں۔ گاندھی جی کا ارشاد تھا کہ اس ستیہ گرہ میں بھوکے رہنا اور کاروبار بند کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس سے ہماری روحانی طاقت بڑھے گی اور اس کے بڑھنے سے ہمارے دلوں سے سچی باتیں نکلیں گی اور وہ بلاشبہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوں گی۔ انھوں نے بھوکے رہنے کا جواز مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب سے

ثابت کیا اور اس کی چار دانگ ہند میں تبلیغ کی گئی۔ جس طرح پیاسے کو پانی مل جائے تمام قوم ہندو اور مسلمان سب اس پروگرام پر عمل درآمد کرنے اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

6 اپریل 1919ء کو گاندھی جی نے خود بمبئی میں ستیہ گرہ کا آغاز اس طرح کیا کہ ایک اخبار "ستیہ گرہ" نام کا بغیر اقرار نامہ داخل کیے جاری کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وہ تمام کتب و رسائل اور لٹریچر جس کی اشاعت بند تھی فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ مسز سروجنی نائیڈو بھی تھیں مگر حکومت نے کوئی باز پرس نہ کی بمبئی میں گاندھی جی نے تمام پبلک کو چوپاٹی کے میدان میں جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ وہاں سمندر میں غسل کرنے کے بعد جلسہ اور جلوس نکالا گیا۔ گاندھی جی ساتھ ساتھ تھے پھر گاندھی جی براہ آگرہ و متھرا دہلی کے لیے روانہ ہوئے 9 اپریل کو جب گاڑی کوسی پہنچی تو پنجاب گورنمنٹ کے ایک افسر نے آپ کو یہ حکم دیا کہ پنجاب میں داخل ہونے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا جب دوسرے اسٹیشن پلول پر ٹرین پہنچی تو حکومتِ دہلی اور پنجاب کی طرف سے یہ احکام دیے گئے کہ آپ حدودِ پنجاب میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں اور حکومت ہند کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ کی نقل و حرکت بمبئی میں محدود کر دی گئی ہے۔ اس کو بھی گاندھی جی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ یورپین پولیس افسر نے کہا کہ گاڑی سے اتر آئیے مگر گاندھی جی نے انکار کیا اور کہا جب تک میں گرفتار نہ کیا جاؤں گاڑی سے نہ اتروں گا۔ تب پولیس افسر نے گاندھی جی کے شانہ پر ہاتھ رکھا تب وہ اترے۔ وہاں سے متھرا آئے اور متھرا سے بذریعہ اسپیشل ٹرین بمبئی روانہ کر دیے گئے۔

پلول اسٹیشن پر گاندھی جی نے ایک پیام اہلِ ملک کے نام لکھا اور مہادیو دیسائی کو دیا اور کہا کہ تم میرے قائم مقام ہو۔ پیغام کا خلاصہ یہ ہے:۔

(1) میری گرفتاری مجھ کو آزادی دلاتی ہے۔ مجھے وہی ملا جس کا میں متمنی تھا یعنی رولٹ قانون منسوخ کیا جائے یا میں جیل خانہ بھیج دیا جاؤں۔

(2) اب آپ کے لیے اپنا وہ فرض ادا کرنا باقی ہے جو ستیہ گرہ کے عہد نامہ کے بموجب آپ پر عائد ہوتا ہے۔ اس فرض کو ادا کیجیے۔ اسی میں کامیابی ہے۔

(3) ستیہ گرہی جو اس بڑی جنگ میں شریک ہیں وہ سچائی اور حق کے راستہ سے بال برابر بھی ہٹے یا انھوں نے کسی انگریز یا ہندوستانی پر زیادتی کی تو اس مقصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔

(4) مجھے امید ہے کہ ہندو مسلم اتحاد جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ اب سب عوام کے دلوں میں اتر چکا ہے، اصل رنگ میں نظر آئے گا۔

(5) آخر میں میرا ایمان یہ ہے کہ ہماری ترقی اور آزادی کا راز تکالیف و مصیبت برداشت کرنے

میں ہے نہ کہ انگلستان کے اصلاحات بخشنے میں خواہ اصلاحات کتنے ہی وسیع اور غیر محدود کیوں نہ ہوں۔

(۵) مجھے امید ہے کہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی اور وہ تمام لوگ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں یا اس ملک میں بود و باش اختیار کرلی ہے اس قومی جدوجہد میں پورا حصہ لیں گے مجھے اس کی بھی امید ہے کہ عورتیں اور بچے جتنا ان کو چاہیے حصہ لیں گے۔

(موہن داس کرم چند گاندھی)

# سوامی شردھانند کی جامع مسجد میں تقریر

دلی میں غلط فہمی کی بنا پر 30 مارچ ہی کو ستیہ گرہ کا دن منایا گیا۔ گورنمنٹ اب پوری طاقت سے اس تحریک کو کچلنے کے لیے تیار ہو گئی تھی چنانچہ فوج بلوائی گئی اور دہلی کے عظیم الشان جلسے کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کے علاوہ مشین گن سے بھی مسلح تھی۔ دو مرتبہ گولی چلی۔ کچھ آدمی قتل اور بہت سے مجروح ہوئے۔

یہی 30 مارچ 1919ء کا دن ہے جب ہندو مسلم اتحاد اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند نے جامع مسجد کے مکبّرہ پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور مسلمانوں نے ذوق و شوق سے ان کو ایسا کرنے دیا۔ اس کے بعد جب جلوس نکلا اور چاندنی چوک پہنچا تو وہاں گورکھا فوجوں کی سنگینوں کے سامنے سوامی جی نے اپنا سینہ کھول دیا۔ اس واقعہ کی عام شہرت ہوئی اور تمام ہندوستان جوش سے دیوانہ ہو گیا۔

وفاداران حکومت تاک میں تھے فوراً شور و غوغا مچانا شروع کیا کہ ایک ہندو کو مسجد میں کیوں آنے دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اس وقت رانچی میں نظر بند تھے قلم ہاتھ میں لیا اور ایک رسالہ معہ احادیث صحیحہ تیار کر دیا اور ایسا مسکت جواب دیا کہ پھر لوگ خاموش ہی ہو گئے۔ تب کھسیانے ہو کر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ مسجد کا مکبّرہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جگہ ہے۔ وہاں ان کو کیوں کھڑا کیا لیکن سانپ نکل گیا تھا اب لکیر پیٹنے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

صرف دلّی اور بمبئی کی شرط نہیں ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شہر نہ تھا جہاں عظیم پیمانے پر جلسے نہ ہوئے ہوں، جن میں پندرہ ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک کے مجمعے ہوئے۔ لوگ دن بھر بھوکے رہے اور ننگے سر اور ننگے پیر جلسہ گاہ تک جا کر خدا کے سامنے الحاح و زاری سے دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ انصاف کر، اے اللہ انصاف کر۔ تمام ہندوستان ابل پڑا تھا۔ بڑے بڑے لوگ گاندھی جی کے

ہمنوا ہو گئے۔ مولانا حسرت موہانی جو گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے کبھی موافق نہ ہوئے اس جنگ میں پیش پیش تھے حسرت صاحب کو تو آزادی کے لیے لڑنے مرنے کا محاذ ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر انصاری سوامی شردھانند وغیرہ سب میدان میں آگئے۔ اس انوکھی چیز کا نام کسی نے "خاموش مقابلہ" رکھا جسے انگریزی میں PASSIVE RESISTANCE کہا گیا ہے۔ گاندھی جی نے ایک گشتی چٹھی نشر کی جس میں رولٹ بل کی خرابیوں کو بیان کرتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ "اصلاحات ممکن ہے کیے جائیں یا نہ کیے جائیں۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلہ پر ایک ٹھیک اور واجبی سمجھوتہ ہو جانا چاہیے۔ سول سروس جماعت کو سمجھانا چاہیے کہ وہ ہندوستان میں صرف اس کی (ہندوستان کی) خادم بن کر رہ سکتی ہے، فرضی نہیں بلکہ عملی۔ اور برطانوی تجارتی ایوانات کو خیال کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں ان کا وجود اسی حالت میں قائم رہ سکتا ہے جبکہ وہ اس کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کریں نہ کہ وہ ہندوستانی صنعت و حرفت اور تجارت کی تباہی و بربادی پر آمادہ ہوں"۔ ... مسودات مذکور کے باعث ہم کو اس حکومت کے خلاف ناراضی و تنفر زیادہ سختی سے دکھلانا چاہیے جس کے استبدادی کارنامے خود اس کی شہادت دے رہے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ اس گشتی کو ایک ستیہ گرہی کی طرح گاندھی جی نے وائسرائے کے پاس بھیج دیا۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو بات چیت کے لیے بلایا۔ اور گاندھی جی گئے۔

گاندھی جی اور وائسرائے کی ملاقات کا خلاصہ جو کنر یونٹ کر اخبارات نے مکالمے کی شکل میں چھاپا، حسب ذیل ہے:۔

گاندھی جی:۔ سختی کے ساتھ پیسو رزسٹینس PASSIVE RESISTANCE یعنی خاموش مقابلے سے کام لیا جائے۔

وائسرائے:۔ PASSIVE RESISTANCE میں بہت جلدی کی گئی۔

گاندھی جی:۔ میرا خیال تھا کہ برٹش گورنمنٹ کی بنیاد روحانی قوت پر قائم ہے۔

وائسرائے:۔ میری رائے اس کے خلاف ہے اور آپ کے بیان پر مجھ کو شک ہے۔

گاندھی جی:۔ اگر برٹش گورنمنٹ کی بنیاد محض طاقت پر ہے تو تمام ہندوستان کو غیر وفادار سمجھنا چاہیے اور اس حالت میں میں پہلا شخص ہوں گا جو غیر وفادار کہلانے کا مستحق ہوگا۔

آج کھل کر باتیں زبان پر آئیں کہ ستیہ گرہ تو ایک فلسفہ ہے اس کا اس قدر جلد سمجھ لینا ناممکن تھا۔ لیکن لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملا اور لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ مسلمان تو خلافت کی وجہ سے اضطرابِ عظیم میں مبتلا تھے ہی۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یہ رولٹ بل ایک چیلنج تھا۔ لیڈر مل

گیا اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک عجیب نظارہ سامنے آیا۔

## جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام

یکم مارچ 1919ء کو ستیہ گرہ کی تجویز مقابلہ کے لیے جب پاس ہوئی تھی تو امرتسر اور پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی دوسرے صوبوں کے مراکز اور اضلاع اور شہروں کی طرح 6 اپریل کو ہڑتالیں ہوئیں اور پرجوش مظاہرے کیے گئے۔

گورنمنٹ سختی سے ان مظاہروں کو کچل دینے کے لیے میدان میں اتر آئی۔ فتح اور طاقت کا گھمنڈ عروج پر تھا اور گورنمنٹ برطانیہ نے وہی غلطی کی جو ابھی حال میں جنرل یحییٰ خاں نے مشرقی پاکستان میں کی جس سے بنگلہ دیش بنا۔ گورنمنٹ بھول گئی کہ عوامی جذبات کو کچلا نہیں جا سکتا۔ کہا گیا ہے کہ ساکن سمندر میں جب طوفان آجائے تو بجز خدا کے اور کسی میں طاقت نہیں ہے کہ وہ کہہ دے کہ بس۔ ہر وقت فوج متحرک رہتی تھی مشین گنوں کا مظاہرہ تھا۔ مگر گاندھی درویش خو نے وہ صور پھونکا تھا کہ اب نیند کا کوئی سوال نہ تھا۔

اپنی سخت کارروائیوں کے ماتحت 10 اپریل 1919ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ 15 اپریل 1919ء کو لاہور اور امرتسر میں جہاں تحریک زوروں پر تھی مارشل لا جاری کر دیا گیا۔

10 اپریل 1919ء کو اس خبر سے مشتعل ہو کر کہ "گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے ہیں" امرتسر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور چونکہ ابھی شروعات تھی اور لوگ ستیہ گرہ کے بنیادی اصول سچ اور عدم تشدد کو سمجھے نہیں تھے ایک بینک پر حملہ کر دیا۔ بعض انگریز افسروں اور ایک میم کو قتل کر ڈالا۔ ایک عمارت کو آگ لگا دی۔ پولیس جلد حالات پر قابو پا گئی لیکن جنرل ڈائر دو ہزار فوج لے کر امرتسر پہنچا۔ 13 اپریل کی صبح کو جنرل ڈائر نے ایک اعلان کے کے ذریعہ کسی قسم کا جلوس نکالنے کو منع کیا۔ چار آدمیوں سے زیادہ جمع ہونے کو خلافِ قانون ٹھہرایا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اگر ضرورت ہوئی تو اسلحہ کا استعمال کر کے خلاف ورزی کرنے والے مجمع کو منتشر کیا جائے گا۔ لیکن پبلک نے اس حکم کو نظر انداز کر کے شام کو $4\frac{1}{2}$ بجے جلیانوالہ باغ میں جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ جب جنرل ڈائر کو یہ خبر ملی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا اور مشین گنیں اور فوج لے کر موقع پر پہنچا اور تمام راستہ گھیر کر کہ کوئی بھاگنے نہ پائے فائر کا حکم دیا اور اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک ایک گولی بھی باقی تھی حتیٰ کہ 379 آدمی ہلاک اور بارہ سو زخمی ہو کر ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد نہ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا نہ پانی تک دیا گیا۔ وہیں پڑے تڑپتے رہے۔ اس کے بعد $1\frac{1}{2}$ ماہ تک مارشل لا جاری رہا۔ مارشل لا قانون کے تحت شہر کے معززین کو

واٹر ورکس اسٹیشن پر حاضر ہو کر احکام سننے پڑتے تھے۔ 8 بجے شام سے 5 بجے صبح تک کرفیو رہتا تھا۔ خلاف ورزی کی سزا گولی تھی۔ سب کی موٹریں اور تمام سواریاں بیگار میں لے لی گئی تھیں۔ بجلی، روشنی اور پنکھے چھین لیے گئے تھے۔ معمولی شبہ پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ سناتن دھرم کالج پر ایک اشتہار احکام نادر شاہی کا چسپاں تھا اسے کسی نے پھاڑ ڈالا تو تمام طلبا، پروفیسر اور احاطہ کے مرد گرفتار کر لیے گئے اور ان کو تین میل پیدل چلایا گیا تب ضمانت پر رہا کیے گئے۔ کالجوں کے ایک ہزار طلبا کو روزانہ حاضری کا حکم دیا گیا جس کے لیے ان کو روزانہ 16 میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ذرا سے شک پر لوگوں کو تازیانے لگائے جاتے تھے۔ امرت سر میں ایک گلی تھی جہاں کچھ لوگوں نے ایک انگریز پر حملہ کر دیا تھا اس گلی سے لوگوں کو پیٹ کے بل رینگ کر چلایا جاتا تھا۔ گلی بہت لمبی تھی، کوئی ذرا سا ابھرا تو تازیانے لگتے تھے۔ لائل پور میں حکم ہوا کہ جب کوئی انگریز سامنے سے گزرے تو ہر ایک ہندوستانی گاڑی سے اتر کر، اور اگر چھتری لگائے ہو تو چھتری بند کر کے مؤدب کھڑے ہو کر سلام کرے۔ فوجیں دیہات میں بھیج دی گئیں جہاں وہ اندھا دھند جس کو چاہتیں پکڑ لیتیں اور کوڑے لگاتیں۔ ڈرانے کے لیے ہوائی جہاز سے بم پھینکے گئے اور مشین گنوں سے گولیوں کی بارش کی گئی۔ ایک لائن کی پٹری اکھڑ گئی تھی، قریب کے دیہات والوں پر بلا جانچ گولی چلائی گئی۔

یہ واقعات سن کر تمام ہندوستان ہل گیا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اب یہ ہندوستان گاندھی جی کا ہندوستان تھا۔ ہر چہار جانب سے انتہائی جوش و خروش کے ساتھ ان افعال کی مذمت کی گئی اور جب یہ خبریں انگلستان پہنچیں تو وہاں سے رائے عامہ بھی بے حد متاثر ہوئی۔ ایک بڈھے انگریز نے جس کا بیٹا حال ہی میں آئی سی ایس ہو کر ہندوستان آیا تھا، صبح کو اخبار میں جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی خبر پڑھ کر غصہ سے دانت پیس کر کہا۔ "میں نے اپنے لڑکے کو ہندوستان یہ ہولناک جرائم کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ میں اسے واپس بلاؤں گا" مارشل لا کے لیے ایک تحقیقاتی ٹربیونل مقرر کیا گیا۔ اس کے سامنے انگریز افسران نے ان مظالم کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ:-

"ہمارا ان کارروائیوں سے مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دماغ سے بغاوت کے جذبات فنا کر دیئے جائیں۔"

جنگ کے دوران ہندوستان نے لاکھوں سپاہی، دو ارب (2,000,000,000) روپیہ اور خون اور پسینہ برطانیہ کو دیا تھا اور اس کا یہ صلہ ملا۔

ادھر خلافت کے سلسلے میں جذبات کا بے پناہ ابال اور ادھر حکومت کی یہ احمقانہ کارروائیاں وحشت و بربریت اور طوقِ غلامی کو مضبوط کرنے کی سازشیں۔ ایک طرف مسلمانوں سے وعدوں کی خلاف ورزی، دوسری طرف

ہندوستان سے وعدوں کی خلاف ورزی۔ ملک اب بھرپور جدوجہدِ آزادی کے لیے تیار تھا اور گاندھی جی کی پیش قدمی، جرأت ومردانگی رنگ لا رہی تھی۔

## رابندر ناتھ ٹیگور کا ردِ عمل

حتیٰ کہ ہندوستان کے مشہور فلسفی ودانشور اور نوبل پرائز کا انعام پانے والے رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنا "سر" کا خطاب 30 اپریل 1919ء کو واپس کر دیا۔ اس سے ہندوستان کا تمام تعلیم یافتہ طبقہ بے حد متاثر ہوا۔

احمد آباد میں مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی تھی اور احمد آباد جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ وہاں کے لوگوں کی درخواست پر گاندھی جی 13 اپریل 1919ء کو احمد آباد گئے۔ 17 اپریل 1919ء کو امن قائم ہو گیا اور مزدوروں نے ہڑتال بند کر دی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ گاندھی جی کا منشا کسی قسم کا ہڑبونگ نہیں بلکہ شعور کے ساتھ رائے عامہ کو بیدار اور موثر ثابت کرنا تھا۔

20 اپریل 1919ء کو کانگریس کمیٹی کا جلسہ تھا۔ لیکن گاندھی جی پنجاب صرف اس لیے نہیں گئے کہ ان کی گرفتاری لازمی تھی اور اس سے پبلک میں مزید ہیجان پیدا ہوتا۔ اور اس وقت تک کا تجربہ یہ تھا کہ پبلک عدم تشدد پر قائم نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد گورنمنٹ نے جلیانوالہ باغ اور دیگر ہولناک واقعات کی جانچ کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کر دی اور تب گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک روک دی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ ابھی پبلک اہنسا کے لیے تیار نہیں تھی۔ اور ستیہ گرہ کی کامیابی صرف دو بنیادی اصولوں "سچ" اور "اہنسا" پر منحصر تھی۔ ستیہ گرہ کے روک دینے سے گاندھی جی کا وقار اندرون وبیرونِ ملک میں آسمان تک پہنچ گیا۔

اسی دوران حکومت نے بمبئی کرانیکل کو بند کر کے اس کے ایڈیٹر ہارنیمین کو جلاوطن کر دیا۔ گاندھی جی نے ینگ انڈیا کے ساتھ ایک اور اخبار "نوجیون" نکالا جس کے ایڈیٹر مہاتما گاندھی، مہادیو دیسائی پبلشر اور شنکر لال بینکر پرنٹر مقرر ہوئے۔

## جنگِ استقلالِ افغانستان

انگریز کی بدبختی کے دن آگئے تھے۔ افغانستان نے بھی کروٹ لی۔ افغانستان کا رقبہ تقریباً 2 لاکھ 45 ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ سے کم ہے۔ یہ ایک پہاڑی ملک ہے۔ بہت سے رقبے غیر آباد

ہیں۔ ہندوکش اور ہمالیہ پہاڑوں کا سلسلہ بیس ہزار فٹ کی بلندی تک جا بجا پایا جاتا ہے۔ اکثر چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں داخلہ کے لیے تین درے ہیں۔ درّۂ خیبر اور درّۂ گومل پنجاب کو راستہ دیتے ہیں اور درّہ بولان سندھ کو راستہ دیتا ہے۔ افغانستان کے پورب صوبہ سرحد، پچھم ایران کا صوبہ خراسان شمال میں بخارا اور روسی ترکستان اور دکھن میں بلوچستان ہے۔ اس کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ یہ ہمیشہ سیاسی ریشہ دوانیوں کا اکھاڑہ بنا رہا۔ کبھی روس کے زیر اثر آیا اور کبھی برطانیہ کے۔ مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد ۱۸۸۰ء میں عبدالرحمٰن خاں امیر افغانستان ہوئے جو برطانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں ان کے انتقال پر ان کے لڑکے امیر حبیب اللہ خاں حکمراں ہوئے۔ وہ پورے طور پر برطانیہ کے زیر نگیں آ گئے۔ ان کے عادات و اطوار بھی خراب تھے۔ انگریزوں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان کو ایک بڑی رقم بطور معاوضہ دی جائے گی اور خلیفۃ المسلمین بنا دیا جائے گا۔ امیر حبیب اللہ نے اس لالچ میں مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ساتھیوں کو مسلسل قید رکھا۔ اگرچہ زبان سے وہ انھیں مہمان کہتا تھا اور ہر تحریکِ جہاد کی شاطرانہ مخالفت کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان میں ہندوستان کی عارضی حکومت کی بنا رکھی تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ قرار دیئے گئے تھے۔ لیکن امیر حبیب اللہ نے کبھی اس کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور وہ لوگ کام کیا کرتے تھے۔ جب وہ شاہی مہمان کے نام پر تنگ و تاریک کمروں میں محبوس رہے اور ہر لحہ ان کی نگرانی ہوتی رہی۔

لیکن افغانستان کی استقلال پارٹی جو سید جمال الدین افغانی کی کوششوں سے عالمِ وجود میں آئی تھی، سرگرم عمل تھی۔ اس نے پوری فوج پر اپنا اثر جمالیا تھا۔ اس میں شاہی خاندان سے بیگم علیا حضرت اور امیر امان اللہ خاں بھی شریک یا مددگار ہو گئے تھے۔

امیر حبیب اللہ جلالآباد شکار کو گئے تھے۔ ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو وہ مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے کہ ایک مچھلی تالاب سے باہر تڑپنے لگی۔ امیر حبیب اللہ نے کہا اسی طرح ایک دن ہر انسان کی روح تڑپ کر اس جسدِ خاکی سے جدا ہو جائے گی۔ اسی شب میں کوئی شخص ان کے کمرے میں داخل ہوا اور گولی سے ان کو ہلاک کر کے فرار ہو گیا۔

ظفر احمد ایبک لکھتے ہیں:-

"امیر حبیب اللہ خان نے مرنے سے ایک ہفتہ قبل اپنے جمعہ کے خطبہ میں خود کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کا منتظر تھا تاکہ اپنے کو خلیفہ اعلان کرے۔ اسی ہفتہ امیر نے انگریزوں سے اپنی غیر جانب داری کی قیمت وصول کرنے کے

یہ پشاور بھیجی تھیں تاکہ غیر جانبدار رہ کر جو اس نے جنگ میں انگریزوں کی مدد کی تھی یعنی بالفاظ دیگر خلافتِ اسلامیہ کے مفاد اور جہاد کو پسِ پشت ڈال کر جو اس نے عالمِ اسلام کو نقصان پہنچایا تھا اس کا صلہ اور معاوضہ حاصل کرے۔ لیکن خدا کی شان دیکھیے کہ نہ اس کو خلیفۃ المسلمین بننا نصیب ہوا اور نہ ہی اس کو عیش و عشرت پر خرچ کرنے کے لیے روپیہ ملا۔[1]

امیر حبیب اللہ خاں کے مرتے ہی پوری فوج ابل پڑی۔ وہ سردار عنایت اللہ خاں اور سردار نصر اللہ خاں کو گرفتار کرکے کابل لائی اور امان اللہ خان کے امیر افغانستان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ امیر امان اللہ خاں نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور سرحد پر فوجیں بچھا دی گئیں اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے عارضی حکومت کی طرف سے ہندوستان پیغامات بھیجے کہ بصورتِ جنگ سب لوگ بغاوت کے لیے اور حملہ آور فوجوں کی مدد کے لیے تیار رہیں۔

جنگ چھڑ جانے کے بعد وائسرائے اور گورنر جنرل ہند مسٹر چیمسفورڈ نے ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو اپنی "وفادار رعایائے شہنشاہ معظم" کو آگاہ کرنے کے لیے ایک بیان جاری کیا جس کے بعض حصے ایسے ہیں جن سے ہمارے نقطۂ نگاہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً:-

> "ہز اکسلنسی نے "افغانستان کی اس حیرت انگیز بے وقوفی" کی ایک وجہ تو یہ قرار دی کہ امیر حبیب اللہ کے قاتلوں کو سزا نہ دینے سے ملک میں بے چینی پھیل رہی تھی اور امیر امان اللہ نے جنگ چھیڑ کر لوگوں کے خیالات کو اس جانب منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان کی حکومت کے ساتھ وفا کے رشتے کا توڑنا کسی حد تک ہندوستانی جرمنی مقیم کابل کی ان کوششوں کا کہ وہ امیر مرحوم کو راہ راست اور وفاداری کی منزل کی ترغیب دیتے تھے" بدیر حاصل ہونے والا ثمرہ ہے۔"
>
> "جو شہادت ہز اکسلنسی کے ہاتھ میں ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ امیر نے اپنی بغاوت کے لیے یہ بہانہ کیا ہے کہ ہندوستان اس وقت انقلاب کی حالت میں ہے جو ان کے ملک میں ریشہ دوانیوں کا باعث ہوگی۔ امیر نے اپنی رعایا سے بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں نہ تو لوگوں کا مال و اسباب سلامتی کی حالت میں ہے نہ مذہب۔۔۔۔۔ امیر نے اس طرح کے کاغذات و اعلانات ہندوستان میں پھیلانے کا انتظام کیا ہے اور ایسے اخبارات کو رشوت دینے کا بھی انتظام کیا جن کے متعلق ان کو امید تھی کہ وہ بک جانے کو تیار ہوں گے۔۔۔۔۔ امیر کی یہ خودکشانہ غلطی ہے

---

[1] آپ بیتی حصہ اول صفحہ 130

کہ انھوں نے اپنی طاقت کا ایک ایسی طاقت سے مقابلہ کیا جو دنیا کی سب سے بڑی جنگ میں فتحیاب و منصور ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کے لیے ایک فوقیت رکھنے والی اور سب پر چھائی ہوئی طاقت حاصل ہے اور وہ اس حرکتِ مجرمانہ کی قرارِ واقعی سزا دے گی۔"

سردار محمد صالح خاں کمانڈر بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے 2 مئی ۱۹۱۹ء کو کابل سے اعلانِ جنگ ہونے کے قبل لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ہوائی جہاز سے بم گرائے جس سے اس کا ایک پاؤں زخمی ہو گیا اور وہ یہ چلاتا ہوا پیچھے ہٹا کہ "پائے من شہید شد پائے من شہید شد" امیر امان اللہ نے فوراً اس کو معزول کر دیا۔ اور اس کی سزا کے لیے مشورہ طلب کیا۔ سب لوگوں کی رائے تھی کہ قتل کر دیا جائے لیکن امیر امان اللہ خاں نے حکم دیا کہ اسے عورتوں کا لباس پہنا کر گھر کے اندر رکھا جائے اور یہ ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ اگر کبھی مرد کے لباس میں گھر کے باہر دیکھا جائے تو ہر شہری پر اس کا خون حلال کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اسے قتل کر دے۔ سردار محمد صالح خاں کے فرار سے فائدہ اٹھا کر انگریزی افواج نے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ اب جنرل نادر خاں محاذِ جنگ پر آیا اور اس نے تیزی سے حملے شروع کیے اور مارچ کرتا ہوا ٹھل کا محاصرہ کر لیا۔ نادر خاں کے مقابلہ کے لیے جنرل ڈائر روانہ کیا گیا۔ جنرل ڈائر نے اس وقت کے سرکاری انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں کہا کہ نادر خاں میری فوج پر اس طرح ٹوٹا جس طرح آسمان سے ستارہ ٹوٹتا ہے۔ جنرل نادر خاں نے پشاور کو گھیرنے اور اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر جنرل نادر خان کے بھائی جنرل محمود خاں نے انگریزی سپاہ کو دوسرے محاذ پر پے در پے شکست دی تھی مگر 27 مئی ۱۹۱۹ء کو امیر امان اللہ خاں نے جنگ بندی کا فیصلہ کر کے حکم دیا کہ افغانی فوجیں سرزمین ہندوستان کو خالی کر کے سرحد سے 20 میل پیچھے ہٹ آئیں۔

امیر امان اللہ خاں کا عالم یہ تھا کہ جب محمد صالح فرار ہوا ہے اور انگریزوں نے ہوائی جہاز سے کابل پر بمباری کی تو وہ رائفل لے کر خود نکلتا تھا اور ہوائی جہاز پر حضرت علیا سلطان کے منع کرنے کے باوجود فائر کرتا تھا۔ اس فعل عبث سے اس کی بے جگری اور دلاوری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ کا منشا صرف یہ تھا کہ انگریز کا دباؤ افغانستان سے اٹھ جائے اور ملک خداداد افغانستان واقعی ملک خداداد ہو جائے۔ انگریزوں کی دقت یہ تھی کہ ابھی ہندوستان کی افواج واپس نہیں آئی تھیں اور روس میں بالشویک حکومت لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں ۱۹۱۷ء میں قائم ہو چکی تھی۔ روس اپنی اندرونی دقتوں کے باوجود پوری طرح ہندوستان اور افغانستان اور ہر محکوم ملک کی مہم آزادی کا ہر طرح کا مددگار تھا۔ اس چپقلش میں انگریز کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ افغانستان کو مثل سابق کوئی سبق دے سکتا۔ اور اسی لیے جنگ بندی اس قدر جلد طے ہو گئی۔

# راولپنڈی کانفرنس

مستقل صلح کے لیے دونوں فریقوں کے نمائندے راولپنڈی میں جمع ہوئے اور وہاں ۸ اگست ۱۹۱۹ء کو دونوں ملکوں کے درمیان معاملات طے ہوگئے۔ اس صلح کے ذریعہ انگریزوں نے افغانستان کی مکمل آزادی کو اور افغانستان نے موجودہ سرحدوں کو تسلیم کیا۔

راولپنڈی کانفرنس میں پہلے انگریز نمائندے سرہیملٹن گرانٹ نے تقریر کی۔ اس نے بڑی تمکنت سے افغانستان کو جنگ شروع کرنے پر ملامت کی اور پھر کہا کہ "افغانستان کی کیا حیثیت تھی جو ہم سے نبرد آزما ہوتا لیکن ہم نے افغانستان پر رحم کرکے لڑائی جاری رکھنا نامناسب سمجھا" اس کے بعد افغانی نمائندے سردار علی احمد خاں نے زوردار گفتگو کی۔ اس کو انگلو انڈین اخبارات نے حیرت خیز قرار دیا۔ افغانی مندوب نے کہا "لڑائی تم نے شروع کی اور صلح کی درخواست تم نے کی ہے۔ تم کو اپنی طاقت کا بالکل بے جا گھمنڈ ہے۔ تم جرمنی کے مقابلے میں بہت کمزور تھے مگر دنیا میں اتحادی جیتا ہے۔ تم کو اتحادی مل گئے اور تم کامیاب ہو گئے تم کو کیا معلوم ہے کہ ہم کو اتحادی نہ مل جاتے" اس پر کانفرنس عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی۔ اصل الفاظ حسب ذیل تھے:۔

> "اس بیان کے متعلق کہ برٹش گورنمنٹ افغان گورنمنٹ سے اس قدر زیادہ طاقت ور ہے کہ اگر جنگ جاری رہتی تو نتیجہ صرف برٹش گورنمنٹ کے حق میں ہوتا۔ سردار علی احمد نے اسے تسلیم کیا کہ اس وقت ضرور برٹش گورنمنٹ کے پاس آدمی، توپوں اور آلہ پرواز کی زیادتی ہے لیکن کیا یہی حالت جنگ یورپ میں جرمنی کی نہیں تھی اور کیا جرمنی نے لندن پر اسی طرح بم نہیں گرائے تھے جس طرح کابل پر انگریزوں نے گرائے ہیں لیکن آخر میں کون کامیاب ہوا۔ برٹش نے اس جنگ میں کامیابی حاصل کی کیونکہ وہ متحد ہوگئے تھے۔ ان کو اتحادی مل گئے تھے یہی امکانات اتحاد اور اجتماع کے افغانستان کو بھی حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں صلح کانفرنس کا ایک فریق دوسرے سے یہ کہنے کا مجاز نہیں ہے کہ ہم کامیاب ہوتے اگر جنگ جاری رہتی۔
>
> حکومت ہند کو اس غلط فہمی میں نہ پڑنا چاہیے کہ افغانی غافل اور جاہل قوم ہیں۔"

مولانا عبید اللہ سندھی آزادی وطنِ ہند کے لیے بے چین تھے لیکن باہر رہ کر اور باہر کے ملکوں پر بھروسہ کرکے انھوں نے یہاں کے ہندوؤں پر اچھا اثر نہیں ڈالا۔ ان کی نیت پر شبہہ کیا گیا اور انگریزوں نے خفیہ پروپیگنڈہ سے یہ خیال پیدا کر دیا کہ مسلمان افغانستان سے حملہ کرا کے اور خود ان کی مدد کرکے ایک

متحدہ قومی جمہوریہ نہیں بلکہ افغانستان کی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس پر بحث اور صفائی کئی سال تک جاری رہی۔ "افغان لوگی" کے نام سے ہر قوم پرور مسلمان صفائی دیتا رہا حتیٰ کہ مولانا محمد علی سے بھی ایک مرتبہ سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر افغانستان ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے آئے گا تو ہم اس کی مدد کریں گے اور اگر وہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے آئے گا تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا حسرت موہانی نے جو الٰہ آباد سے واپس ہو کر آئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ سر تیج بہادر سپرو کے مکان پر اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے ایک نشست تھی کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کر دے تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ مولانا حسرت فرماتے تھے کہ میں نے کہا بات کو چھپا کر کہنے سے کیا حاصل۔ دنیا جانتی ہے کہ افغانستان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر سکے۔ آپ اس کو سوچیے کہ اگر روس حملہ کرے تو ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ سر تیج بہادر نے پوچھا کہ آپ بتلائیے کہ کیا رویہ ہوگا۔ مولانا حسرت نے کہا کہ ہم قصائد لکھ کر ان کا خیر مقدم کریں گے۔ سپرو صاحب نے کہا کہ کیا وہ ہم کو غلام نہیں بنا دیں گے تو حسرت صاحب نے جواب دیا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ ان کی پالیسی استعمار پسندانہ نہیں ہے وہ صرف غلام قوموں کو آزاد کراتے ہیں۔ سپرو صاحب نے کہا کہ مولانا وہ آپ کا گھر لوٹ لیں گے۔ مولانا نے کہا کہ بلا سے لوٹ لیں ملک تو آزاد ہو جائے گا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۹ء مسلمان کے سخت دماغی خلجان کا زمانہ تھا اور یہ تھا کہ انگریز نے لڑائی تو جیت لی تھی لیکن ہر جگہ آزادی کے لیے آگ پھیل گئی تھی۔

## امیر امان اللہ خاں

اے امیر کامگار اے نامدار   نوجوان و مثل پیراں پختہ کار

امیر امان اللہ خاں نے شروع سے جہاد اور اصلاحات کا نعرہ دیا۔ وہ جوشیلی اور پر زور تقریریں کرتے تھے۔ اپنی قوم سے کہتے تھے کہ ہر شخص سرہانے بندوق رکھ کر سویا کرے۔ کیا معلوم کب میں جہاد کے لیے پکاروں۔ اپنے لیے پوری ادعائی قوت سے پکارتے تھے " امان اللہ اللہ کی راہ میں ہر وقت اپنی جان دینے کے لیے تیار ہے،" ان تمام لوگوں کو جو آزادانہ جذبات رکھنے کی وجہ سے قید تھے امیر امان اللہ نے رہا کر دیا، جن میں ہندوستان کے ڈاکٹر عبدالغنی بھی تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور ان سب کی بڑی عزت کرتے تھے اسی لیے ڈاکٹر عبدالغنی کو راولپنڈی صلح کانفرنس کے لیے افغانستان کے نمائندوں میں شامل کیا تھا۔ امان اللہ نے پوری قوم افغان کو حکم دیا کہ وہ چھ ماہ کا کھانا تہہ خانوں میں جمع کر لے۔ افغانستان ایک بہت سرد ملک ہے اور وہاں پکا ہوا کھانا بھی چھ ماہ تک سڑتا نہیں ہے۔ انھوں نے سودیشی اشیاء کو رواج دیا۔ کہا کہ اپنے

ملک کا کپڑا پہنو۔ اگر کوئی افسر بیرونِ ملک کے کپڑوں میں ملبوس نظر آیا تو فوراً اس کے قریب جا کر اس کی صبحت تعریف کی، درقینچی نکال کر ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور کہا کہ "نمونہ گیریم" اور لباس کو برباد کر دیا۔ وہ راتوں کو اکیلے گھومتا تھا اور چونکہ یہ حکم تھا کہ کوئی اکیلے نہ گھومے، ایک مرتبہ سپاہی نے اسے گرفتار کر لیا جس کو اس نے انعام دیا۔ امان اللہ نے اپنے ملک میں تعلیم جاری کی علومِ حاضرہ اور سائنس کی تعلیم اور کچھ لڑکوں کو لندن بھی بھیجا مگر ان کے ساتھ ایک عالم بھی گیا تاکہ جب یہ عیسائی لڑکے گرجا میں جائیں تو یہ لڑکے قرآن پاک کی تلاوت کریں۔

اتحادِ اسلام اور خلافت مرکزیہ اسلامیہ کا وہ بدل وجان معتقد تھا چنانچہ جب ۱۹۲۱ء میں تاجِ برطانیہ کا ایک نمائندہ شرائط صلح پر دستخط کرانے کے لیے امیر امان اللہ خاں کے پاس گیا اور کہا کہ انگلستان اور افغانستان میں صلح مکمل ہو رہی ہے تو امان اللہ نے جواب میں کہا کہ ہم صرف تعلقاتِ ہمسائگی قائم کر رہے ہیں۔ تم نے جو سلوک آلِ عثمان سے کیا اور جس طرح تم سمرنا میں مظالم کر رہے ہو اور ہندوستان کے علماء کو قید کر رہے ہو تم سے صلح ناممکن ہے۔

افغانستان آزاد ہو گیا تھا، اپنے پیروں پر کھڑا تھا، انگریز کی غلامی کا طوق نکال پھینکا تھا اور خودداری اور خودشناسی کی باتیں کر رہا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب انگریزوں نے افغانستان کو موسم گرما میں عیش سے گزارنے کے لیے تجویز کیا تھا۔ افغانیوں نے انگریز مقیم افغانستان کا قتلِ عام کر دیا۔ اس کے انتقام کے لیے برطانوی فوجوں نے غزنی اور کابل کو روند ڈالا۔ آج وہ وقت گزر گیا تھا کیونکہ روس میں جو انقلاب آیا تھا، اور لینن کی جو خارجہ پالیسی تھی اس کے تحت انگریز ایک دوسری جنگ عظیم کا آغاز کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح آزادی کا جو بیج مولانا محمود حسن نے بویا تھا وہ ہر جگہ رنگ لا رہا تھا۔ استقلالِ افغانستان نے تحریکِ خلافت اور اس کے ذریعہ تحریک آزادی ہند کو بروقت اور بے مثال طاقت بہم پہنچائی ضمناً اس کا تذکرہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔ اگرچہ انگریز کی شاطرانہ سیاسی چالیں ختم نہیں ہوئی تھیں اور کہہ رہی تھیں ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

# آل انڈیا مسلم کانفرنس

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں جیسا کہ پہلے کہا گیا تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے ہو رہے تھے اور مطالبہ ہو رہا تھا کہ مطابق پیمان وعہد خلافت مرکزیہ اسلامیہ ترکی کو بحال رکھا جائے اور اماکنِ مقدسہ جزیرۃ العرب بیت المقدس، فلسطین، بغداد، نجف اشرف وغیرہ کو خلیفہ کے زیرِ نگیں رکھا جائے خواہ ان کو مکمل آزادی دے

دی جائے۔ لیکن ابھی ترکی کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور عوام و خواص سب کا فیصلہ یہ تھا کہ حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند کے سربراہوں کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا جائے تاکہ لندن میں جو صلح کانفرنس کمیٹی تین بڑے ممالک امریکہ، برطانیہ اور فرانس پر مشتمل کام کر رہی ہے اس پر اثر پڑے اور فیصلہ وہ ہو جو ہمارے جذبات سے ہم آہنگ ہو۔ اسی لیے ملک بھر میں جلسے ہو رہے تھے جن میں تجویزیں پاس ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کا ایک عظیم الشان جلسہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے 18 ستمبر 1919ء کو لکھنؤ میں طلب کیا گیا[1] جس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہر طبقۂ خیال کے علماء و زعماء شریک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ مجمع بہت زیادہ تھا اور کوئی طبقۂ خیال ایسا نہیں تھا جس کے نمائندے شریک نہ ہوئے ہوں۔ اس کانفرنس کے داعیان حسب ذیل ہیں:۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| (1) آنریبل نواب ذوالفقار خاں | لاہور | (13) آنریبل محمد عبدالقدوس | مدراس |
| (2) مسٹر آغا محمد صفدر | سیالکوٹ | (14) آنریبل مولوی فضل الحق | کلکتہ |
| (3) مولوی غلام محی الدین | قصور | (15) آنریبل مولوی ابوالقاسم | بردوان |
| (4) مولانا ابوالوفا محمد ثناء اللہ صاحب | امرتسر | (16) مولوی مجیب الرحمٰن | کلکتہ |
| (5) آنریبل نواب سرفراز حسین خاں | پٹنہ | (17) ڈاکٹر مختار احمد انصاری | دلی |
| (6) آنریبل خواجہ محمد نور | گیا | (18) آنریبل سید رضا علی | الٰہ آباد |
| (7) آنریبل سید نورالحسن | بانکی پور | (19) حکیم محمد اجمل خاں | دلی |
| (8) آنریبل سر فضل بھائی کریم بھائی | بمبئی | (20) شیخ ظہور احمد بیرسٹر | الٰہ آباد |
| (9) حاجی جان محمد چھوٹانی | بمبئی | (21) مولوی محمد فائق | فیض آباد |
| (10) آنریبل سیٹھ ابراہیم ہارون جعفر | پونہ | (22) مولوی محمد یعقوب | مراد آباد |
| (11) سیٹھ عبداللہ ہارون | کراچی | (23) آنریبل سید آل نبی | آگرہ |
| (12) آنریبل سر اسد علی خاں | مدراس | (24) تصدق احمد شیروانی بیرسٹر | علی گڑھ |

[1] چودھری خلیق الزماں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کانفرنس ان کے ذہن کی پیداوار تھی PATHWAY TO PAKISTAN لیکن ان کے اس دعوے کی تائید کسی اور ذریعے سے نہیں ہوتی۔ یہ امر قرین قیاس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت خلیق الزماں ایل ایل بی کے طالب علم ہی تھے۔ اور اتنی بڑی کانفرنس کا طلب کرنا کسی طالب علم کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور پھر اس کانفرنس کے داعیوں کی فہرست بھی ان کے نام سے خالی ہے۔

(25) شیخ عبداللہ وکیل — علی گڑھ
(26) حافظ محمد حلیم — کانپور
(27) حافظ ہدایت حسین — کانپور
(28) مولوی فضل الرحمٰن وکیل — کانپور
(29) شیخ شاہد حسین تعلقدار گدیہ — بارہ بنکی
(30) منشی نواب علی وکیل — بارہ بنکی
(31) مولوی سید نبی اللہ بیرسٹر — لکھنؤ
(32) منشی محمد نسیم ایڈوکیٹ — لکھنؤ
(33) منشی احتشام علی۔ رئیس کاکوری — لکھنؤ
(34) چودھری نعمت اللہ وکیل — لکھنؤ
(35) ڈاکٹر محمد نعیم انصاری — لکھنؤ
(36) شیخ محمد علی حیدر خاں — لکھنؤ
(37) سید ظہور احمد وکیل — لکھنؤ

یہ بھی طے ہوا تھا کہ جملہ خط وکتابت سید ظہور احمد آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ کے نام ہونی چاہیے۔ یہ نام بذات خود بتلائیں گے کہ اس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے اشتہار کی سرخی تھی "مسلمانوں کے موت وحیات کا مسئلہ" اور اشتہار میں درج تھا۔

"یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ سلطنتِ ترکیہ اور خود ترکی و قسطنطنیہ کا مستقبل بحالتِ موجودہ کس قدر بیم و رجا کی حالت میں ہے صرف اسی تجویز پر قناعت نہیں ہے کہ ان مقبوضات کو جو دورانِ جنگ حاصل کیے گئے ہیں ہمارے خلیفہ اور سلطان سے لے کر شیرازۂ سلطنت منتشر کر دیا جائے بلکہ دیگر صوبہ جات اور تمام یورپین ترکی بلکہ خود قسطنطنیہ تک کے واسطے یہی تجویز ہے۔ یہ بھی زیرِ غور ہے کہ جو حصص اس طرح حاصل کیے جائیں وہ یورپ کی مسیحی طاقتوں میں سے کسی کے زیرِ انتظام کر دیے جائیں۔ جہاں تک اس حصۂ ملک کا تعلق ہے جس کو سلطان کے قبضہ میں چھوڑ دینا قرار پایا اس میں بھی ان کے اختیاراتِ شاہانہ محدود کر دینے کا خیال معلوم ہوتا ہے۔ ان تجاویز کو مجلسِ صلح نے جو لندن میں اپنے اجلاس کر رہی ہے، ابھی حتمی طور پر منظور نہیں کیا ہے لیکن یہ خبریں ملی ہیں اور اس امر کا اندیشہ ہے کہ برطانیہ اعظم بھی اگر سب نہیں تو ان میں سے بعض تجاویز کا ضرور موید ہے۔ کافی پر زور معروضات اور شکایات اس مسئلہ کے متعلق حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اور چند نائبینِ برطانیہ کی معرفت مجلسِ صلح کے سامنے بھی پیش کیے جا چکے ہیں مگر بظاہر اب تک ان کا حسب دلخواہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تازہ ترین اخبار دنیائے اسلام کے لیے دل شکن ہیں۔

"اکثر لوگ جو اس تجویز کے حامی ہیں اس امر کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے جذبات پر اس مسئلہ کا کس قدر گہرا اثر پڑے گا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ اور چند دیگر جماعتیں اپنا فرض انجام دے رہی ہیں۔ روپیہ کی امداد طلب کی گئی ہے اور مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے جو جذبات اس بارے میں ہیں ان کا اظہار کریں لہٰذا اس غرض کے لیے ہم ایک آل انڈیا کانفرنس کے انعقاد کی تاریخ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء دعوت دینے کی جرأت کرتے ہیں۔ اور مستدعی ہیں کہ تمام ممبرانِ مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتیں و نیز تمام مسلمان خواہ ان کا مسلک سیاسی ہو یا نہ ہو۔ اس خاص اجلاس میں شرکت کی کوشش کریں اور جو مسائل پیش ہوں ان میں حصہ لے کر مسلمانوں کے جذباتِ حقیقی کا جو انھیں سلطان ترکی اور ان کی سلطنت کے ساتھ ہیں۔ اظہار کریں۔"

اس کانفرنس کے منتخب صدر مسٹر ابراہیم معذور تھے۔ وہ بروقت نہ آسکے تھے اس لیے مولانا عبد الباری کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔

بعد ظہر مسٹر ابراہیم ہارون جعفر نے صدارت فرمائی اور اپنے خطبۂ صدارت کا ایک حصہ پڑھا اور مطبوعہ خطبہ بانٹ دیا گیا۔

کانفرنس کا پہلا ریزولیوشن خلافتِ عظمیٰ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کی بابت مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی نے پیش کیا اور مولوی سید حسن صاحب آرزو نے اس کی تائید کی۔ دوسرا ریزولیوشن جس میں ترکی کے بڑے علاقوں عراق، عرب، فلسطین، شام، آرمینیا وغیرہ کو ترکی کی سلطنت سے علیحدہ کر کے غیر مسلم حکمراں طاقتوں کے ماتحت رکھنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا اور جزیرۃ العرب کو غیر اسلامی اثرات سے پاک رکھنے پر زور دیا گیا تھا مولانا ثناء اللہ امرتسری ایڈیٹر "اہلحدیث" نے پیش کیا اور شیخ عبداللہ صاحب وکیل علی گڑھ نے اس کی تائید کی۔

تیسرا ریزولیوشن تھریس ایشیائے کوچک کو حتمی وعدے کے موافق ترکی بادشاہت میں برقرار رکھنے اور قسطنطنیہ میں دار الخلافہ قائم رکھنے کی بابت مسٹر عباس طیب جی بیرسٹر و چیف جسٹس ریاست بڑودہ نے ایک پرزور انگریزی تقریر میں پیش کیا اور سید جالب ایڈیٹر "ہمدم" نے اردو میں تائید کرتے ہوئے اس کا مفہوم بتلایا۔

چوتھا ریزولیوشن سمرنا سے یونانیوں کو نکالنے اور ان کے مظالم پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک دردناک و رقت انگیز تقریر میں پیش کیا جس نے مسلمانوں کی گزشتہ عظمت یاد دلا کر جلسہ کو تھوڑی دیر کے لیے مجلسِ ماتم بنا دیا۔

پانچویں ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ اوپر کے چاروں ریزولیوشن یہ ایں استدعا ہز اکسیلنسی وائسرائے

کو بھیجے جائیں کہ وہ اپنی سفارشں کے ساتھ ان کو امپیریل گورنمنٹ میں ارسال فرمادیں۔

چھٹے ریزولیوشن کے ذریعہ 17 اکتوبر کا دن ہندوستان میں فقط ترکی کے لیے دعائیں مانگنے اور جلسے کرنے کی غرض سے معین کیا گیا۔

ساتویں ریزولیوشن میں بمبئی کی خلافت کمیٹی کے کام پر اظہار پسندیدگی کیا گیا اور اس کی شاخیں صوبوں اور مختلف مقامات پر قائم کرنے کی ضرورت جتائی گئی۔ آخر میں مولانا عبدالباری نے جناب صدر اور بیرونی ڈیلیگیٹوں کا ان کے وقت صرف کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ اور جناب صدر نے چند اختتامی الفاظ میں اہلِ لکھنؤ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسہ کی کامیابی پر اظہارِ مسرت کیا اور کامیابیِ مقصد کی دعا مانگی۔[1]

اس آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کارروائی کو تفصیل سے درج کرنے کا منشا یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں واضح ہو جائیں۔ یعنی:۔

(1) تمام ہندوستان کے مسلمان خواہ ہزاکسلنسی کی کونسل یا ہزآنر کی کونسل کے ممبر ہوں، خان بہادر یا خطاب یافتہ امیرالامراء ہوں یا غریب ہوں، عالم ہوں یا کالج کے تعلیم یافتہ ہوں کسی گروہ یا طبقۂ خیال کے ہوں یکساں طور پر مضطرب تھے اور سب نے متحد اور منظم ہو کر اپنی آواز بلند کی جو ہندوستان کے کل مسلمانوں کی آواز تھی۔

(2) کوئی راہِ عمل سامنے نہ تھی اس لیے حکومتِ برطانیہ کی خوشامد اور عرضداشتوں اور وفود یا تقریروں اور جلسوں پر اکتفا کیا جا رہا تھا۔ صلح کانفرنس کے فیصلے کا بھی انتظار تھا لیکن اصل بات یہ ہے کہ کوئی راہِ عمل سامنے نہ تھی اس لیے صرف فریاد و فغاں سے کام لیا جا رہا تھا مگر اسی فریاد و فغاں سے آئندہ راہِ عمل پیدا ہونے والی تھی۔

جس جوش و خروش کا اظہار مسلمانانِ ہند نے 30 اکتوبر 1918ء کے التوائے جنگ سے چند ماہ کے اندر کیا اس کا خلاصہ بھی ہفتہ وار مشرق سے پیش کیا جاتا ہے، جو گورکھپور سے حکیم برہم کی ادارت میں نکلتا تھا اور برطانیہ کا غلام پختہ کار تھا۔ لیکن خبریں سب دیتا تھا اور اپنی مخالفت کی سطح اونچی رکھتا تھا "ہمدرد" میں مولوی فاروق ایم۔ ایس دیوانہ نے اس کا نام ایک تو "مشرک" رکھا تھا۔ لطیفہ یہ تھا کہ "مشرق" کے سرورق پر انگریزی میں بھی نام لکھا رہتا تھا جسے "مشرک" بھی پڑھ سکتے ہیں۔ دوسرا نام انھوں نے "مخالف قبلہ" تجویز کیا تھا جو مشرق و مغرب کے تضاد کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ تھا۔ بہرحال اس کا بیان مسلمانوں کے جوش و خروش کے بارے

---

[1] مشرق (گورکھپور): مورخہ 11 و 25 ستمبر 1919

میں انتہائی قابلِ اعتماد ہے۔ مخالف کی شہادت سے بہتر کون شہادت ہوتی ہے۔

مشرق کے مضمون کے جستہ جستہ فقرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

## یومِ دعا

گورکھپور:۔ حسب تحریک آل انڈیا مسلم کانفرنس انجمن اسلامیہ نے 17 اکتوبر 1919ء کو جامع مسجد میں دعا کا انتظام اور خلافت ڈے کے اظہار درد و غم کو عملی صورت میں لانے کے واسطے 16 اکتوبر 1919ء بوقت 5 بجے شام ہندو مسلمانوں کا ایک جلسہ بصدارت منشی عبداللہ خان شاکر علی صاحب بیرسٹر کی کوٹھی پر منعقد کیا جس میں بڑی تعداد میں ہندو بھائیوں نے شرکت کی اور باتفاق رائے یہ طے پایا کہ 17 اکتوبر 1919ء بروز جمعہ ہر ہندو اور مسلمان اپنے کاروبار بند کر دیں اور سلطنتِ ترکیہ اور خلیفۃ المسلمین کے دوام و بقا کے لیے دعائیں کریں چنانچہ 17 اکتوبر کو تمام ہندو مسلمانوں نے اپنے کاروبار بند کر دیئے اور محمد علی نگر اردو بازار، جعفرا بازار، صاحب گنج اور تمام شہر کے دوکانداروں نے اپنی اپنی دوکانیں تمام دن بند رکھیں۔ ہر مسجد میں بعد نماز جمعہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ دعائیں مانگیں۔ بازآں مسلمان اپنی اپنی مسجدوں سے نکل کر جامع مسجد میں مجتمع ہو گئے۔ مجمع اس کثرت سے تھا کہ یہاں تک تِل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ گورکھپور کہنہ کے مسلمانوں نے دعا کے بعد ایک لاکھ بار درود شریف اور ایک ہزار بار استغفار کا ورد کیا اور سب ننگے سر اور بادیدۂ پرنم تھے۔ ایک کثیر تعداد میں ہندو بھائی بھی تشریف لائے۔ گورکھپور کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی امامت جناب مولانا فاخر صاحب نے کی جو حسنِ اتفاق سے اسی روز پہنچ گئے تھے۔ بعد نماز دعائیں اس سوز و گداز سے کی گئیں کہ حاضرین کے قلوب بے چین ہو گئے اور بے اختیار چیخ چیخ اٹھے۔ کچھ ایسا سماں تھا جس کا اظہار لفظوں میں ناممکن ہے۔ اس کے بعد مولانا ممدوح نے ایک پُرمغز اور پُراثر تقریر غایت دعا و خلافت پر کی اور دبیں عام مسلمانوں نے خلافت کمیٹی قائم کر کے قاضی فراست حسین صاحب کو پریسیڈنٹ اور جناب حکیم مولوی محمد محسن صاحب اور مولوی ظہور الدین صاحب ممبر میونسپل بورڈ کو سکریٹری منتخب کیا۔ وائسرائے ہند اور خلافت کمیٹی کو تار بھیجے اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کی تجاویز منظور کی گئیں۔ بابو بھیچرن وکیل اور بابو جگدمبا پرشاد وکیل و ممبر میونسپل بورڈ و بابو نولکشور وکیل و ممبر میونسپل بورڈ اور دیگر ہندو معززین اور عوام نے بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا۔

**اعظم گڑھ:-** میں یوم خلافت و الحاح وزاری نہایت کامیابی اور جوش سے منایا گیا۔ تمام مسلمانوں نے روزہ رکھا تھا اور خلافت کی بقا کے لیے جامع مسجد میں دعا مانگی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کے ریزولیوشن منظور کیے گئے۔ تمام کاروبار ہندو اور مسلمانوں نے بند کر دیا تھا۔ کچہریاں بھی ڈھائی گھنٹے کے لیے بند کر دی گئی تھیں۔

**لکھنؤ:-** ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو یوم الحاح و دعا نہایت سرگرمی سے منایا گیا۔ ایک بجے نماز جمعہ شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر ہوئی جس میں دس ہزار مسلمانوں سے زائد نے شرکت کی اور خلافت ترکی کے قیام کی دعا مانگی۔ دیگر مساجد میں بعد نماز دعا خوانی ہوئی۔ پھر فوراً بعد نماز رفاہ عام اور اس کے پشت والے وسیع میدان میں شامیانہ کے نیچے اور باہر لوگ جمع ہوئے۔ تمام ہال اور شامیانہ لبالب بھرا ہوا تھا جس میں ہندو حضرات بھی شامل تھے۔ مسٹر مختار حسین صدر جلسہ نے پرجوش تقریر کی۔ تجاویز منظور ہوئیں اور طے ہوا کہ ان کی نقلیں وزیر اعظم انگلستان کو وزیر ہند و وائسرائے اور نواب لیفٹیننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ کے پاس بھیجی جائیں۔

**بنارس:-** بنارس میں ہندو مسلمانوں نے مشترکہ طور پر یوم خلافت منایا۔ روزہ رکھا گیا اور دعائیں مانگی گئیں۔ جامع مسجد میں نماز کے بعد دعا مانگی گئی۔ ایک مسجد میں عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں اہل ہنود بھی شریک تھے۔ تجاویز منظور ہوئیں اور ان کے نقول وائسرائے کو بھیجا جانا طے ہوا۔ ایک ہندو نوجوان نے تحریکِ خلافت میں ہندوؤں کی شرکت کا پرجوش یقین دلایا۔

**علی گڑھ:-** نہایت کامیابی کے ساتھ یوم الحاح وزاری منایا گیا۔ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں نے دکانیں بند کیں۔ بعد نماز جمعہ امام صاحب نے نہایت موثر مناجات پڑھی اور دعا مانگی۔ اس کے بعد دیگر مقررین نے تقریریں ارشاد کیں جن سے متاثر ہو کر بسا اوقات حاضرین اشکبار ہو گئے۔ تجاویز مطابق آل انڈیا مسلم کانفرنس پاس کیے گئے۔ ۷۷ الفاظ کا ایک تار وزیر اعظم برطانیہ و وزیر ہند وغیرہ کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔

**بنگال:-** یوم خلافت تمام اضلاع بنگال میں کامیابی کے ساتھ منایا گیا۔ کلکتہ میں تقریباً تمام ہندوستانی دکانیں بند کر دی گئی تھیں۔ نمازِ جمعہ کے بعد خلافت کے قیام بقا کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ اور سہ پہر کو ٹاؤن ہال میں مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں ہندو بھی شریک تھے۔ کثرت تعداد کی وجہ سے ہال کے باہر بھی جلسے ہوئے۔ صدارت ہال کے اندر آنریبل فضل الحق نے کی۔ تجاویز منظور ہوئیں۔

الٰہ آباد:۔ یومِ خلافت نہایت خاموشی کے ساتھ منایا گیا۔ دوکانیں بند تھیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں۔

دہلی:۔ دہلی کا ہر بڑا اور چھوٹا بازار ہڑتال کا المناک منظر پیش کرکے یہ آواز بلند کر رہا تھا کہ دہلی کے ہم ہندو اور مسلمان آج خلیفۂ اسلام کے اقتدار میں فرق آنے کی تجویز اور سلطنتِ ترکی کے حصے بخرے کرانے کی تجویز پر عملی اظہارِ ناراضگی کرتے ہیں۔ جامع مسجد بازار کی اناج منڈی، چاوڑی بازار، لال کنواں، چاندنی چوک، صدر بازار، کپڑے کی منڈیاں سب بند تھیں۔ ہر مسجد میں نہایت خشوع و خضوع سے دعائیں مانگی گئیں۔ مسلمانوں کی گریہ وزاری، آہ و بکا، شور و فغاں کی آواز آدھ گھنٹہ تک گونجتی رہی۔ پھر سب لوگ برہنہ سر ہوکر دعا میں مشغول ہوئے اور سربسجود ہوئے۔ پھر جلسہ ہوا جس میں ہندو مسلمان قریب ایک لاکھ کی تعداد میں شریک تھے۔ ہر مقرر نے نہایت آزادی اور بے باکی سے تقریر کی۔ سوامی شردھانند جی اور مسٹر آصف علی نے بھی تقریریں کیں۔

بمبئی:۔ مسلمانوں نے یومِ خلافت اور دعا روزے کے ساتھ منایا۔ ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ تمام منڈیاں بند رہیں۔ بھنڈی بازار، نل بازار، کرفورڈ مارکیٹ کی تمام دوکانیں خاص طور پر بند رہیں۔ مذبح خانے بھی بند رہے۔ ڈپٹی میونسپل کمشنر و سپرنٹنڈنٹ مذبح کے مجبور کرنے پر بھی قصائیوں نے صاف انکار کر دیا۔ ایک بجے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ہوئی۔ نماز سے دو گھنٹہ قبل لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اور تمام سڑکیں بند تھیں۔ مسجد میں تقریباً پچاس ہزار آدمی جمع تھے۔ رضاکاروں نے انتظام کیا۔ نماز کے بعد خلافت کے دنیوی اقتدار کے لیے خاص طور پر دعا مانگی گئی۔ اس کے بعد فوراً ہی مسجد میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ میاں حاجی جان محمد چھوٹانی صدر خلافت کمیٹی نے اس جلسہ کی صدارت کی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے مطابق تجاویز منظور ہوئیں اور اس کی نقل وزیر اعظم صاحب، وزیر ہند اور وائسرائے اور گورنر بمبئی کو تار سے بھیجنے کی ہدایت صدر کو کی گئی۔ مہاتما گاندھی کا شکریہ ادا کیا گیا۔ بہت سے ہندوؤں نے مہاریو بھوگ میں دعا مانگی۔ اسی طرح مئو ناتھ بھنجن، لکھنؤ، مرادآباد، بستی، دربھنگہ کے حالات اور جلسوں اور تجاویز کا ذکر ہے۔ بستی میں بابو روت رام استعفا نا ایڈوکیٹ نے بڑے جوش سے شرکت کی۔ کھیناسرائے، مرزاپور، دربھنگہ وغیرہ کا بھی اسی طرح ذکر ہے۔"[1]

---

[1] مشرق گورکھپور: مورخہ 23 اکتوبر 1919ء

# خلافتِ کمیٹی اور مہاتما گاندھی

23 نومبر 1919ء کو خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس دلّی میں ہوا تھا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس لکھنؤ کے بعد وزیرِ اعظم برطانیہ لائڈ جارج نے لارڈ میر کی دعوت میں ایک دلخراش تقریر کی جس سے یہ اندازہ ہوا کہ وزیر اعظم سلطنت برطانیہ اب اپنے اور حکومت برطانیہ کے وعدوں سے انحراف کرنے والے ہیں۔ اس تقریر نے مسلمانوں میں بہت جوش بھر دیا اور فوراً 23 نومبر 1919ء کو خلافتِ کانفرنس کا ایک جلسہ دلّی میں بڑی دھوم دھام سے مسٹر فضل الحق (بنگال) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مہاتما گاندھی بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے ان کے خیر مقدم کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور اتنا ہجوم خلائق تھا کہ چاندنی چوک اور جامع مسجد کی راہ دو گھنٹے میں طے ہوئی۔ اس اجلاس میں صرف خلافت کمیٹی کے قائم مقام شریک کیے گئے جو تمام صوبوں سے آئے تھے البتہ مہاتما گاندھی کو ان کی عظمت کی وجہ سے شریکِ جلسہ کیا گیا تھا۔ اور کچھ ان ہندو بزرگوں نے بھی شرکت کی تھی جن کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ سندھ، رنگون، بنگال، بہار، صوبہ متحدہ وغیرہ سے جو ہندو آئے تھے ان کو مسلمانوں نے خلافت کمیٹیوں کی طرف سے بھیجا تھا۔ شیعہ حضرات بھی اس میں شریک تھے۔

# مولانا محمد علی کی رہائی اور اجلاس کانگریس امرت سر

دسمبر 1919ء میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بیتول جیل سے رہا ہوئے۔ اسی وقت امرت سر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا اجلاس مقرر تھا اور اسی کے ساتھ خلافت کانفرنس بھی ہو رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کو کانگریس کی طرف سے دعوت دی گئی اور دونوں بھائی براہِ راست جلسہ گاہ میں پہنچے۔ مولانا محمد علی نے ایک طویل تقریر کی جو بے حد جذباتی اور پر اثر تھی۔ بقول مولانا عبد الماجد دریا بادی مولانا محمد علی کی شرکت گویا تمام مسلمانانِ ہند کی شرکت تھی کیونکہ وہ اپنے علم و فضیلت، اسلام نوازی، جرأتِ حق گوئی و بے باکی، عظیم ایثار و قربانی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن چکے تھے۔ بیتول جیل سے رہائی کے بعد وہ جن جن اسٹیشنوں سے گزرے وہاں ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا۔ امرت سر سے ان کا بلاوا دلّی کا ہوا اور وہ دلی گئے تو پبلک اُمڈ کر آگئی۔ اس طرح کے عظیم الشان مجمعے اور جلسے اس امر کی نشاندہی کرتے تھے کہ مسلمان سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہے۔ اب مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ خلافت مرکزیۂ اسلامیہ کی بربادی جزیرۃ العرب کی شکست و ریخت اور پوری دنیائے اسلام کی تباہی کی ذمہ داری برطانیہ پر ہے اور مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں سے مل کر ایک متحدہ قومی جمہوریہ برطانیہ کے اثر سے آزاد بنانی چاہیے۔ اسی سے برطانیہ کے غرور

اور اس کی طاقت کا توڑ ہو سکتا ہے۔

# آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس

۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ انھوں نے ایک ایسا جامع، پُرمغز اور حق گوئی و بے باکی سے مملو خطبہ دیا جس سے تمام ہندوستان کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ لیکن اس کے بین السطور میں وہی جذبۂ وفاداری کارفرما ہے۔ اگرچہ اس سے بغاوت بھی جھلک رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"حضرات! ہم آج ایک نہایت نازک زمانہ میں اس جگہ جمع ہوئے ہیں۔ وہ جنگِ عظیم جس میں مشرق و مغرب کی قومیں مبتلا تھیں اور جدال و قتال کی وہ گرم بازار تو ختم ہو گئی۔ لیکن باوجودیکہ جنگ ختم ہو گئی اب ہمارے ترددات کی یہ ابتدا ہے کیسے کیسے اہم معاملات کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مجلس صلح کے آخری فیصلے ایک طویل مدت کے لیے یہ طے کر دیں گے کہ حیاتِ انسانی کی تاریخ کیونکر لکھی جائے۔"

"مسلمانوں کے لیے یہ زمانہ خاص طور پر تشویش پیدا کرنے والا ہے۔ یہ صورت تیرہ سو برس کی تاریخ میں جو مدوجزر سے خالی نہیں، مسلمانوں کو کبھی پہلے پیش نہ آئی تھی جو آج نظر کے سامنے ہے۔"

"برطانوی حکومت نے ہمیشہ اپنے تمام بین الاقوامی معاملات اور تعلقات میں دنیا پر اپنے اس حق کو بار بار جتایا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ شاہِ انگلستان مسلمانانِ عالم کی سب سے بڑی تعداد پر حکومت کرتا ہے اس لیے برطانوی حکومت خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے۔"

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر حق کے ساتھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ملک معظم کی مسلمان رعایا اس امر کا مطالبہ کرے کہ شاہی وزراء جن کے ہاتھ میں سلطنتِ برطانیہ کی قسمت کی باگ ہے اپنے ان فرائض کو ادا کریں جو مسلمانانِ ہند سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہے۔"

اس کے بعد انیسویں صدی سے اسلام کی دنیوی طاقت کی تباہی اور یورپ کی پُرفریب پالیسی اور اسلامی سلطنتوں کے خلاف غارت گری اور قزاقی اور سفید فام اقوام کے کاموں پر حکومت کے جواز کے پُرفن طریقوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اسلامی سلطنتوں کا وہ غیر منقطع سلسلہ جو کبھی بحر اوقیانوس کے سواحل سے سلطنتِ چین

کے حدود تک پھیلا ہوا تھا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اب برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ یورپ میں بحرِ اسود کے شمالی ساحلی حصہ رومانیہ، یونان اور مقدونیہ بھی یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ افریقہ میں مراکش، الجزائر، تیونس، طرابلس اور مصر اسی طرح قفقاز اور وسط ایشیائی اسلامی ریاستیں ختم ہو گئیں۔ ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ کے درمیان ایران کے قیام و دوام و آزادی کے متعلق جو معاہدہ ہوا اس کے بعد اب ذرا دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیام و دوامِ آزادی ایک سیاسی مذاق سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ افریقہ اور عرب کے رہنے والے عرب بدوی بھی پھسلائے جا رہے ہیں کہ وہ اپنی صحرائی زندگی کو ترک کر کے یورپ کے طرب انگیز قحبہ خانوں کی عصمت فروش رقاصہ پر اپنی بدویت نثار کر دیں۔"

"آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترکی بھی جس نے صدیوں تک اسلام کی عزت کے لیے تلوار چلائی ہے اس خطرے میں مبتلا ہے اور عجب نہیں کہ ٹکڑے کر کے اسے تقسیم کر دیا جائے۔ عالمِ اسلامی کے لیے یہ نہایت تشویشناک وقت ہے۔"

اس کے بعد خلافتِ آلِ عثمان کے بارے میں ایک مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

"تاریخ میں یہ مسلمہ واقعہ ہے کہ ۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۸ء میں آلِ عباس کے آخری خلیفہ محمد عباسی نے جو مصر میں تھے جمہورِ اسلام کی رضامندی اور اجازت سے منصبِ خلافت و عالمِ اسلامی کی روحانی حکومت کو سلطنتِ عثمانیہ کے حکمران سلطان سلیم اعظم کی طرف منتقل کر دیا۔ اس منصبِ جلیلہ کے نشانات یعنی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، علم اور جبہ مبارک بھی خاندانِ عثمان کے پہلے خلیفۃ المسلمین کے سپرد کر دیے گئے اور وہ ان تبرکات کو استنبول لے آئے۔ ساتھ ہی محمد عباسی نے خود بھی وہیں اقامت اختیار کر لی۔ اس دن سے سلطنتِ عثمانیہ کا تاجدار خلیفۃ المسلمین سلطان الاسلام اور خادم الحرمین الشریفین کے محترم خطابات سے یاد کیا جانے لگا اور اسی دن سے آج تک دنیا کے تمام مسلمان شاہانِ آلِ عثمان کو اپنا روحانی امام اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین مانتے رہے۔ نہ صرف مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حرم محترم بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں اسلام کا نام لیا جاتا ہے ہر جمعہ کو اور عیدین کے خطبوں میں ان کے جاہ و اقبال اور ان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگی جاتی رہی ہیں۔ خود شریف مکہ نے جب ان کے پاس سلطان سلیم کا فرمان پہنچا تو بلا چون و چرا عثمانی خلافت کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دیا اور حکمِ عام دے دیا کہ دعاؤں میں بھی ترکی سلطان کا نام بحیثیت خلیفۃ المسلمین شامل کیا جائے۔

اس دن سے آج تک کسی شریفِ مکہ نے کبھی شاہان روم کے اقتدار کے متعلق انحراف نہیں کیا۔
خود شریف حسین سلطان المعظم کو مسلمانوں کا جائز خلیفہ اور خادم حرمین الشریفین تسلیم اور اپنی
اطاعت کا اعتراف کرتا رہا اور وہ عرصہ تک سلطانِ ترکی کی روحانی سیادت سے روگرداں
نہ ہو سکا لیکن جنگِ یورپ کے دوران اپنے موہوم ذاتی مفاد اور ناجائز نفسانی خواہشات کی وجہ
سے خلیفۂ اسلام کے خلاف جن کی خلافت کا وہ خود اور تمام عالمِ اسلامی اقرار کر چکا تھا
علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس بغاوت میں نہ صرف اخلاقی قوانین کی توہین کی گئی ہے بلکہ اسلامی
عقیدہ اور مذہبی تعلیم کی روح سے خدا اور رسول کے صاف و صریح احکام کی خلاف ورزی
کا ارتکاب کیا گیا۔"

اس کے بعد آیات و احادیث سے ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی خلیفہ سے بغاوت یا روگردانی کرے تو اس سے جنگ لازم ہے اور اس کا قتل کر دینا جائز ہے۔ مقامات مقدسہ پر خلیفہ کے اقتدار کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"خلیفۂ اسلام کا پہلا اور اہم ترین فرض مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت ہے حفاظت کا صحیح اور اصلی
مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ مقاماتِ مقدسہ پر سلطان کا قبضہ کامل اور ناقابلِ انکار
ہو اور وہ مقامات ہر طرح غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ و مامون ہوں۔"

"تمام دنیائے اسلام کا غیر متزلزل عقیدہ اور ان کا قولِ فیصل ہے کہ سلطان سلیم کے زمانہ سے
آج تک آلِ عثمان نے مقاماتِ مقدسہ کے متعلق اپنے فرائض بوجوہ احسن ادا کیے ہیں۔

"مسلمانوں کے اس دعوے کی صحت کا کہ ان کے سوا کوئی بھی اس معاملہ (یعنی کون خلیفہ ہو) کا
تصفیہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ خود برطانوی گورنمنٹ کی طرف سے اعلان کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ
29 نومبر 1917ء کو لارڈ رابرٹ سیسل نے دیوانِ عام میں مسٹر کنگ کے سوال کا جواب
دیتے ہوئے جو صاف اور صریح الفاظ استعمال کیا ہے وہ حسب ذیل اقتباس سے صاف
ظاہر ہوتے ہیں:۔

"ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کبھی اس رائے سے منحرف نہیں ہوئی کہ خلافت کا سوال
ایسا سوال ہے جس کا تصفیہ صرف مسلمان ہی اپنی رائے سے کر سکتے ہیں۔"[1]

اس کے بعد ڈاکٹر انصاری نے اس کی پر زور تردید کرتے ہوئے کہا کہ خلافتِ مقدسہ اسلامیہ سے عقیدت

---

[1] روئداد کارروائی دار العلوم جلد 99 صفحہ 3/92

ہرگز وطن دوستی اور ہندو مسلم اتحاد میں حائل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ہمارا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان ہمیشہ ایک سچا وطن پرست ہو گا۔ اگر ہم مسلمانان ترکی و ایران کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے طرز عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی حمایت کرتے ہیں، جو غیر ممالک میں مقیم ہیں کسی سے کم نہیں۔ وہ حق پرست یعنی احمد محمد کچالیہ ہندوستان ہی کا ایک مسلمان تھا جو جنوبی افریقہ میں عرصہ تک لڑتا اور آخر تک ہمارے حقوق کے اس شیر دل علمبردار مسٹر گاندھی کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتا رہا۔"

اس خطبہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ روشن کر دی اور غلامانِ فرنگ اخبارات اور افراد عرصہ تک بحث کرتے رہے۔ لیکن بایں ہمہ اس خطبہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے برطانیہ کا طوقِ غلامی پہن رکھا تھا۔ اور اب خیالات کے اس محبس سے نکلنے کی جدوجہد کرنے پر غور و فکر کرنے لگے تھے۔

اس کے بعد علمائے بنگال کا جلسہ چاٹگام میں زیر صدارت مولانا آزاد سبحانی ہوا جس کا ذکر آچکا ہے اس میں پہلے پہل علمائے اسلام نے جس میں مولانا عبدالباری بھی تھے، لیگ میں شرکت کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں بھی جس کا معرکۃ الآرا خطبہ ڈاکٹر انصاری کا آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں آپ دیکھیں گے کہ پہلا ریزولیوشن گورنمنٹ برطانیہ سے وفاداری کا پاس کیا گیا اور اس کے بعد اس کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ برطانوی افواج نے بیت المقدس اور نجف اشرف پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ایک تجویز اس بات کی منظور ہوئی کہ مسئلہ خلافت کے متعلق ملک معظم کی گورنمنٹ نے جو اعلان کیا تھا اس کا تصفیہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں اس کا خیال رکھا جائے۔

## عرب میں انگریزوں کی ریشہ دوانی

ادھر ہندوستان میں مسلمان اپنے اضطراب و بے چینی کو گورنمنٹ برطانیہ کی وفاداری کے اعلان کے ساتھ منظر عام پر لا رہا تھا اور جلسے اور عرضداشتیں مرتب کر رہا تھا۔ ادھر انگریز بھی غافل نہیں تھا۔ وہ ایک پر فریب رائے عامہ کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی کی ریشہ دوانیوں سے اسی زمانہ میں رعایائے فلسطین کا وفد زیر سرکردگی شیخ سلیمان تاجی فاروقی مرتب ہو کر ملک الحجاز (شریف مکہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے شریف حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم نے دشوار گزار راستے نہ صرف اس لیے طے کیے ہیں یا ہم نے سمندروں کی تکلیفیں نہ صرف اس لیے جھیلی ہیں کہ ہم اس حکومتِ اسلامی کے قائم کرنے والے کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو روشن کریں۔ وہ بانیِ سلطنت جو تاریخِ عالم میں پہلا عربی بادشاہ ہوگا، جس کے سر پر قومِ عرب کے زندہ کرنے کا سہرا رہے گا، جس نے خوابگاہِ عدم سے عربوں کو نکالا اور ان کی شجاعت و حمیت میں ایک نئی روح ڈالی۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے جس عمارت کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کو عجمی ہاتھوں نے تباہ کر دیا تھا خدا آپ کو بعافیت رکھے کہ اب حضور نے اس کو گرنے سے بچا لیا۔ بلکہ ہم نے یہ دور دراز سفر اس لیے گوارہ کیا ہے کہ ہم حضور والا پر یہ ظاہر کر دیں کہ فلسطین والے جو اس امت کے بہترین اعضاء سے ہیں اور جن کے دلوں میں آپ کی محبت ہے اور جو آپ کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ وقت سربکف ہیں اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ ہمارے وہ ہمسایہ اقوام جنھوں نے امن و انصاف کے خیال سے ہمیں ترکوں کے ہاتھوں سے چھڑایا خدانخواستہ پھر ہمیں پہلے سے بھی زیادہ کسی اور مصیبت میں نہ پھنسا دیں۔"

اسی زمانہ میں شریف مکہ نے حسبِ ذیل منشور عالم کریم اخبار القبلہ میں شائع کیا جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"خداوندا میں تیری حمد کرتا ہوں اور تیرے غیر متناہی المقامات پر تیرا شکر ہے اور ہدیۂ درود نامحدود تیرے بندے خاتم الانبیاء رحمت جہانیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے۔ پچھلے دنوں کثرت سے ایسے خطوط میرے پاس آئے ہیں جن میں امیر المومنین کے لقب سے مجھے یاد کیا گیا ہوں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ میری باعزت قوم کی خصوصیات میں سے ہے۔ مگر چونکہ یہ لقب اور خطاب لفظ خلافت کے ہم معنی ہیں جس کی بحث بارہا میرے فرامین میں اسی اخبار القبلہ کے ذریعہ شائع ہو چکی ہے۔ لہٰذا ان باعزت حضرات سے میری التجا ہے کہ اپنے عنایت ناموں میں مجھ کو انھی الفاظ سے یاد کریں جن پر عراق و یمن و حلب و شام کے عربوں نے میری بیعت کی ہے خدائے قادر و توانا کے انعامِ عامہ سے امید ہے کہ لوگوں کے خیالات اور ان کی امیدیں جو میرے متعلق ہیں وہ صحیح ہوں اور پوری ہوں اور توفیقِ الٰہی ہر حال میں ہمارے اور ان کے شریکِ حال رہے۔"

یہ تھا وہ کھیل جو انگریز کھیل رہا تھا۔ خلافت سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے امیر حبیب اللہ کو خلیفۃ المسلمین

بنانے کا خواب دکھا رہا تھا اور ادھر شریف مکہ کو۔ شریف مکہ کا اعلان "حسن طلب" اور منافقت کا ایک نادر نمونہ ہے۔

مولانا محمود حسن کے پاس ایک شخص جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے وقت عربی لباس پہن کر آیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس لباس سے نفرت ہے کیونکہ یہ غداروں کا لباس ہے۔

# صلح کانفرنس لندن

۲۴ جنوری ۱۹۱۹ء سے لندن میں صلح کانفرنس نے کام شروع کر دیا تھا جس میں دنیا کا بالعموم اور ترکی کا بالخصوص فیصلہ ہونا تھا۔ اس کانفرنس سے پہلے مجلس اقوام قائم کی جا چکی تھی۔ اس صلح کانفرنس کے صدر موسیو کلے مینشو وزیر اعظم فرانس تھے اور بڑی بڑی سلطنتوں کے دو دو نمائندوں کا شریک کرنا طے ہوا تھا اور بڑی سلطنتوں نے اپنے نمائندوں کے نام بھی بھیج دیے تھے اور مسٹر کلے مینشو نے چھوٹی سلطنتوں کو اپنے نمائندے بھیجنے کے لیے رات ہی میں مشورہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔ بڑی سلطنتوں میں اٹلی بھی شامل کیا گیا۔ لندن کانفرنس میں مختلف کمیٹیاں قائم کرنے کی بھی تجویز کچھ لوگوں نے پیش کی تھی۔

موسیو کلے مینشو کے اس اعلان سے چھوٹی قوموں میں کچھ اختلاف پیدا ہوا اور مطالبہ کیا گیا کہ بلجیم کے دو نمائندے لیگ اقوام اور مزدوروں کی کمیٹی میں ہونے چاہئیں اور ایک ایک نمائندہ بندرگاہوں دریاؤں، اصلاح اور سزا کی کمیٹیوں میں ہونا چاہیے۔ برازیل کے نمائندوں کا مطالبہ تھا کہ ہمارا ایک نمائندہ مجلس اقوام کی کمیٹی میں ہونا چاہیے۔ کناڈا کی طرف سے کہا گیا کہ چھوٹی قوموں میں ایک نمائندہ کی حیثیت سے ہمارے لیے مجلس اقوام کے دول عظمیٰ کی نسبت زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ سرویا کی طرف سے ہر کمیٹی میں بلجیم کے مثل نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا۔ یونان کی طرف سے کہا گیا کہ اس کے نمائندے ہر کمیٹی میں ہونے چاہئیں۔ پرتگال کی جانب سے کہا گیا کہ اصلاح اور درستی کی کمیٹی میں اس کا نمائندہ ہونا چاہیے۔ چیکوسلواکیہ کی طرف سے کہا گیا کہ سب کمیٹیوں میں ہمارے نمائندے ہوں۔ رومانیہ کی طرف سے کہا گیا کہ اقوام کی لیگ میں بندرگاہ اور سمندری راستوں کی کمیٹیوں میں ان کے نمائندے لیے جائیں۔ سیام نے کہا کہ کمیٹیوں میں جو معاملات طے ہونے والے ہیں ان سے سیام کا گہرا تعلق ہے۔ چین نے مجلس اقوام میں اپنا ایک نمائندہ مانگا اور کہا کہ ڈیڑھ لاکھ چینی برطانوی فوج کے ساتھ میدانِ فرانس میں موجود ہیں۔

موسیو کلے مینشو نے جواب دیا کہ دول عظمیٰ کے کل سپاہی بیس لاکھ دورانِ جنگ تھے اور لاکھوں مقتول ہو گئے اس لیے وہ دنیا کے مستقبل کا خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن مجلس اقوام کے متعلق انھوں نے مناسب سمجھا ہے کہ چھوٹی قوموں کو بھی شرکت کا موقع دیا جائے تاکہ امن و صلح کے کام متحدہ طور پر انجام پائیں۔

ہندوستان انگلستان میں ضم تصور کیا گیا اور اس کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ یہ تھی وہ صلح کانفرنس جس سے مسلمانانِ ہند اب بھی اپنی آس لگائے ہوئے تھے جس میں فیصلہ کا حق طاقت والوں کو دیا جا رہا تھا۔ اور انعامات طلب کیے جا رہے تھے۔ موسیو کلے مینشو نے یہ کہہ کر چھوٹی سلطنتوں کو جھڑک دیا تھا کہ دولِ عظمٰی نے بیس لاکھ فوج میدان میں اتاری جس میں سے ایک لاکھ مقتول ہوئے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم خود لڑائی جیت سکتے ہیں کسی کی مدد کی ہم کو کیا ضرورت تھی تو پھر بھلا ہندو اور مسلمان غلاموں کی کیا پروا ہوتی ہیں جیسا کہ آگے آئے گا عرصہ تک مسلمان اس خیال سے لپٹے رہے کہ صلح کانفرنس سے مطلب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فریب دینے کے لیے فلسطین کی رعایا کا وفد اور شریف مکہ کا اعلان کافی تھا۔ اسی کے ساتھ انگریز شیعہ حضرات اور احمدیوں کو ہندوستان میں خلافت کے اصول کے خلاف آواز اٹھانے کو اکسا رہا تھا اور اس نے اپنے حلقہ بگوشوں کو ہشکار دیا تھا کہ وہ خلافت کے مسئلہ کو متنازعہ فیہ مسئلہ بنا کر دماغوں میں الجھاؤ اور تذبذب پیدا کر دیں۔

مجلسِ اقوام کے قیام کی تجویز مسٹر ولسن صدرِ امریکہ نے پیش کی۔ کھچڑی پکی پکائی تھی۔ مقصود تو دنیا کو لوٹنا تھا مگر ان کو مجلسِ اقوام کے ذریعہ امن اور انصاف کے ادعا کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کی حقیقت کا راز یوں افشا کیا ہے ؎

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن      دردمندان جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند      بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

مسٹر ولسن فلسفۂ قانون کے پروفیسر تھے۔ وہ 1912ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے جمہوریہ امریکہ کے صدر منتخب ہوئے۔ 18-1914ء کی جنگ میں پہلے مسٹر ولسن غیر جانبداری کے قائل تھے اور انھوں نے درمیان میں پڑ کر جنگ رکوانے کی بڑی کوشش کی۔ نومبر 1916ء میں وہ دوبارہ جمہوریہ امریکہ کے صدر ہوئے اور اپریل 1917ء میں کانگریس کا ایک اسپیشل اجلاس طلب کر کے 8 جنوری 1918ء کو انھوں نے اپنے مشہور چودہ نکات دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے پیش کیے۔ لیکن وہ صلح کانفرنس میں اتحادیوں سے اپنے چودہ نکات منوانے میں ناکام رہے۔ ذیل میں کانفرنس کے اندر ان کی پہلی تقریر کے جستہ جستہ فقرے درج کیے جاتے ہیں:۔

> "میں گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم گورنمنٹوں کے نہیں بلکہ اقوام کے قائم مقام ہیں۔ یہ کافی نہیں ہے کہ ہم گورنمنٹی حلقوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں بلکہ ہم کو بنی نوعِ انسان کی رائے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔۔۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ انصاف کا انتظام کریں اور ایک دائمی امن و امان کو بہم پہنچائیں۔ گیا یہ چونکا دینے والا واقعہ نہیں ہے کہ سائنس کے عظیم انکشافات

اور لیبوریٹریوں میں لوگوں کا مطالعہ اور لیکچروں کے کمروں میں حاصل ہونے والی علمی ترقیاں اس وقت تہذیب کی بربادی کے لیے کام میں لائی جارہی ہیں۔ اس جنگ میں شریک ہوتے ہوئے امریکہ نے ایک لمحہ کے لیے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ وہ یورپ، ایشیا یا دنیا کے کسی حصّہ کی سیاست میں مداخلت کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ ساری دنیا اس سے واقف ہے کہ صرف ایک ہی مقصد ہے جو اس جنگ میں امریکہ کی شرکت کا باعث ہوا ہے۔ یہ مقصد ہر جگہ اور ہر قسم کے بنی نوعِ انسان کی آزادی اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔"

مسٹر ولسن دنیا کو دھوکہ دے رہے تھے یا خود فریب خوردہ تھے؟ یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے مگر امریکہ کا موجودہ رویہ کی روشنی میں مندرجہ بالا بیان کس قدر دلچسپ ہے۔ بہر حال لائڈ جارج، کلے مینشو اور دیگر لوگوں نے زبانی تائید کی اور کرتے ہی کیا۔!

# پانچواں باب

# تاجِ برطانیہ کی وفادار رعایا کی عرضداشتیں

## انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل کا جلسہ

فروری ۱۹۱۹ء کے اوائل میں انجمن موید الاسلام فرنگی محل کا ایک جلسہ زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ احکام اسلامیہ کی رو سے بجز موجودہ سلطان ٹرکی کے کوئی دوسرا خلیفہ نہیں اور شریعتِ اسلامیہ کی رو سے خلافت کے باب میں امتِ محمدیہ کے سوا غیر مسلم کی رائے بے اثر ہے۔ مسلمانوں نے جہاں کہیں اس بارے میں آواز بلند کی ہے وہ شریعتِ اسلامیہ کے بالکل مطابق ہے اور یہ جلسہ اس کی تائید کرتا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ جلسہ اس تجویز سے اتفاق کرتا ہے کہ ایک فتویٰ احکامِ خلافت سے متعلق حدودِ عرب و ممالکِ اسلامیہ کے علماء کرام سے دستخط کرا کے اور مشیر قانون سے مشورہ کر کے گورنر جنرل اور وزیر ہند کی خدمت میں روانہ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ جو خیالات اسلامی انجمنوں نے ظاہر کیے ہیں وہ احکام شریعت کے بالکل مطابق ہیں اگر کوئی شخص اس کے خلاف حکم ظاہر کرے تو وہ شریعتِ اسلامیہ کا حکم نہ سمجھا جائے اور حکومت کو غلط فہمی نہ ہونے پائے اس جلسے کی تجویز ع۴ لفظاً بلفظ ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

"یہ جلسہ اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مذہبی رواداری ہماری بناء اطاعت ہے حضور ملکِ معظم کی گورنمنٹ سے اظہار وفاداری کرتے ہوئے یہ جتاتا ہے کہ ممالکِ اسلامیہ کا عموماً اور بلادِ مقدسہ کا جس میں قسطنطنیہ بھی داخل ہے خصوصاً تختِ خلافت سے وابستہ رہنا مذہبِ اسلام کی رو سے ایک نہ بدلنے والا حکم ہے۔ لہٰذا اس اسلامی حکم کی رو سے مجلس ہٰذا گورنمنٹ برطانیہ سے پورے زور کے ساتھ مستدعی ہے کہ وہ اپنا رسوخ دا ثر صلح کانفرنس

میں بایں غرض استعمال کرے کہ جو ممالک اس جنگ میں سلطان المعظم سے علیحدہ ہو گئے ہیں وہ بجنسہٖ سابقہ حقوق کے ساتھ سلطان المعظم کو واپس کر دیے جائیں۔ ورنہ بغیر اس کے صلح مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی ہے۔"

وہی اظہار وفاداری، وہی امید گورنمنٹ برطانیہ سے کہ صلح کانفرنس میں وہ اپنے اثرات مسلمانوں کے موافق استعمال کرے گا اور اپنے وعدوں کو پورا کرے گا، یہاں بھی موجود ہے جو ڈاکٹر انصاری کے خطبۂ استقبالیہ مسلم لیگ کانفرنس میں نظر آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ وہی بے چینی، وہی اضطراب اور وہی تلاش راہ عمل بھی بین السطور میں نمایاں ہے۔

## مقیم لندن حضرات کی عرضداشت

یہی طریق کار لندن میں ہز ہائی نس سر آغا خاں، رائٹ آنریبل سر امیر علی، مسٹر محمد مارماڈیوک پکھتال، آنریبل عباس علی بیگ، مسٹر عبداللہ ابن خان بہادر یوسف علی، مسٹر رفیق اور مسٹر ایچ اے اصفہانی وغیرہ کا بھی تھا۔ ان لوگوں نے تیس دیگر حضرات کے ساتھ ایک میمورنڈم مسٹر بالفور وزیر خارجہ حکومت برطانیہ کو دیا تھا جس کا جواب مسٹر بالفور نے نہایت خطرناک دیا تھا۔ اس میمورنڈم میں لکھا گیا تھا کہ:۔

(1) ہم ذیل کے دستخط کنندگان مسلمان رعایائے حضور ملکِ معظم بہ ادب تمام حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کے سامنے یہ عرضداشت پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے ان تجاویز کو جو ابھی حال میں مختلف غیر ذمہ دار حلقوں سے قسطنطنیہ کے مستقبل کی نسبت مختلف اخبارات میں پیش کی گئی ہیں نہایت تردد و تشویش کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ تجویزیں اس قسم کی ہیں کہ قسطنطنیہ موجودہ حکمران کے ہاتھ سے نکال لیا جائے اور کئی عیسائی حکومتوں یا کسی ایک عیسائی سلطنت کے ہاتھ میں اس کا انتظام دے دیا جائے اس لیے قبل از قبل ہم لوگ یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے کا مطلب ان قوی اصولوں کو توڑنا ہوگا جن کی بنا پر اتحادیوں نے جنگ میں شرکت کی ہے اور اس سے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں تشویش اور بے چینی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔

(2) چار صدی کے اندر قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور اب ہر اعتبار سے وہ ایک اسلامی شہر ہو گیا ہے۔ تمام شہر اسلامی درس گاہوں اور ایک ایک چپہ اسلامی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر آبادی ترکی النسل لوگوں کی ہے جو مذہباً مسلمان

میں جس کا کچھ عرصہ قبل دارالعوام میں اعتراف کیا گیا تھا۔

(3) وزیراعظم نے کچھ عرصہ قبل اعلان کیا تھا کہ "ترکی کی حکومت اسی طرح برقرار رہے گی اور قسطنطنیہ ان کے مقبوضات کا دارالسلطنت رہے گا"۔ مسلمان جنھوں نے سلطنت کی حمایت میں جان و مال سے مدد کی ہے اب اس امید کے قائم کرنے کے مجاز ہیں کہ قومی اتحاد و آزادی کے اصول کا ترکی کے ساتھ ویسا ہی لحاظ کیا جائے گا جیسا یورپین اقوام کے ساتھ۔ اگر کوئی اور صورت اختیار کی گئی تو اس کا بہت برا اثر پڑے گا اور مسلمان یہ خیال کریں گے کہ جن اعلیٰ اصولوں کی بنا پر ہم اپنی وفاداری پر قائم رہے اور ہر موقع پر ان کے دوش بدوش لڑتے رہے ان کا پاس نہیں کیا جاتا ہے اور ترکی کے ساتھ اصولی برتاؤ محض اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ ایک اسلامی سلطنت ہے۔

(4) ایشیا میں شام کی شمالی سرحد سے بحیرہ ایجین اور بحیرہ اسود تک اور جنوب میں آذربائیجان کی سرحد تک اندازاً ایک کروڑ نوے لاکھ 21 ہزار ترکی آبادی ہے جو نسلاً ترک ہیں اور مذہباً مسلمان۔ تھریس کی بھی بالکل یہی حالت ہے۔ وہاں بھی زیادہ تر ترکوں کی آبادی ہے۔ ہم سب بکمال ادب عرض پرداز ہیں کہ یہ کل سلطنت مع قسطنطنیہ جو اس کا دارالسلطنت ہے ترکی قوم کے ہاتھ میں وزیراعظم کے اعلان کے بموجب رہنے دینی چاہیے۔

علمائے ربانی، بالخصوص مولانا محمود حسن ان حضرات سے زیادہ بصیرت و دیدہ وری رکھتے تھے جو انگریز کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور ان سے کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔ لیکن یہ تحریک خلافت کا صبوری دور ہے اور وہ وقت آنے والا ہی تھا جب یہ کہا جا سکے کہ:۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

# وزیرِ ہند کا جواب

فروری 1919ء کے آخر میں وزیرِ ہند نے مسلم لیگ کی چند تجاویز کا، جو ان کے پاس بھیجی گئی تھیں جواب دیا اس کا متن حسب ذیل ہے:۔

"مسئلہ خلافت کے بارے میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی رائے وہی ہے جس کا وہ بار بار اعلان کر چکی ہے اور وہ اس رائے پر قائم ہے کہ 'خلافت کا مسئلہ اس قسم کا ہے کہ جس کا فیصلہ صرف مسلمانوں ہی کو بلا مداخلت غیرے کرنا چاہیے'۔ میں اس موقع پر ان خیالات کی جو

مسلم لیگ کے ایک ریزولیوشن میں ظاہر کیے گئے ہیں کہ گورنمنٹ نے اپنے ان وعدوں کی جو مقامات مقدسہ کے بارے میں کیے گئے تھے خلاف ورزی کی ہے، بڑے زور سے تردید کرتا ہوں جن ایام میں کہ ہز مجسٹی کی فوجیں ان علاقوں پر جہاں کہ مقاماتِ مقدسہ واقع ہیں قبضہ کیے پڑی تھیں اس وقت نہ صرف اس وعدے کی لفظ بلفظ پابندی کی گئی بلکہ اس قسم کے ذرائع اختیار کیے گئے اور کیے جارہے ہیں کہ ہمارے قبضہ کے ایام میں ان مقاماتِ مقدسہ کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے۔ آخر میں میں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جن اہم معاملات کا صلح کانفرنس میں فیصلہ کیا جائے گا ان کے متعلق ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے جو خیالات ہیں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ ان کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ گورنمنٹ ہند کو یہ اعلان کرنے کی اجازت دیتی ہے کہ ہز مجسٹی کے قائم مقام صلح کانفرنس میں ان خیالات پر پوری توجہ فرمائیں گے۔"

مسلمانوں کو فریب تازہ کھانے کا ایک اور موقع ملا۔ البتہ وہ اس سے بہت بددل ہوئے کہ مسلمانانِ ہند کو صلح کانفرنس میں نمائندگی نہیں دی گئی جس کا انھوں نے مطالبہ بھی کیا تھا۔

انگریزی حکومت غرور کے نشہ میں چور تھی۔ ہم دکھلا چکے ہیں کہ مسلمان ہر جگہ اپنی وفاداری کا اعلان کرکے صرف عرضداشت پیش کرتے تھے لیکن جلسوں کو بند کرنا، ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کرنا، یا اوقات جلسہ میں گورا نوجوں کا مشین گن کے ساتھ خائف وہراساں کرنے کے لیے مارچ کرنا روزمرہ کا واقعہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر صوبہ میں اور صوبوں کی شاخیں ضلعوں میں قائم ہو چکی تھیں۔ شاید ہی کوئی قصبہ یا قریہ ایسا ہو جہاں سے خلافتِ مقدسہ اسلامیہ کے لیے آواز بلند نہ ہوئی ہو۔ کاسہ لیسانِ حکومت اور غلامانِ ازلی بھی خلافت اسلامیہ کی بقا اور اماکنِ مقدسہ کے تحفظ کی زبانی تائید کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ البتہ وہ پرپیچ طریقوں سے برطانیہ کے وعدوں کے ایفاء پر تکیہ کرنے کی تعلیم دیتے تھے اور بار بار مصلحِ قوم بن کر فرماتے تھے کہ خواہ مخواہ شورش سے کوئی فائدہ نہیں اس سے قوم نقصان میں پڑ جائے گی۔ وہ یا تو یہ کہتے تھے کہ برطانیہ کے وعدوں پر بھروسہ کیا جائے یا یہ کہتے تھے کہ ہم کو صرف دعا کرنی چاہیے۔ وہ دن دور نہیں تھا کہ یہ خس وخاشاک پبلک کے جوش کے سیلاب میں بہہ جانے والا تھا۔

## یہودی اور فلسطین

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے انگریزوں نے یہودیوں کو فلسطین میں وطن دینے کا وعدہ کرکے ان سے ایک خطیر رقم جنگِ عظیم میں نرپنج کرنے کے لیے حاصل کی تھی اور یہودی اندر اندر اپنا کام کر رہے تھے جیسا کہ

اس سے پہلے ذکر ہوا حکومتِ برطانیہ نے ایک رائل کمیشن بھی اس بارے میں بٹھایا تھا لیکن یہ سب ہاتھی کے دانت تھے۔ یہودی خوب جانتے تھے کہ فیصلہ ان کے موافق ہوگا جس کی بہت سی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ ہے کہ امریکا پر یہودیوں کا بڑا اثر ہے اور صدر کے الکشن میں وہ ہمیشہ ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دوسرے برطانیہ کی جو پالیسی خلافتِ اسلامیہ کو تباہ کرنے اور عرب کو ریزہ ریزہ کرنے کی تھی اس کی روشنی میں یہودیوں کو فلسطین میں وطن دے کر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں کل عرب کو مبتلا کر سکتے تھے تاکہ ان کو پھر منظم ہو کر باشعور فیصلہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ جب اسرائیلی حکومت بنی تو سابق صدر جمہوریہ امریکہ نے کہا "اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلسل جنگ جاری رہے"۔ چنانچہ یہودیوں کو جو اطمینان تھا اس کا اندازہ ایک بیان سے ہوگا جو پیرس کے ایک تار مورخہ 2 مارچ 1919ء کے ذریعہ نشر ہوا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ "یہودیوں نے اعلان کیا ہے کہ ان کو اعتماد ہے کہ یہودیوں کے جو مطالبات صلح کانفرنس میں پیش ہوئے ہیں اور جن میں یہ خواہش کی گئی ہے کہ فلسطین میں ایک یہودی قومی حکومت قائم کی جائے وہ تسلیم کر لیے جائیں گے۔ تفصیلات کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ لیکن یہودی مطمع نظر کی کامیابی نمایاں ہے۔ جب یہودی کونسل کے کمرے سے چلے گئے تو مسٹر بالفور نے ایک پیام بھیج کر ممبروں کو ان کی کامیابی پر مبارک باد دی۔

فرانس کے نمائندے مسٹر نارڈیو نے بیان کیا کہ فرانس اس پر معترض نہیں ہے کہ برطانیہ مجلسِ اقوام کی طرف سے فلسطین میں ایک حکم بردار طاقت قائم کرے۔

## اخبارات کے تبصرے

اس وقت کے اخبارات کا تبصرہ جو شروع اپریل تک ہوا ذیل میں اس لیے درج کیا جاتا ہے کہ ایک ایک واقعہ کی تفصیل بیان کرنا محال ہے۔ اور اس سے عیاں ہوگا کہ سرکار برطانیہ کی وفادار رعایا ہونے کا خیال عام تھا۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی ایسا تراشہ نہیں ہے جس میں علمائے اسلام سے لے کر عام باشندگانِ ملک تک نے مسائلِ حاضرہ پر توجہ نہ کی ہو چنانچہ لکھنؤ، کلکتہ، دہلی، مرادآباد، بریلی اور بہت سے شہروں کے بعد حیدرآباد، سندھ اور بمبئی میں جو جلسے علماء اور فضلاء کے ہوئے ہیں، انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانانِ ہند مسئلہ خلافت، مسئلہ بقائے ترکی، مسئلہ اماکنِ مقدسہ کے متعلق ہم آواز ہیں۔ بمبئی کے جلسہ میں جو ریزولیوشن پیش ہو کر پاس ہوئے ہیں ان میں خلافت کے بعد مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، نجف اشرف

کربلائے معلیٰ، کاظمین شریفین، بغداد شریف، بقائے سلطنتِ ترکی اور قسطنطنیہ کا ترکوں کے قبضہ میں رہنا سب پر بحث ہوئی اور بالاتفاق یہ طے پایا کہ سلطنتِ ترکی کے زیر اثر سب کو رہنا چاہیے اور صلح کی کانفرنس میں جو تقسیم کی جائے اس میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ جس کے حدود اسلامی فقہ نے معین کر دیے ہیں، ترکی سلطنت کے زیر اقتدار رہیں۔ کیونکہ سلطان ترکی خلیفۃ الرسول ہیں۔ چونکہ سلطنتِ برطانیہ سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اس لیے وزرائے برطانیہ کو لازم ہے کہ مستقل طور سے اس بات کی کوشش کریں کہ سلطنتِ برطانیہ اور اسلامی حکومتوں کے درمیان تعلقات سیاسی قائم رہیں اور اتحاد و اتفاق کی کوشش عدل و ایمان اصول پر مبنی ہو۔

ان سب تحریکات میں بمبئی کے بڑے بڑے مسلمان مثلاً مولوی رفیع الدین صاحب بیرسٹر مولوی عبدالرؤف صاحب، مسٹر محمد میاں صاحب، مسٹر رحمت اللہ کریم بھائی، حکیم مولوی سید محمد یوسف صاحب اصفہانی۔ مرزا علی محمد خاں صاحب، مسٹر بدرالدین عبداللہ، مسٹر عبدالحسین صاحب جان تبریا، مولوی عبدالمنعم صاحب خطیب جامع مسجد بمبئی، آنریبل مسٹر شریف دیوجی کانجی، مسٹر ہادی طیب جی، مسٹر محمد حسن صاحب مسٹر سید غلام مقبئی محمد رفیع اور مسٹر حاجی عبدالکریم وغیرہ شریک تھے۔ اس جلسہ کے صدر میاں جان محمد چھوٹانی تھے۔ اس جلسہ میں ایک بڑا اور اہم ریزولیوشن یہ پیش کیا گیا کہ صلح کی کانفرنس میں مسلمانانِ ہند کے جذبات کا اظہار کر دیا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قائم مقام شریک کیا جائے۔

"علمائے سندھ کے جلسہ میں جناب مولوی خیر امام الدین صدر تھے۔ اس جلسہ میں بھی اسی قسم کے ریزولیوشن پیش کیے گئے اور جلسہ میں بہت جوش تھا۔ حضور وائسرائے کو تار دیا گیا کہ جزیرۃ العرب سے برطانوی فوج گورنمنٹ ہٹالے۔"

اس میں آگے چل کر مسلمانوں کی وفاداری کا تذکرہ ہے اور حضور وائسرائے کی مدح کر کے یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کو صلح کانفرنس میں نمائندگی دی جائے۔ اگر ہم عالیجناب مسٹر مینٹیگو صاحب بہادر کی رائے تسلیم کر لیں کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کا انتظام بھی صلح کی کانفرنس میں ہو رہا ہے تو اس میں ذرا شک نہیں کہ تمام مسلمانانِ دنیا تاج برطانیہ کے سامنے سرِ عقیدت جھکا دیں گے کہ اس نے جس انصاف اور عدل کے لیے جنگ کی تھی اس

کا لحاظ آخر وقت تک رکھا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ضرور مسلمانانِ عالم کو اس بات کے کہنے کا موقع ملیگا کہ اتحادیوں نے کہا کچھ کیا کچھ۔"[1]

# تمام دنیا میں وفد لے جانے کا خیال

بمبئی کی ایک کانفرنس میں یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ ایک عام کانفرنس اہل اسلام کی دلی میں منعقد کی جائے جو تمام مسائل حاضرہ پر گفتگو کرکے ایک وفد مرتب کرے اور وہ وفد حضور وائسرائے کے پاس حاضر ہو کر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے اور اسی وقت مولانا عبدالباری، نواب ذوالقدر جنگ اور ڈاکٹر انصاری نے ایک وفد مسلمانوں کا لے کر تمام دنیائے اسلام میں جانے کی تجویز پیش کی تاکہ ہر مقام کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ کریں اور دیکھیں کہ مسلمانوں کی عام حالت کیا ہے۔ اور مسلمانانِ عالم کے جذبات کا کیا عالم ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام کو متفق کرکے صلح کانفرنس پر دباؤ ڈالا جائے۔ یہ وفد مرتب نہ ہو سکا اور نہ گیا لیکن اس سے بھی وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی مسلمانوں کا عظیم اضطراب اور اب بھی صلح کانفرنس سے انصاف کی امید۔

# ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز

ندوۃ العلماء نے اپنے بلگام کے جلسہ میں حسب ذیل تجویز منظور کی۔

عہ۹ "ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ جو علما کا قائم مقام ہے اپنا مذہبی فرض خیال کرتا ہے کہ یہ ظاہر کردے کہ بروئے احکامِ مذہبی یہ ضروری ہے کہ جملہ مقامات مقدسہ حجاز، بیت المقدس، کربلا، نجف اشرف وغیرہ کہ جن سے تمام عالم کے مسلمانوں کے مذہبی تعلقات وابستہ ہیں براہ راست خود مختار اسلامی حکومت کے قبضہ اقتدار میں رہیں۔"

عہ۱۰ "ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ جنگ کے ختم ہونے اور دنیا کو از سرِ نو امن و امان کی نعمت حاصل ہونے پر تہہ دل سے شکر گزار ہے اور امید کرتا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کے زیر سایہ دس کروڑ مسلمان آباد ہیں، خاص کر ایسے اسباب و وسائل اختیار کرے گی کہ مسلمانوں کے جذبات صحیح و صاف طور پر صلح کانفرنس میں ظاہر ہو جائیں اور مسلمانوں کے مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے تاکہ آئندہ زمانہ میں بھی دنیا کو امن و اماں نصیب ہو سکے۔"

## دارالعلوم دیوبند کا رویّہ

دارالعلوم دیوبند کے اکابرین اپنی بصیرت و فراست سے انگریزوں کو اپنا دشمن قرار دے کر بقا۔ و تحفظِ خلافتِ اسلامیہ اور آزادیِ ہند کے لیے زمانۂ دراز سے عملی جد و جہد کر رہے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ان کے پیر حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور ان کے سینکڑوں اعوان انصار اسی دھن میں سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ اس صدی کے سب سے بڑے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن ابھی مالٹا میں نظر بند تھے سب کی نگاہیں ان پر لگی تھیں۔ اور صرف دیوبند ہی اس جذبۂ اظہارِ وفاداری سے مستثنیٰ ہو

## وفد خلافت اور مہاتما گاندھی

گاندھی جی 1918ء میں سیاستِ ہند پر چھا رہے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو چن لیا تھا جن سے ان کو معاونت حاصل کرنی تھی چنانچہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے رانچی میں ملنے گئے تھے مگر حکومت نے ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ وہ برابر علی برادران سے رابطہ قائم رکھ رہے تھے چنانچہ جب وہ دو ہفتہ کے لیے چھندواڑہ سے رامپور آئے تو گاندھی جی فوراً ان سے رامپور جا کر ملے۔ مولانا عبدالباری کے یہاں فرنگی محل میں تو برابر ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ گاندھی جی کے کام کا قاعدہ ہی یہ تھا کہ وہ چند چوٹی کے لوگوں کو چن لیتے تھے اور ان کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر جب انھوں نے ترکِ موالات کی تحریک سنہ ساٹھ میں عالمگیر پیمانہ پر شروع کی تو پنڈت موتی لال نہرو، حسن امام اور سی آر داس کو چنا۔ حسن امام تو پوری طرح ساتھ نہ آسکے کیونکہ اصول سے اتفاق کرتے ہوئے وہ اپنی وکالت چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے لیکن اپنی لڑکی کو اس کام کے لیے دے دیا اور موتی لال اور سی آر داس نے انگریزی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

حسن امام پر ایک نظم زمیندار مورخہ 25 فروری 1922ء میں جناب مسلم کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ دراصل مولانا ظفر علی خاں کا بدلا ہوا نام ہے جو اس وقت مانٹگمری جیل میں قید تھے۔

وہ صبح صبح نہیں ہے وہ شام شام نہیں بلائے تازہ کا جو لا رہی پیام نہیں
کسی کو دار پہ کھینچا کسی کو ذبح کیا یہ انتظامِ حکومت ہے انتقام نہیں
وہ کون ہے جو نہیں آج کل اسیرِ فرنگ سی آر داس نہیں یا ابوالکلام نہیں
بہ حیرت اس پہ کہا ایک دوست نے مجھ سے کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں
کسی سے جبکہ وہ رندی نہیں کم نہیں تو کیوں شکست تو بہ میں سرگرم اہتمام نہیں

اگر حرام موالات مجھ غریب پہ ہے ۔۔۔ تو ایسے چوٹی کے لیڈر پہ کیوں حرام نہیں
کہا یہ دوست سے میں نے وہ مرغ دانا ہیں ۔۔۔ حریصِ دانا ہیں لیکن حریصِ دام نہیں
نہیں یہ قائدِ قوم اپنی قید کا قائل
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

نظربندان و محبوسانِ فرنگ کو فرمانِ شاہی کے ذریعہ رہائی ملی۔ مولانا محمد علی اخیر دسمبر ۱۹۱۹ء میں دوسرے لوگوں کے ساتھ رہا ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی چند روز بعد یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہو گئے۔

گاندھی جی تو تحریکِ خلافت سے اپنی پوری ہمدردی اور معاونت کا اقرار پہلے ہی کر چکے تھے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو دلّی میں ایک جلسہ ہوا جس میں لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈر بھی شریک ہوئے اور سب نے مسلمان موقف کے ساتھ اپنی پوری اعانت کا وعدہ کیا۔ لالہ لاجپت رائے (پنجاب) بپن چندرپال (بنگال) وغیرہ وغیرہ سب ساتھ آ گئے اور خلافت کے مسئلہ پر ہندو اور مسلمان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وائسرائے اور لندن صلح کانفرنس میں وفد لے جانے کے بارے میں جو تجاویز مولانا آزاد اور علی برادران کی قید و بند کے بارے میں منظور ہوئی تھیں ان حضرات کی رہائی کے بعد ان پر دوبارہ غور کیا گیا اور طے پایا کہ وفد لے جایا جائے۔

چنانچہ وفد مرتب کیا گیا اور مولانا محمد علی نے ایک میموریل تیار کیا جس پر سربرآوردہ لوگوں کے دستخط ہوئے۔ مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے:-

> "وفد وائسرائے سے ملا۔ میں نے عرضداشت پر دستخط تو کر دیے تھے مگر وفد کے ساتھ میں گیا نہیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ معاملات عرضداشتوں اور وفدوں کی حد سے آگے بڑھ چکے تھے۔"[1]

مولانا آزاد ہی کے بیان کے مطابق وائسرائے نے میموریل کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "اگر مسلمان کا کوئی وفد حکومت برطانیہ کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لیے جانا چاہے تو حکومت وفد کو لندن جانے کے سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کر دے گی۔ لیکن خود انھوں نے کچھ کرنے سے معذوری ظاہر کی"[2]

یہ پہلا دھکا تھا جو مسلمانوں کو لگا اور جو امیدیں حکومتِ برطانیہ کی وفادار مسلم رعایا نے ہز ایکسلنسی

---

[1] INDIA WINS FREEEDOM P 8
[2] " " " " 8-9

حضور وائسرائے دام اقبالہ کی ذات بابرکات سے وابستہ کی تھیں وہ سب خاک میں مل گئیں۔ کچھ لوگ سوچنے لگے کہ ؎

اے ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی　　یہ جواک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

لیکن صدیوں کی پالی ہوئی غلط تمنائیں اور نارسا امیدیں کب ساتھ چھوڑتی تھیں۔ چنانچہ جو وفد مرتب ہوا اس کے صدر مولانا محمد علی اور ارکان سید حسین، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم۔ اور سکریٹری حسن محمد حیات منتخب ہوئے۔ سید حسین اس وقت بمبئی کرانیکل جیل میں تھے اور حصولِ آزادیِ مصر میں پہلے ہندستانی مقرر ہوئے۔ وفد کے سکریٹری علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے حسن محمد حیات پنجابی تھے۔ بعد میں انھوں نے بھوپال میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ان کا علی گڑھ کا روایتی نام لارڈ حیات تھا۔[1]

## وفدِ خلافت کی کارگزاریاں

وائسرائے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ وفد اس قدر تاخیر سے لندن پہنچے گا کہ شاید ہی اس کو اپنی بات کہنے کا موقع ملے مگر مولانا محمد علی اتمام حجت پر مصر تھے۔ 22 فروری 1920ء کو ارکان وفد وینس پہنچے اور وہاں سے مولانا محمد علی نے وزیر ہند اور وزیر اعظم کو تار بھیجے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع دیا جائے۔ اس تار میں یہ بھی لکھا تھا کہ ہم لوگ وینس میں ہیں اور ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ مسٹر مانٹیگو کی طرف سے ہمارا استقبال ہو رہا ہے۔ اگرچہ مانٹیگو کی علالت کی خبر پاکر ہم لوگوں کو افسوس ہے۔

چونکہ مسٹر مانٹیگو بیمار تھے اور ان کی جگہ مسٹر فشر کام کرتے تھے اس لیے لندن پہنچنے کے بعد پہلے ان سے ملاقات ہوئی۔ مولانا محمد علی نے بڑے جوش وخروش سے خلافت کی مذہبی اہمیت اور مقاماتِ مقدسہ کے متعلق مذہبی احکامات کا حوالہ دے کر حسب ذیل مطالبات پیش کیے:۔

۱۔ خلافتِ ترکی کو بحال رکھا جائے۔

۲۔ مقاماتِ مقدسہ یعنی مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور تمام مقدس مزارات خلیفہ کی نگرانی میں ہونے چاہئیں جیسے کہ جنگ سے پہلے تھے۔ پھر مسلمان بھی خوش ہو جائیں گے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں جزیرۃ العرب اور مقاماتِ مقدسہ کا احترام باقی رکھ کر خلافت کی پہلی جیسی پوزیشن قائم رہ گئی۔

---

[1] محمد علی　ذاتی ڈائری کے چند اوراق — مرتبہ عبدالماجد دریابادی

مولانا محمد علی انگریزی زبان پر جیسی قدرت رکھتے تھے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک بے مثال مقرر تھے انھوں نے اپنے موقف کو بڑی خوبی سے پیش کیا لیکن ان کا بنیادی خیال بھی اس میں نمایاں رہا۔ مثلاً فرمایا:۔

"ہمارے مشن دو قسم کے ہیں۔ ہم بادشاہ سلامت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں کیونکہ ہم ان کی رعایا ہیں۔ اور پھر ہم اپنے خلیفہ کو بھی معاملات سے آگاہ کریں کیونکہ وہ ہمارے امیرالمومنین ہیں۔"

اس کے بعد مسٹر فشر نے ایک ضابطہ کا جواب دیا اور کچھ امید دلائی اور کچھ ناامیدی پیدا کی اور وزیراعظم سے ملاقات کے بارے میں کہا کہ وہ دیگر مدبرین عالم سے بہت اہم تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں اور بہت مشغول ہیں میں وعدہ نہیں کر سکتا کہ ان سے ملاقات ہوگی۔

مولانا محمد علی، جیسا کہ ان کی عادت تھی، اپنی سی کہتے گئے۔ یہ ان کی عادت تمام عمر قائم رہی۔ کراچی مقدمہ کے سلسلے میں بھی اور پنڈت جواہر لال کو مذہب پر بحث کے لیے مجبور کرنے کے سلسلہ میں وہ اپنے جوش میں رواداری کی حدوں کو قائم رکھنے پر کبھی قادر نہ ہوئے۔

## مسٹر لائیڈ جارج سے ملاقات

مسٹر فشر نے اپنی عظمت جتانے کے لیے اگرچہ کہہ دیا تھا کہ لائیڈ جارج سے ملاقات کا میں وعدہ نہیں کر سکتا مگر ایک "وفادار رعایا" کے وفد سے جو سات سمندر پار کر کے صرف اپنی وفاداری اور خدمات کا صلہ مانگنے آیا تھا سلطنت کا سربراہ کیوں نہ ملتا۔ لائیڈ جارج کے سامنے بھی مولانا محمد علی کا وہی حال رہا۔ وہ اپنے مذہبی فرائض کا ذکر کرتے رہے۔ مسٹر لائڈ جارج نے منطقی وجوہ سے مولانا محمد علی کی ہر بات کی تردید کی تاہم وہ اپنی بات کہتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی جسارت سے پیش کیا۔ اس کے تو وہ مرد میدان تھے ہی۔ انھوں نے جس حسن و خوبی سے اسلامی اصولِ خلافت اور مسلمانوں کے مطالبات کو پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے اور شاید کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا۔ بے شک انھوں نے حق ادا کر دیا لیکن انگریز نے ایک صدی کی محنت اور ریشہ دوانیوں سے دنیائے اسلام کی تباہی کا جو موقع پایا تھا اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے سکتا تھا! مولانا محمد علی کی پرزور مدلل اور فصیح تقریروں کو جب میں پڑھتا ہوں تو مجھے ایک مشہور قصہ یاد آتا ہے کہ ایک عالم دین ایک بادشاہ کے پاس گئے اور ان کو سمجھایا کہ کل فوج برخاست کر دیں اور یہ روپیہ رفاہِ عام کے کاموں میں لگائیں۔ فوج رکھنے سے کیا فائدہ۔ کسی دوسرے کا ملک چھیننا یا خونریزی کرنا سخت گناہ ہے۔ بادشاہ سلامت سادہ لوح تھے مگر یہ پوچھ ہی بیٹھے کہ اگر کوئی میرے اوپر حملہ کر دے تو کیا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا میں اس کا ذمہ دار ہوں چنانچہ بادشاہ سلامت نے کل فوجیں برخاست کر دیں۔ قریب کے بادشاہ کو جب خبر ملی تو اس نے چڑھائی کر دی

بادشاہ سلامت نے مولانا سے فریاد کی کہ اب آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے اور بچائیے۔ مولانا صاحب کئی اونٹوں پر قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابیں لاد کر آئے اور یہ سب لے کر حملہ آور بادشاہ کے پاس گئے۔ اس نے مولانا کا بڑا استقبال کیا۔ اور اعزاز واکرام کے ساتھ ان سے پیش آیا۔ مولانا صاحب نے تقریر شروع کی کہ خونریزی اور ملک گیری حرام ہے اور جو ایسا کرے گا اس کی سزا جہنم ہے۔ اور اپنی تائید میں آیاتِ قرآنی واحادیثِ شریفہ اور بزرگوں کے اقوال کا ایک لا متناہی سلسلہ بیان کرنا شروع کیا اور بار بار اسے خوفِ خدا دلاتے تھے۔ حملہ آور بادشاہ بہت ادب سے سب سنتا رہا۔ آخر کار کچھ عرصہ کے بعد اس نے کہا کہ ذرا اس ملک کو میں فتح کر لوں تو ابھی لوٹ کر آپ کی تقریر اطمینان سے سنتا ہوں۔ ملازمین سے کہا کہ مولانا کی خاطر مدارات میں حتی المقدور کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ مولانا بھاگ کر اس بادشاہ کے پاس پہنچے جس پر حملہ ہوا تھا اس نے خوفزدہ لہجہ میں پوچھا کیا ہوا تو مولانا نے فرمایا کوئی حرج نہیں تمہارا تو صرف ملک گیا اس کا ایمان گیا۔

لائیڈ جارج سے مایوس ہو کر مولانا محمد علی نے برٹش پبلک کو ہموار کرنے کے لیے جلسے کیے اور تقریریں کیں۔ وہ پیرس گئے اور وہاں فرانسیسیوں کو بھی اپنے موقف سے آگاہ کیا اور اپنی روایتی، لسانی و علمی لیاقت سے منطقی دلائل کی حد کر دی۔ وہ جزیرۃ العرب کے لوگوں سے بھی ملے اور انھیں خلیفہ کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔ وہ لوگ قسمیں کھاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم خلیفہ کے خلاف نہیں ہیں مگر ان کا حال کربلا کے کوفیوں کا سا تھا کہ ان کی زبانیں تو حضرت امام حسینؓ کے ساتھ تھیں مگر ان کی تلواریں ان کے خلاف تھیں۔ امیر فیصل اور امیر عبداللہ دونوں شریف مکہ کے لڑکے تھے۔ ان دونوں کو تاج و تخت کا لالچ دیا جا چکا تھا۔ شریف مکہ کو خلیفۃ المسلمین بننے کا خواب دکھلایا گیا تھا اور یہ سب برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے، یہ منطق سے کیا راضی ہوتے۔ امیر فیصل نے اپنا ایک بیان خلافت کی موافقت میں شائع کرا دیا مگر یہ ایک کھلی ہوئی منافقت تھی۔

مولانا محمد علی اور ان کے ساتھی ان تمام مساعی کے بعد جو سعیِ لاحاصل ہوئیں اکتوبر 1920ء کے آغاز میں ہندوستان واپس آئے۔ ان کے جانے کے وقت سے ہی بعض لوگوں میں جو وفد کے حقیقی نشا سے واقف نہیں تھے تذبذب پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اکبر مرحوم نے اپنے ظریفانہ انداز میں کہا ؎

دعا کرتے ہیں ہم تو بیٹھ کر مسجد کی دریوں پر　　مبارک ہو سلیمانی نظر پیرس کی پریوں پر

علامہ اقبال نے فرمایا۔ قطعہ

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے چلا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید   کہ از دیگراں خواستن مومیائی

کہا جاسکتا ہے کہ اس وفد سے کچھ حاصل نہ ہوا لیکن جس دور سے مسلمان گزر رہے تھے اس کا تقاضا تھا کہ انھیں ناامیدی کا ایک بڑا جھٹکا لگے تاکہ برطانیہ کی "وفادار رعایا" کا منحوس و ذلت خیز تخیل دماغ سے نکل جائے۔ اس سے کئی عظیم نقصانات البتہ ہوئے۔ اوّل یہ کہ ہندوستان ایک نازک وقت میں مولانا محمد علی جیسی عظیم شخصیت کی قیادت سے محروم رہا۔ دوسرے اس سے ایک خاص قسم کی بدنامی بھی ہوئی۔ وفد کے واپس ہوتے ہی انگریز نے جس کے جاسوس لگے ہوئے تھے اور یہ جان گئے تھے کہ پورا حساب رکھا نہیں گیا ہے' اپنے پٹھوں کو ہشکار دیا اور انھوں نے مولانا محمد علی سے حساب مانگا۔ بھلا مولانا محمد علی جیسے ناپابند اوقات کے لیے باقاعدہ حساب رکھنا کہاں تک ممکن تھا۔ لارڈ حیات بھی علی گڑھ کے ایک کھلنڈرے تھے۔ اصل میں یہ کام بحیثیت سکریٹری ان کا تھا۔ مولانا محمد علی بحیثیت رئیسِ وفد اس درجہ مشغول تھے کہ وہ حساب رکھنا بھی چاہتے تو رکھ نہ سکتے تھے اور نہ یہ ان کی ذمّہ داری تھی۔ مگر ان ہی سے سوال ہوا۔ مولانا محمد علی نے جواب دیا "خدا کو بروز قیامت حساب دوں گا"۔ ان شریروں نے کہا "اگر وہ نہ لے اور بے حساب آپ کو بخش دے تو حساب ہمیں دیجیے"۔ اب غدّاران ملت وو فادارانِ سرکار کی بن آئی۔ طرح طرح کی افواہیں اڑانے۔ جس طرح یہ حساب مرتب ہوا اور جتنی صفائی علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی کی جانب سے دی وہ قوم کی پست اخلاقی اور ایک عظیم خادمِ قوم کی جو بے وقری ہے اس کو بیان کرنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ الغرض علامہ سید سلیمان ندوی کے اس بیان کے بعد کہ کس طرح سفر میں اخراجات ہوتے تھے' جلسوں کے لیے کمرے کرایہ پر لینے پڑتے تھے' زرِ مبادلہ بدلتا رہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ تمام تفصیلی حساب مرتب ہونے کے بعد شرپسندوں کے منہ میں سیاہی لگی۔ اور معاملہ ختم ہوا مگر کتنے عظیم نقصان کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا۔

جو الفاظ میں نے لکھے ہیں ان سے پوری قوم کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں ان کی وضاحت نہ کردوں یہ حساب کتاب کی بات کرنے والے صرف چند شرپسند عناصر تھے جو حکومت کے پروردہ ہونے کی وجہ سے اس کے اشارے پر کام کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے شخصی وقار اور عظمت کے تخیل میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ جو نقصان ہوا وہ بعد کو جو کیچڑ اچھلا اس کے مولانا محمد علی خود ذمہ دار تھے۔ ان کے اندر دو بڑی کمزوریاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتے تھے۔ جو دل میں آیا کہہ دیتے تھے جس سے لوگوں کے دلوں پر چوٹ لگتی تھی۔ مولانا محمد علی پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور وہ اسے ان کی خوبی تصور کرتے ہیں اور اس سے ان کی صاف دلی اور بے باکی کے نتائج نکالتے ہیں۔ مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مولانا محمد علی کا یہ کوئی وصف نہیں تھا کہ انھوں نے مولانا ظفر علی خاں جیسے ہجو گو شاعر کو غدّار کہا۔ اور خواجہ حسن نظامی جیسے سرکاری آدمی کو

"ختم خواجگی کی دھمکی دی۔ فرنگی محل کی شان میں ایسے ناروا الفاظ کہے جو صفحۂ کاغذ پر درج نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ وہ وہاں بیعت تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے خلاف ایک محاذ کھڑا کر لیا۔ اور ان لوگوں نے ہر غلط بات کو دہرانا شروع کر دیا۔ دوسری کمزوری مولانا محمد علی میں یہ تھی کہ وہ درگزر سے کام لینا تو جانتے ہی نہ تھے۔ جہاں ان کے خلاف کوئی بات آئی وہ مدافعت پر آمادہ ہو گئے۔ پھر ان کا قلم تھا اور اس کی شوخ نگاریاں۔ اس کے مقابلے میں گاندھی جی کا طرزِ عمل بالکل اس سے متضاد تھا۔ وہ کبھی اپنی صفائی نہیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہر شخص کو میرے بارے میں رائے قائم کرنے کا حق ہے۔ میں کیوں اس کی رائے تبدیل کرنے کی کوشش کروں۔ یہی حال مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ عظیم انسان اپنی ان چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کی وجہ سے تمام عمر مجادلہ ومناظرہ اور دفاعِ ذاتی وشخصی میں مبتلا رہا۔

مولانا شوکت علی بالکل دوسرے اجزا سے مرکب تھے۔ ان کو عام طور پر لوگ کم علم سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ بڑے ہی ذی ہوش اور لائق آدمی تھے۔ تقریریں مختصر کرتے تھے جبکہ مولانا محمد علی نے اپنی طویل تقریروں سے سارے ہندوستان کو عاجز کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ برملا کہا کہ مولانا محمد علی پانچ منٹ کا وعدہ کر کے تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بیٹھتے ہیں۔ خیر یہ تو گاندھی جی نے کہا اور مولانا محمد علی نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے اڑا دیا۔ کوئی دوسرا کہتا تو اس کی شامت ہی آجاتی۔ مولانا شوکت علی تنظیم کے امام تھے۔ جس طرح وہ کسی تحریک کو منظم کر سکتے تھے وہ صرف ان کا حصہ تھا۔ غالباً ہندوستان میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ چنانچہ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا تیسرا جلسہ جو امرت سر کانگریس کے پنڈال میں 31 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوا اس کی صدارت کے لیے مولانا شوکت علی کا نام مولانا عبدالباری نے پیش کیا اور تائید مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا فضل الرحمن صاحب ایڈیٹر "اخوت" آنریبل ابوالقاسم کلکتہ، سیٹھ احمد حاجی صدیق کھتری مسٹر موسیٰ بال صاحب رنگون نے کی۔ مولانا شوکت علی بہت مختصر اور جامع تقریریں کرتے تھے جو بے انتہا موثر ہوتی تھیں۔ ادھر مولانا محمد علی کی طویل تقریر امرت سر کانگریس کے اجلاس میں ملاحظہ فرمائیے۔ ادھر مولانا شوکت علی کی تقریر مسلم لیگ میں دیکھیے ذرا ڈھونڈھ۔

"میں نے ایک عہد کیا تھا کہ جس وقت کعبہ پر مصیبت آئے گی اس وقت اپنی جان تک قربان کر دوں گا۔ میں نظر بند ہو گیا اور جب کعبہ پر مصیبت آئی تو کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میں خطاوار ہوں۔ جو خطا میں نے کی ہے اس کی سزا مجھے مل رہی ہے اور ملے گی۔ ہم نے اپنے لیے جو کچھ کیا اپنے ہاتھوں کیا۔ کیونکہ ہم نے مصلحتِ وقت کو رسول کے احکام پر ترجیح دی۔ ہمیں جو کچھ سزا ملی اس کی بدولت تھی اور میں سچ کہتا ہوں کہ ہم اس سے بہت زیادہ سزا کے

مستحق تھے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں پھانسی کا مستحق تھا اور مجھے صرف نظربندی ملی۔ میں ایک سوال پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس طرزِ عمل سے کیا بہتری حاصل کی۔ اگر آپ دنیوی اقتدار کے لیے خدا اور رسول کے احکام کو نظرانداز کرنے کے لیے تیار ہیں تو میرا اور آپ کا ساتھ نہیں۔ اس وقت کام یہ ہے کہ تمام عالم جمع ہوکر احکام شرعی پر غور کرکے فیصلہ کرے کہ آپ کا فرض کیا ہے۔ ریزولیوشن پاس کر دینا کچھ مشکل کام نہیں۔ میں نے ایک فقرہ اپنے بھائی معظم علی کو لکھا تھا جس پر مجھ سے سوال کیا گیا تھا۔ وہ فقرہ یہ تھا کہ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو ترکوں کی فتح کا خواہشمند نہ ہو۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ اس کا جواب دینے سے قبل میں ایک سوال کرتا ہوں کہ اگر ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے تو ہر مسلمان یہ کہے گا اور اسے کہنے کا حق ہے۔ ہمیں ملک معظم اور وائسرائے کے پاس وفد روانہ کرکے ان سے کہہ دینا چاہیے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو ہمارے لیے دو صورتیں ہیں۔ ہجرت یا جہاد۔ ہمارا وفد خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں جانا چاہیے جس میں معذرت کی جائے کہ ہم نے اپنے فرض کو پس پشت ڈالا۔"

تقریر تالیوں کی گونج میں ختم ہوئی۔ کتنی مختصر جامع اور موثر۔ اور کیسا نقشہ جملہ حالات اور آئندہ کے پروگرام کا پیش کیا ہے کہ آج بھی یہ تقریر پڑھ کر آنکھ نم ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد علی نے اس فرض کو جس ہمت، بہادری، لیاقت اور محنت سے ادا کیا اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رئیسِ وفد کی کارگزاریوں کا حق ادا کر دیا۔ یہ انھیں کا حصہ تھا اور انھوں نے برطانوی وزراء، برطانوی پبلک، دولِ متحدہ کے مدبّرین، فرانس کی حکومت کے سربراہ، عراق و عرب کے لیڈران امیر فیصل وغیرہ سب کو ہلا ڈالا۔ مولانا محمد علی کے دل میں ایک آگ جل رہی تھی۔ وہ جب دلائل سے لائیڈ جارج وزیراعظم برطانیہ اور وزیر ہند اور دیگر ارکانِ حکومت کو قائل نہ کر سکے تو برطانیہ کی پبلک سے اپیل کی۔ انگریزوں کو جو حامی تھے ان سے امداد لی، جو مخالف تھے ان کا مقابلہ کیا، بحثیں کیں۔ اور چونکہ لائیڈ جارج کا کہنا یہ تھا کہ عرب خود ترکی کے زیرِ نگیں رہنا نہیں چاہتے اس لیے ان کو حقِ خود ارادیت سے کیوں محروم کیا جائے۔ اس لیے مولانا محمد علی عرب کے لیڈران سے ملے اور یہ کوشش کی کہ خود عرب کے لوگ اس پر راضی ہو جائیں کہ وہ حقِ خود ارادیت رکھتے ہوئے ترکی کے وفاق میں رہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی جیسے ماہرِ فنِ ادبِ عربی ان کے ساتھ تھے۔ جو روانی سے مادری زبان کی طرح عربی بولتے تھے اس لیے خود مولانا محمد علی کو بڑی سہولت حاصل تھی۔ مگر معاملہ بحث و گفتگو کا نہ تھا۔ برطانیہ کو اپنی طاقت کا غرہ تھا وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم پر

عمل درآمد کر رہا تھا اور عربؔ روپیہ اور حکومت کی حرص میں مبتلا تھے۔ شریفِ مکہ کو علاوہ اس کے کہ کثیر رقم ملی تھی ایک صاحبزادے کو عراق کی بادشاہت اور دوسرے کو اردن کی بادشاہت کا وعدہ تھا۔ مولانا محمد علی اپنے بے پناہ جوش میں ان باتوں کا اندازہ نہ کر سکے اور مجنونانہ سعی و جہد میں مشغول رہے۔ وہ دولِ متحدہ میں فرانس وغیرہ کے اعلیٰ مدبّرین سے بھی ملے لیکن سب بے سود۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ انھوں نے دولِ متحدہ اور اہل عرب کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ہندوستان، مصر، افغانستان اور تمام بلادِ اسلامیہ کے سامنے مسئلہ کی صحیح شکل پیش کی اور دولِ متحدہ کا ظلم کھل کر سامنے آگیا۔

چھٹا باب

# مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لیے مولانا آزاد کی کوشش

## بیعتِ امامت

مولانا ابوالکلام آزاد یکم جنوری 1920ء کو رانچی سے رہا ہوئے اور خلافت کانفرنس کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی "ذکرِ آزاد" میں اسے پہلی خلافت کانفرنس قرار دیتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے پہلی خلافت کانفرنس دلی میں زیرِ صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دوسری خلافت کانفرنس 23 نومبر 1919ء کو بمقام دلی زیرِ صدارت مولوی فضل الحق ہوئی تھی۔ یہ تیسری خلافت کانفرنس تھی جو فروری 1920ء میں ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی۔ وہاں مولانا ابوالکلام نے ایک مبسوط خطبہ خلافت پر دیا جو کتابی شکل میں اسی وقت شائع ہو چکا تھا اور اب بھی جا بجا ملتا ہے۔

وہیں کانفرنس کے دوسرے دن مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک اسکیم کی بنیاد ڈالی جس کے بارے میں ان کے مقرب عبدالرزاق ملیح آبادی ذکرِ آزاد میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے۔ اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتا دیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات

زمانہ سے کما حقہ، واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے۔

اس کے بعد طے پاگیا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے لیے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دیا جائے تاکہ جب یہ معاملہ سامنے آئے تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو۔ اس سے لوگوں میں رشک و رقابت کا سدّباب ہو جائے گا اور مسلمان ایک امام پر متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔

مولانا نے بتلایا کہ دوسرے صوبوں میں بیعت کا کام جاری ہو گیا ہے۔ یو پی کا صوبہ تم اپنے ذمے لو۔ میں راضی ہو گیا تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک تحریر دی جس میں انھوں نے مجھ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور لکھا کہ ان کے لیے بیعت لینے کا میں مجاز ہوں۔ تحریر حسب ذیل ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشاد سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ ۴ شعبان 1338ھ غالباً (23. 4. 1920)

ملیح آبادی پھر لکھتے ہیں کہ "الفاظ بیعت کا مسودہ بھی لکھ دیا وہ نیچے نقل کرتا ہوں:۔

'امنت باللہ و بما جاء من عند اللہ و امنت برسول اللہ و بما جاء من عند رسول اللہ و اسلمت و اقول ان صلوٰتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ و بذٰلک امرت و انا اول المسلمین۔

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء و نائبین کے اس بات پر کہ:۔

(۱) اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد و عمل پر قائم رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

(۲) پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا اگر استطاعت پائی۔

(۳) ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ برائی کو روکوں گا۔ صبر کی وصیت کروں گا۔

(۴) میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

(5) اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے اپنے مال سے اپنے اہل و عیال سے دنیا کی ہر نعمت اور ہر لذت سے زیادہ اللہ کو اس کے رسول کو اس کی شریعت کو اس کی امت کو محبوب رکھوں گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب اللہ و سنت کے مطابق دیا جائے گا السمع والطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

آگے چل کر ملیح آبادی لکھتے ہیں' مولانا نے فرمایا کہ:۔

"ایک نیک دل مسلمان نے ایک بڑی رقم میرے ہاتھ میں اپنے کاموں کے لیے ڈال رکھی ہے اسی میں سے پچاس روپیہ ماہوار آپ کو بھی پہنچا کریں گے۔ فی الحال لکھنؤ اپنا مرکز بنائیے اور پورے صوبہ میں کام شروع کر دیجئے" بعد میں معلوم ہوا کہ جس رقم کا مولانا نے حوالہ دیا تھا' مولانا عبد القادر قصوری کے لڑکے محمد علی ایم اے نے ایک لاکھ روپیہ کی شکل میں دی تھی۔"

ملیح آبادی کے قول کے مطابق مولانا نے کام کا طریقہ یہ بھی بتلایا کہ دعوتیں دی جائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ "دعوت پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے اس کا کئی گنا زیادہ دس ہزار آدمیوں کے جلسے پر خرچ ہو جاتا ہے مگر اس جلسے میں ایک آدمی بھی قابو میں نہیں آتا لیکن ایک دعوت کے مختصر خرچ سے دس کے دس آدمی تو اپنا خیال ضرور ہی کرنے لگتے ہیں۔"

ملیح آبادی کا قول ہے کہ انھوں نے اس نسخہ کیمیا کو آزمایا اور مجرب پایا۔

8 جون 1920ء کو مولانا محمود حسن رہا ہو کر مالٹا سے بمبئی آ گئے تھے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ:۔

"اسی زمانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مالٹا کی نظر بندی سے چھوٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے' چنانچہ عبد الرزاق ملیح آبادی وہاں گئے اور بزعم خویش دونوں بزرگوں یعنی مولانا عبد الباری اور حضرت مولانا محمود حسن کو مولانا ابو الکلام آزاد کے امام الہند بننے پر راضی کرنا چاہا مگر دونوں بات ٹال گئے۔

مولانا عبد الباری کی ایک مبہم تحریر بھی نقل کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"مولانا محمود حسن سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابو الکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت سے مجھے استنکاف نہیں ہے بسر و چشم قبول کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تفرقی جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں کسی نا اہل کو اکثر اہل اسلام قبول کریں گے تو وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار و فرماں بردار مجھے پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیا تا ہیں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کرکے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں اس سے زائد مجھے اس تحریک

سے تعرض نہیں ہے۔ والسلام۔ بندہ فقیر عبد الباری ؒ

یہ خط مولانا ابوالکلام کو ملا تو انھوں نے ملیح آبادی کو لکھا۔ مولوی عبد الباری کا خط دیکھا ' یار ما ایں دارد واّں نیز ہم ' سرِ دست اس قصہ کو تہہ کیجیے اور کام کیے جائیے ' پنجاب ' سندھ ' بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ مولانا آزاد کا یہ خط 20 ستمبر 1920ء کا ہے۔

صفحہ 39 پر ملیح آبادی مولانا آزاد کا ایک اور خط اپنے نام نقل کرتے ہیں جس کا کچھ حصہ حسب ذیل ہے:

"بہر حال ہمارا دائرہ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب ' سندھ ' بنگال متحد و متفق ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں (مولانا عبد الباری ' مولانا محمود حسن اور مولانا حسرت موہانی) کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔ لیکن ستمبر 1920ء میں مولانا نے تحریکِ امامت کو ختم کر دیا اور امامت کے معاملے کی اہمیت دفعتاً مولانا کے ذہن میں کم ہو گئی اس کا سبب انھوں نے کبھی نہیں بتایا" البتہ عبد الرزاق ملیح آبادی نے اپنی حسبِ ذیل رائے درج کی ہے۔ ان کو مولانا آزاد سے جو تقرب حاصل تھا اس بنا پر یہ قابلِ غور ہے۔

"لیکن مولانا محمد علی نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور مولانا کی امامت ہی کے نہیں خود مولانا کی ذات کے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر بھر رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جو از حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے محسوس کر لیا کہ علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی انہی برادران کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا اور گو شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی مگر دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا اس صورت میں مسئلہ امامت کا آخر تک پہنچانا دانشمندی کے خلاف تھا۔

یہ تھی وہ سعیِ لاحاصل۔ وفد خلافت تو خیر ایک اہم سیاسی فائدہ تھا جو حاصل ہوا۔ اس کی بدولت مسلمان ایک زبردست غلط تخیل سے نکل کر آزاد ہوا۔ اور یہ ایک منزل تھی جسے دوسری منزل تک جانے کے لیے طے کرنا ضروری تھا۔ اس نے کروڑوں انسانوں کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں پہنچایا۔ خیالات اور عقائدِ باطلہ کو ملیامیٹ کر دیا۔ مسلمانوں کو آزادی کی فضا میں سانس لینے اور مکمل آزادی کے لیے اور کامل جد و جہد کے لیے آمادہ و مستعد کیا۔ امامتِ ہند کی تحریک تو بے سود ہی رہی اور پھر تمام عمر مولانا آزاد نے اس اہم فریضۂ مذہبی کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرعی مسئلہ دریائے گنگ و جمن کی لہروں کی نذر ہو گیا اور مولانا کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانانِ ہند کو "جاہلیت" اور "معصیت" کی زندگی گزارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جد و جہد کریں۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریک خلافت نے وہ کام براہ راست کر دیا جو تحریکِ امامت سے بالواسطہ مولانا کرانا چاہتے تھے۔ اور اس لیے

مولانا نے خاموشی اختیار کرلی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ یکم اپریل 1920ء کی اشاعت میں سرکار پرست ہفتہ وار اخبار مشرق نے "اعلیٰ حضرت محی الملت والدین حامی العلوم نواب میر عثمان علی خاں فرماں روائے مملکت آصفیہ" کے لیے ان کی جشن سالگرہ پر درازئی حیات کی دعا کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ "اعلیٰ حضرت محی الملت والدین" کو "شیخ الاسلام" کا منصب دیا جائے اور ہر صوبہ میں شیخ الاسلام کے نائب اور ہر شہر میں اس کے نقیب ہوں۔ اس طرح ایک طرف تو عوام کے خیالات پر قابو حاصل ہو جائے گا۔ دوسرے ہماری آواز زیادہ ذمہ دارانہ اور موثر طریقے سے حکومت پر پہنچ سکے گی۔" اس مضحکہ خیز تجویز کا دنداں شکن جواب وکیل امرت سر نے اپنی 24 اکتوبر 1920ء کی اشاعت میں دیا اس سے معلوم ہوگا کہ وفاداران ازلی کس کس قسم کے ذہنی الجھاوے عوام میں پیدا کرنے کے لیے بے شرمی دیدہ دلیری کے ساتھ فکر کر رہے تھے۔ لیکن ایک فرنچ جنرل کے قول کے مطابق عوام کا جوش دریاؤں کی طغیانی کی طرح اٹھتا ہے جسے بجز خدا کے کوئی اور نہیں کہہ سکتا کہ بس!

## تحریکِ ہجرت

یہ بات طے ہو جانے کے بعد کہ وائسرائے کے پاس وفدِ خلافت لے جایا جائے۔ وفد گیا اور وائسرائے کے یہاں سے لوٹ کر آیا تو گاندھی جی نے یہ سوال اٹھایا کہ آئندہ قدم کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے دلّی میں ایک جلسہ بلایا گیا جس میں اور لوگوں کے علاوہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا عبدالباری بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے اس میں ترکِ موالات کا پروگرام پیش کیا۔ ترک موالات کی اسکیم یہ تھی کہ حکومت سے ہر طرح کا عدم تعاون کیا جائے، گورنمنٹ کے خطابات واپس کر دیے جائیں۔ عدالتوں، درس گاہوں کا مکمل بائیکاٹ ہو، ہندوستانی تمام نوکریوں سے استعفیٰ دے دیں اور 1919ء کے اصلاحات کے ماتحت جو قانون ساز ادارے بننے والے ہیں ان میں کوئی حصہ نہ لے۔ گاندھی جی نے کہا کہ یہی وہ طریقہ ہے جو حکومت کو معاملات طے کرنے پر مجبور کرے گا۔ وفود اور میمورنڈم کے زمانے گزر چکے۔

مولانا آزاد انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:۔

"جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی یہ تجویز پیش کی مجھے یاد آیا کہ یہی وہ اسکیم تھی جو کچھ عرصہ قبل ٹالسٹائی نے پیش کی تھی۔۔۔۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کا پروگرام میں نے الہلال کے کسی مضمون میں پیش کیا تھا۔"[1]

---

[1] INDIA WINS FREEDOM P.9

الہلال کا وہ مضمون افسوس ہے کہ کہیں نہیں ملا اور نہ مولانا نے اس کے بعد کبھی اس کا تذکرہ کیا یا از سر نو چھاپا لیکن ہجرت کا ایک فتویٰ مولانا نے اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ضرور نشر کر دیا جس میں مسلمانانِ ہند کو یہاں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ادنیٰ تعمق سے معلوم ہوگا کہ ہجرت اور ترکِ موالات میں قطبین کا فاصلہ ہے — ہجرت کا مطلب ہے اس ملک کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے جانا۔ اور ترکِ موالات تو وہ کرے گا جس کا عزم راسخ یہاں رہنے کا ہو لیکن مولانا آزاد کا جو فتویٰ "اہلِ حدیث امرت سر" کی 20 جولائی 1920ء کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے ان دونوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔[1]

اس کے پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ مولانا نے کلکتہ کانفرنس کے بعد فروری 1920ء میں اپنے کو امام الہند بنانے اور اس طرح مذہب کے راستہ مسلمانوں کو سیاست میں داخل کرنے کا پروگرام بنایا تھا جو انھوں نے کوشش بلیغ اور رقم کثیر صرف کرنے کے بعد ستمبر 1920ء میں ختم کر دیا۔ تو پھر اسی زمانہ میں تحریکِ ہجرت کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بہر حال اب مولانا کے فتوے اور ترکِ موالات سے اس کی تطبیق پر نظر ڈالی جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

> "تمام دلائلِ شرعیہ، حالاتِ حاضرہ، مصالحِ مہمہ امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بجز ہجرت کوئی چارہ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔"

وجوب کا فتویٰ دینے کے بعد مولانا نے ایک استثنیٰ کا ذکر کیا ہے:۔

> "البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمۂ حق کے اعلان و تذکیر کے لیے ان کا قیام ہندستان میں بمقابلہ ہجرت زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ دیگر عذرات مضبوطہ شرعی کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہیے اس کی وجہ سے تاخیر ہو سو بلاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی تمام قوتیں اتباعِ شرع کے لیے وقف کر دینی چاہئیں۔"

---

[1] یہ فتویٰ غلام رسول مہر نے تبرکاتِ آزاد کے صفحہ 203 پر اہلحدیث سے نقل کیا ہے۔ مگر فتویٰ کی تاریخ نہیں درج ہے۔ غلام رسول مہر تمہید میں صرف اس قدر لکھتا ہے کہ مولانا نے 1920ء میں فتویٰ دیا تھا بہر حال چونکہ مولانا جنوری 1920ء میں رہا ہوئے اور جولائی 1920ء میں یہ فتویٰ شائع ہو گیا۔ اس لیے وہ جنوری اور جولائی 1920ء کے مابین کا ہے۔

ترکِ موالات کے بارے میں اسی فتوٰی کے اندر مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"گزشتہ فروری کے جلسہ دہلی سے لے کر 11 اپریل کے جلسۂ خلافت کمیٹی بمبئی تک نان کوآپریشن کو منظور و مقبول کرانے کی جس قدر کوششیں کیں حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا گیا۔ اس کی بنا یہی تھی:۔

یعنی "نہ تو ہندوستان سے تمام لوگ بہ یک وقت ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب ہے"۔ ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان میں اسلامی آبادی بھی باقی رہے گی۔ پس جو لوگ ہندوستان میں ہیں شرعاً اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریقِ محارب سے کسی طرح کا علاقہ محبت والفت یا اعانت وخدمت کا رکھیں۔ جو شخص رکھے گا وہ حسبِ نصِ قرآنی اسلام کا دشمن منسوب ہوگا۔ ومن یتولھم منکم فانہ منھم "۔

یہ تھی تطبیق کی شکل۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ کون ہجرت کرے اور کون رہ جائے تو اس کے لیے مولانا نے حسبِ ذیل شکل پیش کی:۔

"اس بات کا فیصلہ کرنا صاحبِ جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے اور کس شخص کی استعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اسلامی خدمات کے لیے مطلوب و مفید ہے نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات میں کہ موجب ثمرات و برکات ہو۔ ہر شخص بطورِ خود ان امور کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"اعمالِ ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ حسنہ نبوت نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے۔ بغیر بیعت ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔ جو لوگ ہجرت کریں پہلے ہجرت پر بیعت کرلیں"۔

یہاں وہ بات سمجھ میں آسکتی ہے جو پہلے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ تحریکِ امامت اور تحریکِ ہجرت دونوں کا تضاد کیسے رفع ہو۔ مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوگا کہ تحریکِ ہجرت تحریکِ امامت کی کتاب کا ایک باب تھی۔ آخر میں مولانا ادعا و تحکم کی تمام الجھنیں سمیٹ کر فرماتے ہیں:۔

"یہ میری رائے ہے، میری بصیرت ہے، میرا یقین ہے، میرا ایمان ہے۔ نہ کہ کوئی قیاس و رائے اور پولیٹیکل حکمتِ عملی۔ تمام یورپ اسلامی حکومت سے نکل چکا، بغداد و شام جا چکے، لیکن ایمان باقی ہے۔ ہم کو اب قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ در پیش ہے۔ اور مقصود بقائے ملک نہیں بلکہ صرف بقائے ایمان ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے جس طالب حق

کو مجھ پر اعتماد ہو اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے..... بافعل طریق عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ توفیقِ عمل دے وہ فوراً مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں یا حسب ذیل اصحاب سے مل کر تفصیلی ہدایات حاصل کرلیں۔

(1) مولوی عبدالقادر وکیل قصور (ضلع لاہور)

(2) مولوی محی الدین بی۔اے قصور (ضلع لاہور)

(3) مولانا محمد داؤد غزنوی

(4) مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر البیان لکھنؤ

اس طرح بیعتِ ہجرت بالواسطہ بیعت امامت تھی اور دونوں تحریکیں مولانا ایک ساتھ چلا رہے تھے۔ مولانا کو اپنی ذات کی اہلیت پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اہل الرائے کے مشورے کی ضرورت نہیں سمجھی اور براہِ راست قوم سے بیعت لینا چاہتے تھے بلکہ امامت کے لیے بیعت لینے کی تو مہم چلا رکھی تھی۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری نے دیا تھا۔ اس فتویٰ کی تمام تر ذمہ داری مولانا ابوالکلام آزاد پر ہے۔ غلام رسول مہر نے مجھ سے کہا کہ پنجاب، سندھ اور سرحد پر مولانا کا اثر رانچی کی نظربندی سے پہلے اتنا گہرا تھا کہ جب وہ لاہور جاتے تھے تو ایک ایک لاکھ آدمی دور دراز سے جمع ہوتے تھے اور اتنی گرمجوشی سے نعرہ تکبیر بلند کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا آسمان پھٹ پڑے گا۔ سندھ پر مولانا کا اثر ان کے خط مورخہ ۵ ستمبر 1920ء سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو بسلسلہ تحریکِ امامت لکھا تھا اور جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ سندھ کے ملاؤں نے غالباً اسی اثر کے ماتحت ہجرت پر زور دیا اور چل پڑے۔ ہندستان سے جو لوگ گئے ان میں بعض ایسے تھے جن کا ذکر ضروری ہے:۔

(۱) مولانا احمد علی صاحب شیرانوالہ دروازہ لاہور۔ آپ ایک متبحر عالم سادہ مزاج اور بزرگ انسان تھے۔ شیرانوالہ دروازہ کی مسجد میں قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ تانگے یکّے والوں اور عوام کو ناظرہ قرآن سے لے کر علماء کو ترتیب آیات تک کی تعلیم دیتے تھے۔ میں بھی علماء کی اس صف میں خوشامد کر کے داخل ہوگیا تھا اور دس سیپارے پڑھے تھے۔ شومیٔ قسمت میری بیوی سخت علیل ہوگئیں اور مجھے چند روز کے لیے گھر جانا پڑا اور بقیہ سبق رہ گیا۔ مجھے ان کی شاگردی کا بڑا فخر ہے۔ آپ مولانا سندھی کے حکم سے ہندستان میں کام کرنے کے لیے واپس کر دیے گئے تھے۔

(2) خان عبدالغفار خان اتمان زئی (پشاور)

(3) سردار محمد اسلم خاں بلوچستان

(4) عزیز ہندی

(5) عثمان صاحب بھوپالی

اور بہت سے کالجوں کے گریجویٹ مثلاً اقبال شیدائی (لاہور)، اکبر خاں اور احمد شاہ خاں (بھوپال) ان کے علاوہ مہاجرین کا جم غفیر بے سروسامانی کی حالت میں افغانستان کی طرف روانہ ہوا۔

انگریز کو افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن، اس کی مالی حالت، جنگ اور سواری کی قلت خوب معلوم تھی۔ جس طرح اس نے انقلابِ فرانس میں حامیِ انقلاب زرِ کثیر خرچ کر کے پیدا کیے تھے، جو خونریزیاں کراتے تھے جس سے تمام یورپ دہل گیا تھا اور انقلاب کی رفتار رک گئی تھی اسی طرح اپنی عیاریوں کو کام میں لاکر اپنے گرگے چھوڑ دیے جو لوگوں کو اپنی ہجرت کے فتوے دکھاتے اور شرعی حکم کے وجوب کی جانب متوجہ کر کے ہجرت کی تلقین کرتے تھے۔ یہ بھی سبز باغ دکھاتے تھے کہ وہاں پہنچتے ہی تم کو ہر طرح کی راحت ملے گی اور تم مالدار ہو جاؤ گے چین کی زندگی گزارو گے۔

ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں:۔

"قافلے پے در پے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے۔ شروع میں ان کو خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی لیکن ان سب کے لیے قابلِ اطمینان انتظام ناممکن تھا۔ بے چاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں۔ بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی بھی کی۔ بعض لوگوں نے تو روٹی اور کھانا خریدنے کے لیے اپنا اثاث البیت بھی فروخت کرنا شروع کیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا۔ ان لوگوں کا فارسی زبان سے بے بہرہ ہونا ان کی بے مائیگی، پردیس اور اس پر وفادار دوستوں کا فقدان، یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو خود دیکھا ہو اور ان کا سامنا کیا ہو۔ آخر جب مہاجرین کی تعداد اور بڑھنے لگی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبوں مثلاً پنجشیر، قطغن، بدخشاں اور ترکستان کو روانہ کیا گیا۔ صرف چند لیک نوجوان ترکستان پہنچے اور وہاں سے تاشقند چلے گئے۔ کچھ قطغن اور بدخشاں میں آباد ہوئے مگر وہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے کچھ نہ سکے بقیہ پھر کابل واپس آئے"[1]

کابل میں افغانیوں کی طرف سے مہاجرین کی سخت مخالفت ہوئی۔ ملکی اور غیر ملکی کا بھی سوال پیدا ہوا۔ حکام

---

[1] آپ بیتی صفحہ 213

افغانستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ایک دن سب کو حکم ہوا کہ کوتوالی پر سب لوگ معہ بستر حاضر ہوں اور جب سب لوگ حاضر ہوئے تو ایک افسر نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ کر کے کہا کہ پانچ منٹ کا وقت دیا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کر لو کہ کابل سے نکل کر فلاں مقام پر جانے کے لیے تیار ہو یا نہیں۔ وہ مقام دلدلی تھا۔ ایک کالج کا گریجویٹ بھی مہاجرین میں تھا وہ بھی اسی طرح گھڑی پر نگاہ جمائے رہا اور پانچ منٹ گزرتے ہی کہا کہ "پانچ منٹ گزر گئے ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اب وہاں نہیں جائیں گے"! افسر سے کچھ نہ بن پڑا اور اس وقت بات ٹل گئی۔ بعدہٗ انھیں جبراً افغانستان خالی کرنے کو کہا گیا۔ مہاجرین نے تب ایران جانے کا فیصلہ کیا۔ ایران کی حکومت کو اطلاع ہوئی تو وہاں کے اخبارات نے ان مہاجرین کا زبردست خیر مقدم کیا۔ اس زمانہ میں اخبار زمیندار کے دفتر میں ایرانی اخبارات آتے تھے ان میں لکھا گیا کہ ہم وہ ہیں جنھوں نے ہمایوں کو پناہ دی تھی۔ ہماری مہمان نوازی شہرہ آفاق ہے۔ ہم مہاجرین کو اپنی پلکوں پر جگہ دیں گے۔ اخبار "زمیندار" نے ایک زوردار مقالہ مہاجرین کی حمایت میں لکھا جس پر محمود طرزی کا ایک خط اس کی تردید میں دفتر زمیندار میں غلام رسول مہر کے پاس آیا اس وقت تک مہاجرین کا قافلہ ایران کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب یہ لوگ جا رہے تھے تو افغانی دو رویہ کھڑے پکار رہے تھے "بزن ایں ہندیاں را ایں دزد اند" (مارو ان ہندوستانیوں کو یہ چور ہیں) لیکن قبل اس کے کہ قافلہ اور آگے بڑھے انور پاشا نے ایک خط امیر امان اللہ خاں کو لکھا اور ان کو مشورہ دیا کہ مہاجرین کو جانے نہ دیں ورنہ ان کی حکومت کل دنیائے اسلام میں بدنام ہو جائے گی۔ یہ وقت تھا جب محمود طرزی نے اپنا تردیدی بیان اخبار زمیندار کو بھیجا تھا۔ چنانچہ مہاجرین واپس بلائے گئے لیکن مشکلات وہی تھیں اور رفتہ رفتہ سب لوگ بہت کچھ کھو کر واپس آ گئے۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ صرف اس تحریک کی تباہیاں اور بربادیاں مسلمانانِ ہند کو ایک دائمی سبق دے گئیں کہ ان کے لیے اپنے وطن کے باہر گنجائش نہیں ہے۔

مولانا آزاد کا منشا صرف یہ تھا کہ دین کے راستہ سے مسلمانوں کو سیاست میں داخل کریں جو عرصہ سے اسے شجرِ ممنوعہ قرار دیے ہوئے تھے اور تحریکِ خلافت نے براہ راست وہ کام کر دیا تو پھر اس درمیانی تدبیر کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

یہ بات کہ ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری نے دیا تھا اس درجہ عام ہو گئی ہے کہ ظفر حسن ایبک نے اپنی "آپ بیتی" میں بھی بار بار لکھا ہے کہ ہجرت مولانا عبدالباری کے فتویٰ کی وجہ سے ہوئی۔ اور گویا کہ وہی اس کے آرگنائزر تھے۔ لیکن یہ بے بنیاد بات ہے۔ غلط فہمی کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا عبدالباری اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلّم قائد تھے اور عوام ہوں یا خواص، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا علما سب میں یکساں مولانا کا ایسا وقار تھا کہ کسی بڑے پیمانے کی تحریک کا سوائے ان کی جانب سے ہونے کے اور کوئی

خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

مولانا نے ہجرت کے فتوے کو بہت سے قیود میں ڈال دیا تھا جس کو پڑھنے کے بعد کوئی اور نتیجہ نکالا ہی نہیں جا سکتا کہ مولانا نے اس کی ابتدا نہیں کی تھی اور نہ اس کے سرگرم حامی تھے اور نہ اسے فرض یا واجب کا درجہ دیا تھا جیسا کہ مولانا آزاد کا فتویٰ تھا۔ بلکہ اسی لیے مولانا ثناء اللہ امرت سری اور مولانا عبدالباری سے بحث بھی ہوئی تھی وہ بحث خالص علمی ہے کیونکہ مولانا ثناء اللہ نے خود نہ ہجرت کا فتویٰ دیا نہ مخالفت کی اس لیے اس بحث کو ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ مولانا کا فتویٰ ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ حقیقت منکشف ہو جائے سب سے پہلے یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہجرت کے بارے میں مولانا نے از خود کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے کیا، جنھوں نے ایک مکمل رسالہ ہجرت بھی لکھ ڈالا تھا جس کا حوالہ خود مولانا نے اپنے فتوے میں دیا ہے اور جواب ناپید ہے۔

ایک مہاجر غلام محمد عزیز امرت سری نے ایک تار وائسرائے کو بایں مضمون دیا "چونکہ مذہب اسلام ہم کو اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا اس لیے ہم مہاجرین کا مقصد ہے کہ ہم نہایت امن کے ساتھ اس ملک کو چھوڑ دیں۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں کہ آپ ہمارے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں گے۔" اسی کے ساتھ ہی انھوں نے مولانا عبدالباری سے فتویٰ بھی طلب کیا۔ چنانچہ مولانا نے حسب ذیل جواب دیا:

> "ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو۔"

سیاق و سباق سے معلوم ہو گا کہ مولانا نے نہ ہجرت کی دعوت دی نہ اس کو فرض واجب قرار دیا۔ بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے جائز کر دیا جو جانا چاہتے تھے۔

یہ اسی قسم کی انفرادی ہجرت کا جواز تھا جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی کے بعد دیا تھا اور جس کی بنا پر "مہاجر مکی" ان کے نام کا جزو بن گیا ہے۔ مولانا عبدالباری کا یہ فتویٰ شروع مئی 1920ء کے اخبارات میں شائع ہوا جس پر کچھ لوگوں نے غلط فہمی کی بنا پر کچھ سوالات کیے۔ مولانا نے اس کی وضاحت کی اور مندرجہ ذیل تحریر اخبار "مشرق" گورکھپور کو روانہ کی جو سوالات میں آگے آگئے تھا اور 6 مئی 1920ء کی اشاعت میں طبع ہوئی ——— اس سے حقیقت کا مکمل انکشاف ہوتا ہے۔

فرنگی محل 2 شعبان 1338ھ

مکرمی دام مجدکم۔ السلام علیکم

بعض حضرات نے مسائلِ ہجرت بذریعہ تار دریافت کیے ہیں۔ اس کا جواب دے دیا گیا مگر مفصل نہیں ہے اس واسطے ان کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔ امید ہے کہ شائع فرما دیجئے گا

ہجرت شرعاً دو طریقوں پر مستعمل ہے۔ ایک ہجرت اوصاف سے دوسری اوطان سے۔ ہجرت اوصاف سے یہ ہے کہ ممنوعات شرعیہ کو چھوڑ دے اور اوامر کا پابند ہو۔ یہ ہجرت ہمیشہ ہمیشہ تک مشروع ہے۔ دوسری ہجرت اوطان سے۔ یہ چند اقسام کی ہے:۔

1۔ ہجرت مکہ سے حبشہ کی جانب دو مرتبہ ہوئی اس وقت جبکہ کوئی دار اسلام نہ تھا تو دارِ شرک سے دارِ اہلِ کتاب کی جانب ہجرت ہوئی یا دارِ ظلم سے دارِ عدل کی جانب۔ اور اگر نجاشی کا اسلام مان لیا جائے اور اصل حکم دار بوجہ سلطان کے فرض کیا جائے تو وہ بھی ہجرت دار اسلام کی جانب ہوئی۔

2۔ ہجرتِ مکہ شریف سے جو اس وقت دارالحرب تھا مدینہ طیبہ کی جانب جو دارالاسلام تھا۔ یہ ہجرت فرض تھی اور فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگئی۔ یعنی جو ایمان لائے وہ ہجرت کرے تب تو تمام احکام میں مسلمانوں کا شریک ہے ورنہ نہیں۔ یہاں تک کہ توارث وغیرہ میں بھی حق نہیں ہوتا۔ امام رازی کے بیان کے مطابق یہ ہجرت اس وقت پھر فرض ہو جائے گی جب کہ مسلمانوں کی اگلی حالت لوٹ آئے اور سوائے ایک مامن کے کوئی نہ ہو۔

3۔ ہجرت بادیہ نشین کی مدینہ طیبہ کی جانب۔ یہ حقوق میں مساوات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ یہ بھی منسوخ ہوگئی بلکہ حکم ہوگیا کہ جہاں کوئی شخص پیدا ہوا اور اس مقام پر نماز وغیرہ ارکان اسلام ادا کر سکتا ہو تو اس کو ہجرت کی ضرورت نہیں۔

4۔ دارِ فسق و ظلم سے دارِ عدل و تقویٰ کی جانب ہجرت۔ بلکہ اس زمین سے جہاں گناہوں کی کثرت ہو وہ خود مرتکب ہوں یا دوسرے۔ یہ ہجرت مستحب ہے۔

5۔ دار حرب سے دار اسلام کی جانب ہجرت مستحب ہے اور بعض صورتوں میں واجب ہو جاتی ہے بلکہ توطن دار حرب میں بلا ضرورت شرعیہ حرام ہے۔ ہم لوگ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھتے ہیں اور اعزاز دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے۔ مگر جب چارہ نہ ہو بجز اس کے کہ یا ہجرت کرے یا ابتلائے مصیبت

رہے یا استرضا بالمعصیت کا ارتکاب ہو، یا قیام وطن سے اس قدر خدمت نہ کر سکیں جتنی کہ باہر نکل کر کر سکتے ہیں تو ان صورتوں میں ہجرت مشروع ہے۔ موجودہ حالت میں ہندوستان سے اگر قابل و ذی استعداد لوگ کابل ہجرت کریں یا محنتی و جفاکش لوگ ترک وطن کر کے وہاں جائیں تو امید ہے کہ اسلام کو فائدہ زائد حاصل ہوگا اور اپنے وطن عزیز کی بھی خدمت کریں گے۔ احادیث سے آخر زمانہ میں شام کی جانب ہجرت کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

ظفر حسن ایبک جو ایک ذہین اور پرجوش نوجوان، مولانا عبید اللہ سندھی کے دست راست تھے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا عبد الباری نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر (جو صریحاً غلط ہے) فتویٰ دیا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد میں ہجرت کی تیاریاں ہونے لگیں[1]"

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ "امیر امان اللہ خاں کو امید تھی کہ ہماری جماعت کی طرح لکھے پڑھے ہندوستانی اس تحریک کے ذریعہ افغانستان آئیں گے لیکن یہاں تو یہ ہوا کہ جتنے ان پڑھ کاشتکار تھے اس تحریک میں شریک ہو گئے" پھر ان کے عظیم مصائب کا تذکرہ کیا ہے۔

ایبک نے لکھا ہے کہ "افغانستان میں جتنی کوتاہ اندیشی ہوئی اتنی ہی بد انتظامی ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئی۔ کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا کہ امیر کابل کو خط لکھ کر یا آدمی بھیج کر معلوم کریں کہ ان مہاجروں کی پذیرائی اور ان کے بسنے کے لیے کیا انتظامات کیے گئے نہ ہی کسی کی عقل میں یہ بات آئی کہ ان مہاجروں کو چھوٹے چھوٹے قافلے کی شکل میں اور چند چند روز کے فاصلے سے بھیجا جائے تاکہ ایک قافلہ کے رہنے کا اچھی طرح انتظام ہو جائے پھر دوسرا قافلہ روانہ کیا جائے۔ ہجرت کے فتویٰ کے بعد سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے داموں پر بیچ دیے اور نتیجہ و عاقبت کو سوچے بغیر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے" ایبک کی یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا الزام مولانا عبد الباری پر نہیں ہے۔

## ہندوستان میں جوش وخروش

لندن اور پیرس میں دول عظمیٰ کی صلح کانفرنس ہو رہی تھی اور مولانا محمد علی وفد لے کر لندن

---

[1] آپ بیتی صفحہ ۲۰۹

گئے تھے اور وہاں کام کر رہے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا جوش و خروش ہندوستان میں حد سے تجاوز ہو چکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک طرف اپنے امام الہند ہونے کی بیعت لے رہے تھے تاکہ کل ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد کر کے اور ان پر شرعی پابندی عائد کر کے انھیں سیاست میں لاکر ہوا کا رخ موڑ دیں ــــ ہجرت کا فتویٰ بھی دے دیا تھا ' لوگ چل بھی پڑے تھے۔ عوام اپنے جذبات سے بے قابو ہو رہے تھے۔ جلسوں اور کانفرنسوں کی بھرمار تھی۔ مگر صرف جذبات میں ابال لانے اور بے مقصد قربانی دینے سے تو کوئی کام بن نہ سکتا تھا۔ البتہ ان صحیح جذبات کو عمل کے میدان میں جھونک دینے کے لیے مہاتما گاندھی مکمل عدم تعاون کا طبلِ جنگ بجانے کی تیاری میں معروف تھے۔ صلح کانفرنس کی بس ضابطہ کی خانہ پری کے لیے انتظار تھا

## میرٹھ خلافت کانفرنس

چنانچہ 23 مارچ 1920ء کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی زمین کے گز بنے ہوئے تھے اور بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہر ضروری آدمی سے مل کر بات کرنا، ہر جلسہ میں شریک ہونا گویا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ میرٹھ کانفرنس میں بھی وہ شریک تھے۔ انھوں نے وہاں دلّی کے لیڈروں کا فیصلہ سنایا کہ اگر ترکی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم کو اتنا اور کرنا ہوگا۔ اس میں عدم تعاون کی پوری اسکیم تھی۔ مہاتما گاندھی نے یہ بھی کہا کہ اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ پوری اسکیم کو مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا۔

(1) تمام سرکاری خطابات اور سول عہدوں سے علیحدگی۔

(2) فوج اور پولیس کی نوکری سے علیحدگی۔

(3) ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجب الادا رقوم کی ادائیگی سے انکار۔

اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ابھی بھرپور ترکِ تعاون شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی جماعت نے اسے پاس کیا تھا کہ حکیم اجمل خاں صاحب نے پہل کی اور انھوں نے ڈپٹی کمشنر کو حسبِ ذیل چٹھی لکھی :۔

جناب !

ہندوستان کے مسلمانوں نے ابتدائے جنگ سے وقفہ جنگ کے زمانہ تک جس صبر و سکون کا ثبوت دیا وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ باوجود انتہائی دلی تکلیفوں کے جن کا سلسلہ سلطنت عثمانیہ کے واقعات (دوران وقفہ جنگ) سے شروع ہوتا ہے۔ آج تک انھوں نے کسی جگہ ایک ادنیٰ دست درازی کی مثال بھی ہندوستان کے کسی حصّہ میں پیش نہیں کی بلکہ وہ جنگ

میں برٹش فوجوں کے ساتھ درۂ دانیال، شام، عراق عرب اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں بھی شریک کار رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مقامات مقدسہ محفوظ رہیں گے جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن ان میں سے صحیح معنوں میں ایک بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مکہ شریف جو مقامات مقدسہ میں سب سے زیادہ مقدس مقام اور مدینہ پاک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن ہے اس وقت واقعی طور پر شریف حسین کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بیت المقدس اسلامی ہاتھوں سے لے کر یہودیوں کو دیا جارہا ہے۔ اور عراق عرب کے تمام مقدس مقامات اس وقت براہ راست ہماری گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس طرح جزیرۃ العرب کا باقی حصہ بھی بڑی حد تک برٹش اقتدار میں ہے۔ قسطنطنیہ اور تھریس کے متعلق جو وعدے کیے گئے تھے ان کے ایفا کرنے کے عوض میں خود قسطنطنیہ میں فوج اتار دی گئی ہے اور یہ تجویز کر لی گئی ہے کہ خلافت ہمیشہ کے لیے درۂ دانیال کی انٹرنیشنل توپوں کی زد میں رہے۔

مسلمانوں نے اب تک وہ تمام جائز ذرائع برٹش گورنمنٹ کی توجہ کو اپنے مطالبات کی طرف مبذول کرنے کے لیے استعمال کیے جو ان کے خیال میں آسکتے تھے لیکن ان کے حقوق اور ان کی درخواستوں کے کسی کم سے کم حصہ کی طرف بھی التفات نہیں کیا گیا۔ ایسی حالت میں بحیثیت ایک حقیر مسلمان کے ان عزتوں سے (سلطنت عثمانیہ کے خلاف برٹش گورنمنٹ کے طریقۂ عمل کو قابل اعتراض سمجھتے ہوئے) دست کش ہوتا ہوں جو مجھے گورنمنٹ کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ میں قیصر ہند کو گولڈ مڈل اور دو انگلستان اور ہندوستان کی تاج پوشی کے درباروں کے تمغوں کے ساتھ جنھیں میں آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں آج کی تاریخ سے حاذق الملک کے خطاب سے بھی اپنے آپ کو سبکدوش سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرا نام درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ امید ہے کہ آپ براہ مہربانی میری اس چٹھی کو لوکل گورنمنٹ کی خدمت میں ان تمغوں کے ساتھ بھیج کر مجھے شکر گزار فرمائیں۔ چونکہ یہ مسئلہ پبلک سے تعلق رکھتا ہے اس لیے میں اس چٹھی کی نقل پریس کو بھی بھیج رہا ہوں۔[1]

اجمل

اسی طرح کالجوں میں بھی طوفان اٹھ رہا تھا۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور ہندوستان میں مسلمانوں کی

---

[1] "مشرق" مورخہ 8 اپریل ۱۹۲۰ء صفحہ 15

سب سے بڑی انجمن تھی۔ اس کی سرکردگی میں نہ صرف ایک عالی شان عربی مدرسہ اور ایک بڑا یتیم خانہ تھا بلکہ ایک ہائی اسکول ایک انٹر کالج ایک ڈگری کالج بھی تھا اور ایک بڑا پریس تھا جہاں تصنیف و تالیف کا بھی کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کی مفید کتابیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے سرکاری امدادی مکاتب میں بھی وہیں کا کورس منظور شدہ تھا۔ اس کے کالج کے لڑکوں نے یونیورسٹی کو اپنے استعفیٰ داخل کر دیے۔ ان سے کہا گیا کہ استعفیٰ واپس لے لو خواہ قواعد میں شریک نہ ہونا۔ مگر انھوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیے۔

## دیوبند کا عظیم الشان جلسہ

۱۹ مارچ 1920ء کو دیوبند میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کا اعلان اشاعت کے لیے مختلف اخبارات مثلاً آفتاب، ہمدم، پیسہ اخبار، الخلیل میں بھیجا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ متبعین دیوبند جہاں کہیں بھی ہوں اس کام میں اخلاص تدین اور فہم کے ساتھ حصہ لیں۔ چنانچہ جلسہ میں شہر اور دیہات کے ہزاروں مسلمان شریک ہوئے اور مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی نائب مہتمم نے اپنی بیماری اور ضعف کے باوجود ایک نہایت پر درد تقریر کی جس میں فرمایا کہ اسلام اور خلافت توام ہیں۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی کم طاقتی کا احساس ترک کر دیں کیونکہ اصل طاقت خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے فرعون جیسے جابر کے مقابلے میں کمزوروں اور نہتوں کی امداد کی تھی۔ تقریر اتنی پر زور اور درد انگیز تھی کہ سارے مجمع پر رقت طاری ہو گئی۔ حتیٰ کہ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جب وہ مولانا کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی آواز رندھ گئی اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ حسب ذیل تار ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کو روانہ کیا جائے۔

> "دیوبند کی مذہبی جماعت بھی جمہور اہل اسلام کی طرح تجزیہ ترکی پر جس سے خلافت اسلامیہ پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے۔ ہز مجسٹی کی خدمت میں اپنے نہایت ہی گہرے صدمے اور اضطراب کا اظہار کرتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ مجسٹی کی گورنمنٹ کے ذمہ دار ارکان ایک ایسی شدید بے چینی پیدا کرنے والی پالیسی کو جلد تر تبدیل کریں جس کے نتائج بہت ہی خوفناک صورت پیدا کر سکتے ہیں اور جس سے برٹش گورنمنٹ کے عہود و مواعید بے اعتبار ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی فرد مسلم اپنی آنکھوں سے اقتدار کی تباہی کو نہ دیکھ سکا۔"[1]

---

[1] "مشرق" ۸ اپریل 1920ء صفحہ 16

پھر مجمع نے نہایت تضرع وزاری سے دعا کی اور اس کے بعد مطبوعہ دعائے قنوت تقسیم کر دی گئی۔

یہ دعائے قنوت فجر کی نماز میں آخری رکعت کے رکوع سے اٹھ کر اور سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہہ کر اور سجدہ میں جانے سے قبل حالت قیام میں امام جہر یا غیر منفرد اسے پڑھتا تھا اور تب تکبیر کہہ کر سجدہ میں جاتا ہوتا تھا۔ بتلایا گیا تھا کہ یہ دعا سخت اضطراب کی حالت میں پڑھی جاتی ہے۔ یہ دعا برابر سالوں تک پڑھی جاتی رہی تھی۔ میں خود بھی پڑھتا تھا اور زبانی یاد کر لی تھی۔

## 19 مارچ 1920ء — یوم خلافت

17 اکتوبر 1919ء کو خلافت کمیٹی بمبئی کی ہدایت پر تمام ہندوستان میں یوم دعا منایا گیا تھا۔ اب 19 مارچ 1920ء کو گاندھی جی کے مشورے سے خلافت کمیٹی نے تمام ہندوستان میں یوم خلافت منانے اور قوم کو ستیہ گرہ کے لیے تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں، ضلع اور تحصیل کے صدر مقاموں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں یہ جلسے بڑے جوش وخروش سے منائے گئے۔ مکمل ہڑتال کی گئی۔ یہ جلسے تمام ہندوستان میں گویا ستیہ گرہ کی ریہرسل تھے اور پورے امن وامان کے ساتھ ہر جگہ جلسے ہوئے۔ مشرق گورکھپور نے اپنی 25 مارچ 1920ء کی اشاعت میں ضمیمہ ب پر حسب ذیل رپورٹ درج کی ہے:

> "دہلی، کلکتہ، لاہور، بمبئی، لکھنؤ، بجنور، امروہہ، مرزاپور، جونپور، بنارس، کانپور...، رائے بریلی، آگرہ، سہارنپور، غرضیکہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں ہی میں نہیں بلکہ قصبات اور دیہات تک میں 19 مارچ کو عام ہڑتال ہوئی اور جلسے سکون اور خاموشی سے ہوئے۔ مسٹر گاندھی نے بمبئی کے جلسہ میں فرمایا کہ ابھی ضرورت باقی ہے کہ اور ہڑتالیں ہوں اور ستیہ گرہ کی جائے۔"

اسی میں صفحہ 17 پر درج ہے کہ:

> "بستی شہر اور پکہ بازار میں عام ہڑتال ہوئی اور کاروبار بند ہو گئے تھے۔ تمام دن مسلمانوں نے دعاؤں اور عبادت میں گزارا۔ جمعہ کی نماز عیدگاہ میں بڑی جمعیت کے ساتھ ہوئی۔ مولانا سید فاخر الٰہ آبادی نے نماز پڑھائی۔ اور پر درد دعا میں حاضرین کو زار وقطار رلایا۔ 5 بجے شام سے ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ بابو دولت رام صاحب وکیل نے پرجوش تقریر میں یہ ظاہر فرمایا کہ ہندو برادران وطن مسلمانوں کے ساتھ ہر نازک وقت میں شریک حال رہیں گے تمام وکلاء وقانون پیشہ ہر طبقہ کے لوگوں کا ایسا عظیم الشان اجتماع بستی میں اس سے پہلے کبھی نہ

ہوا تھا۔ مولانا سید محمد فاخر صاحب نے دو گھنٹہ تقریر کی۔ کلکتہ خلافت کانفرنس کے ریزولیوشن دہرائے گئے اور وائسرائے ہند کی معرفت ملک معظم کو آخری پیغام پہنچایا گیا۔ یہی حال مضافات کا تھا یعنی گنیش پور یانسی وغیرہ"

اس کے بعد اور اس کے پہلے کانفرنسوں اور جلسوں کی بھرمار تھی۔ جلسوں میں جاکر اور تکبیر کے پر زور نعرے لگاکر مسلمان اپنے جوش کا اظہار کر کے اور حکومت برطانیہ سے اختلاف کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرتے تھے اور کسی راہ عمل کے منتظر تھے۔ چنانچہ 22 اپریل 1920ء کو فیض آباد میں اودھ کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان ہوا اور مختلف جگہوں پر جلسے منعقد ہوئے لیکن رہنمایان قوم نے اب ٹھوس کام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چنانچہ اپریل 1920ء کے آخری ہفتے میں مولانا عبدالباری کا حسب ذیل خط ہمدم لکھنؤ میں شائع ہوا۔

"خلافت کانفرنسیں بقدر ضرورت ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں مسلمان ضرورت سمجھیں کریں لیکن بلا ضرورت محض دیکھا دیکھی ایسے کانفرنسوں کے انعقاد کی اب ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ میری رائے یہ ہے کہ مسلمان اس سلسلہ کو موقوف کریں۔ خصوصاً بغیر اجازت سنٹرل کمیٹی بمبئی کے انعقاد کسی کانفرنس کا خلافت کے متعلق ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اور شرکت اس قسم کے جلسہ کی اصولاً لازم نہیں ہے۔ وقت کام کرنے کا ہے۔ دوسروں پر اپنا بار نہ ڈالے۔ اگر ملک کے کسی حصہ میں ضرورت انعقاد کانفرنس کی ہو تو مقامی حضرات اس میں شرکت فرمائیں۔ ایک دو مقرر و علما باہر سے بھی بلالیے جائیں مگر تمام مشاہیر کی دعوت بلا ضرورت قابل ترک ہے۔ میں نے اپنے متعلق فیصلہ کرلیا ہے کہ سوائے اس صورت کے میری شرکت سے معتد بہ فائدہ مقصود ہو۔ محض نمائش کے لیے بلا رعایت جلسوں کی شرکت سے انکار کردوں گا۔ .. مجھ سے میرے احباب خواہش کرتے ہیں کہ میں سربرآوردہ حضرات کو ان کی مرضی کے موافق تکلیف دوں اب تک اس خدمت کو انجام دیا۔ اب اس قدر زائد یہ خدمت لی جانے لگی ہے کہ اس کے انجام دینے سے قاصر ہوں۔ میری حالت یہ ہے کہ ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اسی طرح کا موزوں تھا جب 18 اپریل 1920ء کو 11 بجے دن کے وقت ورکرز کانفرنس رائل تھیٹر دلی میں زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہوئی جس میں مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ خلافت کمیٹی نہ مسلمانوں سے ہجرت کو کہتی ہے نہ جہاد کو۔ وہ چاہتی ہے کہ گورنمنٹ کے ساتھ عدم اشتراک عمل کے اصول کام میں لائے جائیں اور سودیشی تحریک کی ترقی کی کوشش کی جائے۔

صدر صاحب نے فرمایا کہ اس کانفرنس کا مقصد کسی نئی پالیسی کا ایجاد کرنا نہیں ہے بلکہ جو تجاویز خلافت کانفرنس یا انجمن علمار ہند پاس کریں ان کو عمل میں لانا ہے۔ ہندوستان کے تمام لیڈر اور خلافت کانفرنس سودیشی عدم اشتراک عمل کی تجاویز پاس کر چکے ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنانا اس کانفرنس کا فرض اوّلین ہے۔

## لاہور میں ڈاکٹر کچلو کی معرکتہ الآرا تقریر

لاہور میں ایک میلہ چراغاں ہوتا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے ایک عظیم الشّان جلسہ 28 مارچ 1920ء کو کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے فرمائی۔ یہ جلسہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ڈاکٹر کچلو نے تحریک عدم تعاون کی پرزور تائید دلائل قطعی سے کی۔ آپ نے فرمایا:

• جہاد ہر وقت فرض ہے اور ہر اس وقت جب اسلام پر کوئی طاقت حملہ آور ہو اور مذہبی جنگ ہو۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ جہاد کے لیے تیار رہیں لیکن جہاد کے مختلف طریقے ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ جہاد بالسیف ہے۔ اگر آپ کے پاس تلوار نہیں توپ بندوق جنگی جہاز اور پورا پورا سامان نہیں ہے تو اس حالت میں ہمارا مذہبی فرض کیا ہے؟ ایسی حالت میں اگر اعلان کر دیا جائے کہ مسلمانو! اٹھو اور انگریزوں کو مار ڈالو۔ آپ نے اگر ایک دو درجن انگریز مار ڈالے تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا ایک ہوائی جہاز آپ کے لیے کافی ہے۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام آپ کو معلوم ہے۔ ایسی حالت میں مذہب آپ کو تلوار سے جہاد کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

### ہجرت کا سوال

اپنے بال بچوں سمیت تن تنہا یا سامان سمیت کسی دوسرے ملک کو چلے جائیں۔ ہمارے پاس جہاز اور وسائل نہیں، سات آٹھ کروڑ کی آبادی کہاں جا سکتی ہے۔ یہ بھی ناممکن العمل ہے پھر باقی کیا رہ گیا۔ دونوں سے زبردست طاقت جس کے ذریعہ سے آپ ایک ماہ کے اندر ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ (1) تمام خطابات گورنمنٹ کو واپس کر دیے جائیں (2) فوج اور پولیس کی ملازمت کو ترک کر دیں (3) ٹیکس مالیہ محصول وغیرہ کی ادائیگی سے انکار۔[1]

---

[1] مشرق 8 اپریل 1920ء صفحہ 17

# علمائے صوبہ متحدہ کا عظیم الشان جلسہ

۵ و ۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو علمائے صوبہ متحدہ کا ایک عظیم الشان جلسہ تمام علماء کو مسئلہ خلافت پر مجتمع کرنے کے لیے منعقد ہوا کثیر تعداد میں علما و عوام شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں جوش و خروش کی تقریروں کے ساتھ حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:۔

(۱) علماء فوراً مسئلہ خلافت میں رائے عامہ کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لیں۔

(۲) مخالف و منافق علماء کا مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) خلافت کانفرنس کلکتہ کے تمام ریزولیوشن اور مولانا عبدالباری کی اس تقریر کی جو ممدوح نے اس موقع پر کی تصدیق و تائید کی جائے۔

(۴) مولانا عبدالباری کا فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ خلافت کے فیصلہ پر اس پر عملدرآمد کیا جائے

(۵) حکیم اجمل خاں کو سرکاری خطاب و اعزاز کی واپسی پر مبارک باد دی جائے اور انھیں قومی خطاب مسیح الملک و رئیس الحکماء کا بطور نشان قدردانی عطا کیا جائے۔

(۶) یہ جلسہ تمام خطاب یافتگان علماء پر زور دیتا ہے کہ اپنے خطابات واپس کر دے۔

(۷) علماء جان و مال، تقریر و تحریر سے مسئلہ خلافت کی تائید کرنے کا حلف اپنے مریدوں اور تمام مسلمانوں سے لیں۔

(۸) سپاہ کی بھرتی روکی جائے۔

(۹) مسلمان آئینی اصلاحات کے ماتحت ہونے والے انتخاب سے اپنے کو الگ رکھیں۔

(۱۰) صلح کانفرنس کے مسئلہ خلافت میں احکام شرع اسلام کے مخالف فیصل ہونے کا دن مطالبہ کی حکومت سے کامل آزادی کا بھی دن ہو۔

علماء کی ایک جمعیۃ کی ترتیب دی گئی جس میں ۲۴ ارکان تھے اور مولانا عبدالماجد بدایونی اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ بدایون صدر دفتر قرار دیا گیا۔ گورنمنٹ ان جلسوں، جلوسوں سے بہت پریشان تھی۔ ہر جلسہ کے وقت گورنمنٹ نے اپنی فوجیں، مشین گن کے ساتھ مارچ کی تھیں مگر پبلک نے خائف ہونا تو کجا ان کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ نظام حیدرآباد کے متعلق مشہور ہوا تھا کہ جب خلافت کے لیے بعد نماز جمعہ دعا ہو رہی تھی تو انھوں نے بڑے زور سے آمین کہا تھا اور خواجہ حسن نظامی نے بھی گورنمنٹ ہند کو نظام کی حمایتِ خلافت کی اطلاع دی تھی جس کا ذکر مولانا محمد علی نے بھی تعجب کے ساتھ کیا اس لیے ان کو مجبور کیا گیا اور ۷ اپریل ۱۹۲۰ء کو اعلیٰ حضرت

بندگان عالی متعالی" حضور نظام مدظلہ العالی نے اپنے دستخط سے ایک فرمان جاری کیا جس میں تمہیدی الفاظ کے بعد حسب ذیل حکم تھا۔

"میں اپنی عزیز رعایا کو محفوظ رکھنے کی غرض سے حکم دیتا ہوں کہ مسئلہ خلافت کے تعلق سے جو جلسے منعقد ہوں ان کے منتظمین پر شرائط ذیل کی پابندی عائد کی جائے۔

(1) ایسے جلسوں میں جو تحریکات پیش کرنی مقصود ہوں قبل از قبل ان کے نقول بغرض صدور حکم سرکار گزارے جائیں۔

(2) جلسہ کے مقام اور تاریخ کی اطلاع کم از کم ایک ہفتہ قبل ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کو (جیسی کہ صورت ہو) بذریعہ تحریر دی جائے۔

(3) ہر جلسہ کی صحیح روئداد بلا تعویق ناظم فوجداری ضلع یا ناظم فوجداری بلدہ کے پاس (جیسی کہ صورت ہو) بغرض اطلاع سرکار کو بھیج دی جائے۔

(4) ان ہدایات کی خلاف ورزی سخت باز پرس کے قابل ہوگی۔[1]

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی" کے حکم پر گردن جھکانے کے دن گزر چکے تھے۔ چنانچہ حکم عدولی ہوئی۔ گرفتاریاں اور نظر بندیاں ہوئیں لیکن قافلہ رواں دواں رہا۔

---

[1] "مشرق" 15 اپریل 1920ء صفحہ 20

## ساتواں باب

# اعلانِ وفاداری کا انجام

## حالات یورپ و ترکی

اب آیئے ان حالات کو یہیں چھوڑ کر حالات ترکی پر نظر ڈالیں۔ مگر کچھ اور لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اناطولیہ تھریس اور سمرنا کی جغرافیائی پوزیشن بتلادی جائے کیونکہ اکثر لوگوں نے صرف ان باتوں سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ یہ کہاں ہیں اور کیا ہیں کم لوگ جانتے ہیں۔

## اناطولیہ

اناطولیا ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی مشرق کے ہیں اور جغرافیہ میں اس کا اطلاق ایشیائے کوچک اور سلطنت عثمانیہ کے بعض دیگر ایشیائی حصّوں پر ہوتا ہے۔ رومیوں کے زمانے میں اناطولیہ کو ایشیائے کوچک کہتے تھے۔ اناطولیہ کا رقبہ بارہ ہزار مربع میل ہے۔ یہ سات سو میل زیادہ سے زیادہ لمبا اور چارسو میل زیادہ سے زیادہ چوڑا ہے۔ اندرون ملک پہاڑوں کا سلسلہ ہے جن میں سب سے بڑا کوہ طورس ہے جو ساحل بحر سے دریائے فرات تک جاتا ہے۔ دریاؤں میں سب سے بڑا دریا سقاریہ ہے۔ یہیں حکیم فیثاغورس اور مشہور زمانہ شاعر ہومر پیدا ہوئے۔

اناطولیہ کا مشہور شہر انگورہ قسطنطنیہ سے 215 میل کے فاصلہ پر مشرق و جنوب مشرق گوشہ پر واقع ہے اور سمرنا سے 330 میل جنوب مشرق کی طرف ہے۔ دوسرا شہر اطنہ ایک بہترین کارآمد اور خوش نما شہر ہے۔ تیسرا شہر بروصہ ہے جہاں مسجد خضرا بہت مشہور ہے۔ سمرنا ایک عظیم الشان اور خوبصورت شہر خلیج ازمیر کی مشرقی ارس پر واقع ہے۔ سمسون ایشیائے کوچک (اناطولیہ) کا مشہور بندرگاہ بحیرۂ اسود کے کنارے پر واقع ہے۔ سینوپ اناطولیہ کا ایک مشہور شہر اور بندرگاہ ہے مشہور فلسفی دیو جانس کلبی یہیں پیدا ہوا تھا۔ جانقیہ

یہ شہر انگورہ سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک پُرفضا پہاڑی کا نام ہے۔ یہیں ایک گاؤں بھی آباد ہے جو انگورہ کا گویا ایک محلّہ ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا چانقیہ میں رہتے تھے۔ طرابزون قسطنطنیہ سے ۹۰۰ کلومیٹر اور ارض روم سے 140 کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک مستحکم شہر ہے۔ عسکی شہر بروصہ کے ضلع میں ہے اور ریلوے اسٹیشن بھی ہیں۔

## تھریس

ترکی کا ایک صوبہ تھریس ہے جس میں مسلمانوں کے مشہور شہر ایڈریانوپل اوڈین اور روڈیتہ واقع ہیں۔ ایڈریانوپل میں سلطان سلیم کا مقبرہ ہے اور بہت عالیشان مساجد ہیں۔ اس کا ایک علاقہ رڈ دستوکیل پولی سے صرف ۶۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہیں پر اگست 1922ء میں یونانیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا تھا جس کا پردہ غازی مصطفےٰ کمال نے اپنی شمشیرِ خارا شگاف کے نوک سے چاک کر دیا۔

## یونان کا حملہ

عارضی صلحنامہ نے ترکانِ آحرار اور دنیائے اسلام کے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ ابھی عارضی صلحنامہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ۶ مئی 1919ء کو جہاں صلح کانفرنس بیٹھی ہوئی تھی اور جہاں جرمنی ہر شرط کو جیسے وہ اپنے مفادِ قومی کے خلاف پاتا تھا ٹھکرا دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اخبار دل نے یہ کہنا شروع کیا کہ کیا ابھی جرمنی میں لڑائی کا دم خم باقی ہے۔ کلیمنشو وزیرِ اعظم فرانس اور لائیڈ جارج کی تائید سے یونانیوں کو اناطولیہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ عارضی صلح کے بعد حالات بدستور قائم رکھے جاتے ہیں جب تک کہ مکمل صلح نہ ہو جائے۔ لیکن ترکی کے ساتھ مسیحی اور اسلامی جنگ کا نقشہ تھا۔ قانون روایت، شرافت، اصول انصاف سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ انگریز کا یہ دعوٰی تھا کہ اناطولیہ میں ترک اقلیت میں ہیں اور ترکوں کو وہی علاقے ملے گا جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور اس کے لیے صرف پچاس لاکھ کی آبادی کا ایک حلقہ تجویز کیا گیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا بھی (حالانکہ یہ کذب صریح تھا) تو اس کے لیے رائے شماری کی ضرورت تھی اس کا بھی انتظار نہیں کیا گیا اور ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے 13 مئی 1919ء کو اتحادی بیڑوں کی حمایت میں یونانی فوج سمرنا میں اتری جو ایک بندرگاہ بھی ہے۔ یونانیوں اور اتحادیوں کے لیے یہ ایک نادر موقع اپنے آتشِ عناد کو بجھانے کا تھا۔

ادھر قسطنطنیہ کا عالم یہ تھا کہ جو لوگ ظلِّ سلطانی سے وابستہ تھے سب ہمت ہار گئے اور گرمیٔ مسکین بنے ہوئے تھے حتیٰ کہ ترکی پر حکم برداری قائم ہو جانے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ مجلسِ ملّی (ترکی پارلیمنٹ) نے کچھ دم خم دکھلایا۔ اور ایک تجویز احتجاج کی مرتب کی۔ لیکن سلطان نے مجلسِ ملی کو برخاست کر کے داماد فرید پاشا کو وزیر اعظم علی کمال کو وزیر داخلہ اور عادل بے اور محمود علی کو وزارت میں داخل کر کے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یا یوں کہیے کہ غدّار داماد فرید پاشا کے سپرد کر دیا۔ ترکانِ احرار قتل کیے جا رہے تھے۔ اتحادی اور یونانی جنگی جہاز قسطنطنیہ کے

سامنے لنگر ڈالے پڑے تھے۔ بیرونِ ملک کے افسر کل کلیدی جگہوں پر قابض تھے۔ عوام بے چین تھے۔ ایا صوفیہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ ایک لاکھ کے قریب لوگ جمع تھے۔ اس کے اوپر انگریزی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا۔ مفتی اعظم جو مولانا محمود حسن کے ذہنی ساتھی اور ان کے مشن کے حامی تھے انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے کہنے سے مدافعت ترک کرنے کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے اور دوسرے شیخ الاسلام لائے گئے جو لسان العصر اکبر مرحوم کی زبان میں "بریگیڈ" کے مولوی تھے ۔ بہ تعرف ۔

برگیڈ کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہے ۔۔۔۔ برٹش کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے

یونان کے حملہ کے ساتھ ہی دنیائے اسلام میں ہر جگہ انگریز کے خلاف بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ افغانستان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ عراق میں مجاہدین کی ایک لاکھ فوج بغداد کی طرف کوچ کر رہی تھی۔ ایران میں انگریز کی ریشہ دوانیوں کے خلاف بغاوت ابھر رہی تھی۔ بالشویک روس لینن کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کو ہر جگہ انگریز سے نبرد آزما ہونے کے لیے ابھار رہا تھا اور ہر ممکن امداد دے رہا تھا۔ انور پاشا اور ان کے ساتھی انگریزوں کے مظالم کے ڈر سے وطن چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے۔ اور یہی حال جمال پاشا اور دیگر ترکانِ احرار کا تھا۔ وہاں انور پاشا فروری 1920ء میں روس آئے چنانچہ لینن نے اقوامِ مشرق کی ایک کانفرنس باکو میں منعقد کی۔ وہاں انور پاشا بھی شریک ہوئے۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ روس ایران کی انقلابی جماعتوں کو بھی بغاوت کے لیے اکسا رہا تھا۔

ادھر امیر فیصل اور فرانس کے معاملات طے نہیں ہو رہے تھے۔ فرانس شام پر حکم برداری قائم کرنے پر اصرار کر رہا تھا اور امیر فیصل اپنی غداری کا پورا صلہ مانگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ بنا دیا جائے۔ یہ بات فرانس کو کیسے منظور ہو سکتی تھی اور فرانس کا خیال تھا کہ انگریز فتح کے بٹوارے میں اس کو دھوکا دے رہا ہے اور مُدبّرین برطانیہ فرانس کی دوستی کا جو راگ بار بار الاپتے تھے اس سے وہ متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اٹلی کو بھی یہی شکایت تھی۔ انگریز چودھری بنا ہوا تھا لیکن وہ سب کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ اس کی پالیسی فریب کاری پر مبنی تھی۔ مسٹر ولسن صدر امریکہ نے جو چودہ پوائنٹ دیے تھے ان کا ماننے والا کوئی نہ تھا۔ سمندروں کی آزادی انسانوں کی آزادی، حقِ خود ارادیت وغیرہ وغیرہ کے خوشنما الفاظ کو عمل کا جامہ پہنانا استعماریت سے دست برداری دینا تھا۔ مسٹر ولسن اس بات کا غم کرتے رہے کہ جس لیے انھوں نے معاملاتِ یورپ میں مداخلت کی تھی وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے ہیں۔ صلح کانفرنس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے اور آخر کار مایوس و نامراد امریکہ واپس آئے اور اپنی اس ناکامی سے اس درجہ بددل ہوئے کہ مارچ 1921ء میں وہ گوشہ نشین ہو گئے اور سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ان وجوہات سے صلح کانفرنس جو کبھی لندن اور کبھی پیرس میں ہوتی تھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ رہی تھی۔

ادھر انگریزوں نے 16 مارچ 1920ء کو استنبول پر قبضہ کرلیا اور جو بھی ترکان احرار میں سے ان کو ملا اس کو تہہ تیغ کردیا۔ انگریز کا منشا ترکی کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا تھا۔

اخبار ہفتہ وار مشرق اپنی اشاعت مورخہ 18 مارچ 1920ء میں صفحہ 3 پر لکھتا ہے:۔

"قسطنطنیہ میں ایک عظیم الشان مظاہرہ مسئلہ خلافت کے متعلق ہوا ہے۔ مسجد ایا صوفیہ کے پاس ایک وسیع میدان میں یہ مظاہرہ ہوا تھا۔ اس کی غرض و غایت یہ تھی کہ موجودہ سیاسی حالت پر بحث کی جائے اور ایک یادداشت دولِ عظام کے پاس بھیجی جائے۔ بعد نماز جمعہ جلسہ کا آغاز ہوا۔ یہ میدان دس ہزار میٹر کی وسعت رکھتا ہے پورا میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا مسجد ایا صوفیہ اور مسجد سلطان احمد کے درمیان یہ میدان ہے اور ان دونوں مسجدوں کے تین سو مکبروں نے بعد نماز ظہر پہلے خدائے پاک سے دعا مانگی کہ اسلام کو نجات ہو۔ ایک فرانسیسی خاتون نے ایک پُرجوش تقریر میں کہا کہ فرانسیسی قوم ہر اس قرارداد کے خلاف رہے گی جو ترکوں کی مصالح کے خلاف ہو۔ رضا نور وغیرہ کی تقریریں ہوئیں اور ایک یادداشت سلطان المعظم ایوان سندوبین اور دُوَل یورپ کے پاس بھیجی گئی جو حسب ذیل ہے:۔

آستانہ خلافت اسلامیہ کا مرکز ہے۔ سمرنا کو اس کے مالکوں کی طرف منتقل ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ جنوبی سلطنتوں کی بندرگاہ ہے اور ایک ہزار سال سے زیادہ سے ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایڈریانوپل سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ رکھا جائے کیونکہ آستانہ علیہ کے دفاعی خطوط کا آخری خط ہے۔ اناطولیہ کے مشرقی و مغربی حصے ترکی میں شامل ہیں۔ اور ان کے باشندے اکثر مسلمان ہیں"

مگر ان تمام کارروائیوں کا دولِ متحدہ اور صلح کانفرنس پر نہ تو اثر ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔

## معاہدہ سیورے (ترکی کے ساتھ شرائط صلح)

آخر کار مستقل صلح مختصر مثل ترکی بن کر بھی آگیا اور دولِ متحدہ نے مئی 1920ء میں ترکی کے ساتھ صلح کے شرائط مشتہر کردیے جو معاہدہ سیورے کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کی حسب ذیل شرطیں تھیں:۔

(1) درۂ دانیال اور تمام دیگر درّے بین الاقوامی کنٹرول کے حوالے کردیے گئے۔

(2) سلطان بحیثیت سردار مسلمانان درۂ دانیال کے پھاٹک (GOLDEN HORN) پر سمندر کے کنارے انگریزوں کی آنکھ کے نیچے رہے گا۔

(3) جنوبی اناطولیہ کلیلیا اور اس کا دار السلطنت ادرنہ فرانس کو ملے گا۔

(4) اٹلی کو اادلیہ کی ریاست دی گئی۔

(5) سمرنا یونان کے حوالے ہوا۔

(6) سمندر کے ہر راستوں سے منقطع ہو کر ترکی کو وسطی اناطولیہ دیا گیا۔

(7) عرب صوبے انگلستان اور فرانس کی حکم برداری میں دیے گئے۔

(8) آرمینیا کے لیے ایک جدید ری پبلک وجود میں لائی گئی جو مشرقی صوبوں پر بحرِ اسود کے کنارے واقع ہوگی۔

(9) 2 نومبر 1917ء کو یہودیوں کی انجمن سے فلسطین میں وطن دینے کا جو وعدہ انگریزوں نے کیا تھا اس کے مطابق طے ہوا کہ یہودیوں کو فلسطین میں وطن دیا جائے (مسلمانوں سے جو وعدہ کیا گیا تھا اسے قطعی فراموش کر دیا گیا)

(10) ترکی کی سرحد اسی طرح رہے گی جس طرح کہ اس وقت حد بندی ہو چکی ہے۔ لیکن وہ کمیشن جو حد بندی کے لیے مقرر کیا جانے والا ہے وہ حسب ضرورت اس میں ترمیم کر سکتا ہے۔ اس کے مطابق ترکی میں تھریس کا حلقہ قسطنطنیہ کا علاقہ اور ایشیائے کوچک کے وہ تمام علاقہ جات شامل ہوں گے جن میں ترکی کی آبادی کی اکثریت ہو۔

(11) قسطنطنیہ میں ترکی حقوق و اختیارات میں کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ترکوں نے اس عہد نامہ کے شرائط کو ایمانداری سے پورا نہ کیا تو اتحادیوں کو ان شرائط میں ترمیم کرنے کا اختیار رہے گا۔

(12) ڈیل کے سمندری علاقے اسٹریٹ (آبنائے) کے کمیشن کے زیرِ اقتدار رہیں گے۔ یعنی وہ تمام سمندری علاقے جو بحیرۂ روم کے درۂ دانیال کے دہانہ اور بحیرۂ اسود کے باسفورس سے جنوبی علاقہ کے درمیان ہے۔ اور ان حدود سے ترکی بے تعلق رہے گا۔

اس اعلانِ صلح نے دنیائے اسلام میں ہلچل مچا دی حتیٰ کہ یورپین مورخ جیمس پرداہم جن اپنی کتاب اتاترک میں لکھتا ہے کہ اس کو دیکھ کر سلطان وحید الدین خاں کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

# آٹھواں باب

# مہاتما گاندھی کا اعلان جنگ

## مہاتما گاندھی کی قیادت

مہاتما گاندھی نے اب اپنی پوری اسکیم ستیہ گرہ، عدم تعاون یا نان کوآپریشن کی پیش کر دی تھی۔ وہ کہتے تھے سچ بولو، ہر کام کی بنیاد سچائی پر ہو، جو سوچو وہ کہو، جو کہو وہ کرو، زندگی میں کوئی دھوکہ نہ ہو، انگریز سے نفرت نہ کرو انگریز بھی ہمارے بھائی ہیں، اس طرزِ حکومت سے نفرت کرو جو قائم ہے۔ اہنسا پر عمل درآمد ہو تشدد کسی حال میں نہ آنے پائے۔ عورتیں چرخہ کاتیں۔ مرد کھدر پہنیں۔ اس طرح اکسٹھ کروڑ روپیہ جو ہندستان سے باہر کپڑے کے لیے جاتا ہے ہندوستان میں بچ جائے گا۔ گورنمنٹ سے کسی قسم کا تعاون نہ ہو۔ طلبا اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکل آئیں۔ وکلا وکالت چھوڑ دیں۔ پولیس اور فوج کے ملازمین، دیگر ملازمینِ سرکار کی طرح، استعفیٰ دے دیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ ہماری اسکیم پر لوگ عمل درآمد کریں تو ایک سال میں سوراج حاصل ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی بڑے دانا تھے۔ وہ ملک کے عوام کا مزاج بدلنا چاہتے تھے، ان کے دل سے احساس کمتری اور غلام ہونے کا خیال مٹانے کے خواستگار تھے۔ صرف اسی نفسیاتی انقلاب سے ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف بڑھ سکتا تھا۔ آزادیٔ ملک سے پہلے وہ ضمیر کی آزادی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک باطن کا تزکیہ اور قلب کی صفائی لازمی تھی۔ جب انسان کھدر پہنے، چرخہ کاتے، کوٹ پتلون ٹائی سے بے نیاز ہو تو لازماً اس کا ردِ عمل ایک انقلابی شکل میں نمایاں ہوگا۔ ان انوکھی باتوں سے ہندوستان کو جھنجوڑ دیا۔ اور ہندو ان کو ایک اوتار سمجھنے لگے اور ان کے درشن کی طلب شروع ہو گئی۔ گاندھی جی نے گھڑی کی سوئی کو گھما دیا۔

گاندھی جی زمین کا گز بنے ہوئے چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ خلافتِ اسلامیہ سے جو ہمدردی انھوں نے ظاہر کی اور جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آ گئے اس کا اثر ہر کہہ و مہہ پر تھا اور بہت

جلد وہ مسلمانانِ ہند کے مسلمہ لیڈر بن گئے۔

حکومت نے لڑائی جیتنے کے بعد جا بجا جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا اور آستان بوسانِ سرکارِ عالیہ برطانیہ قصائد مرتب کرنے میں مشغول تھے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو جو یومِ دعا و جلسہ تجویز کیا گیا تھا اسی میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ مسلمان جشن فتح یا صلح، جو بھی کہیے، اس میں شریک نہیں ہوں گے اور اس کا بائیکاٹ کریں گے۔ اس فیصلے کو خلافت کانفرنسوں اور جلسوں میں دہرایا گیا۔ مولانا حسرت موہانی جیسا عظیم انسان و بے لوث لیڈر بار بار اس پر زور دیتا تھا۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس کی تائید کی۔ جو موقع قوم کو ابھار کر حکومت کے خلاف دلیری سے کھڑا کرنے کا آیا اسے گاندھی جی نے استعمال کیا۔ اس طرح اوہامِ غلامی سے گھرے ہوئے دماغ کو وہ آزادی کی فضا میں لانے اور دل کی اجاڑ اور ویران بستیوں کو حبِ وطن سے معمور کرنے کا نہایت مدبرانہ و مخلصانہ عمل کر رہے تھے۔ اس طرح قوم اپنے کو پہچاننے لگی تھی۔ اس کے اندر خود شناسی کا شعور پیدا ہو رہا تھا اور جتنا قوم اپنے کو پہچانتی جا رہی تھی وہ اپنے قائد کو بھی پہچان رہی تھی۔ اب اس کا وہ حال نہ تھا،

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ  پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دوسری خلافت کانفرنس (دلّی) زیرِ صدارت مولوی فضل الحق کے سلسلہ میں ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کے متحدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ خلافت کانفرنس کا یہ اجلاس اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم ترین تھا۔ کیونکہ اس خلافت کانفرنس میں صرف خلافت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے مادرِ وطن کی دونوں قوموں کے قائم مقام جمع تھے۔ گاندھی جی، سوامی شردھانند، پنڈت کرشن کانت مالویہ، ڈاکٹر ساورکر، مسٹر شنکر لال، مسٹر موہن جی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

وقت مقررہ پر گاندھی جی ہال میں داخل ہوئے۔ سب لوگوں نے جے کارے لگائے اور سروقد کھڑے ہو گئے۔ گاندھی جی کا استقبال کیا گیا۔ خواجہ حسن نظامی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرت سری، ڈاکٹر انصاری، سیٹھ عبداللہ ہارون، جان محمد چھوٹانی، ڈاکٹر ساورکر، خان بہادر شاہ ولایت حسین اور مولانا سید محمد فاخر الہ آبادی نے استقبال کیا۔ اس کے بعد گاندھی جی کرسی صدارت پر تشریف لائے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گاندھی جی پر اس قدر پھول پھینکے گئے کہ ان کے گرد پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ جناب دانا اور خلیق کی نظمیں پڑھی گئیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندو ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے بعد حکیم اجمل خاں نے ایک تجویز پیش کی کہ جب تک خلافت کا مسئلہ حل نہ ہو مسلمانوں کے لیے جشنِ صلح میں شریک ہونا ناممکن ہے۔ سوامی شردھانند نے نہایت پر زور تقریر میں اس کی تائید کی۔ سید حسین، کرشن کانت مالوی اور مسٹر موہن جی وغیرہ نے

بھی پرجوش تائیدی تقریریں کیں اور تجویز پاس ہوئی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر کی جس میں آپ نے کہا کہ کسی آدمی کو کسی طرح صلح کی خوشی میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ نہ آتشبازی دیکھنا چاہیے۔ صلح کے جشن میں شریک ہونے سے باز رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے لیے چندہ کی اپیل کی اور بذات خود ایک پیسہ چندہ عنایت کیا۔ بس کیا تھا یہ پیسہ نیلام ہوا۔ اور اسے 501 روپیہ میں سیٹھ چھوٹانی نے خریدا۔ ایک ہزار نقد چندہ وصول ہوا اور ڈیڑھ ہزار کا وعدہ ہوا۔

اس کے بعد ایک دوسرے جلسہ میں عوام کا مطالبہ درشن کا تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ میرا درشن کیا جائے۔ یہ کام کا وقت ہے۔ عورتوں سے کہا کہ تم چرخہ چلاؤ تو میں خود آکر تمہارے درشن کروں گا اور تمہارے پاؤں چھوؤں گا۔

## دورِ خود شناسی

30 مئی 1920ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ بنارس میں ہوا۔ لوکمانیہ تلک اسی دن بنارس سے گزرے لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ اس جلسہ میں یہ طے ہوا کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کا مطالبہ کیا جائے۔ اسی دن خلافت کمیٹی کا بھی جلسہ ہوا۔ خلافت کمیٹی نے ایک سب کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے بنائی کہ آئندہ کیا قدم اٹھایا جائے۔ اس کمیٹی کے ممبران مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اس کمیٹی نے اتفاق رائے سے طے کیا کہ کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے صلح کانفرنس کے فیصلے کا انتظار کر لیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے اس دوران ایک ہندو مسلم کانفرنس یکم جون 1920ء کو بلائی۔ یہ جلسہ بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوا۔ تقریباً تین سو ڈیلیگیٹ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے اور مجمع قریب بیس ہزار تھا۔ اس جلسہ میں مسز بسنت، پنڈت مدن موہن مالویہ، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر وغیرہ بھی تھے۔ سر تیج نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک ترکِ موالات یا ستیہ گرہ میں حصہ نہ لیں۔ مگر رائے عامہ بالکل اس کے خلاف تھی۔ چونکہ معتدلین بھی اس جلسہ میں موجود تھے کسی انتہا پسندانہ تحریک کا پاس ہونا تو مشکل ہی تھا البتہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر زوردار تقریریں ہوئیں۔

## گورنمنٹ کو الٹی میٹم

9 جون 1920ء کو الٰہ آباد میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہوا کہ وائسرائے کو ایک ماہ کی نوٹس دی جائے

کہ وہ خلافت کے مسئلہ کو جو ایک مذہبی مسئلہ ہے طے کرا دیں۔ ورنہ ترکِ موالات پر ہم لوگ مجبور ہوں گے۔ یہ انتباہ ستیہ گرہ کے اصول کے بالکل مطابق تھا۔ کھلم کھلا کام کرنا، سچائی پر اڑنا، مخالف کو موقع دینا اور اطلاع دے کر سول نافرمانی کرنا اس کے بنیادی اصول تھے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس وقت نہ سمجھے ہوں لیکن گاندھی جی عزم راسخ کر چکے تھے۔ اس کے بعد ہی خلافت کمیٹی کا ایک وفد مرتب کیا گیا جو حسب ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔

(1) مظہر الحق

(2) یعقوب حسن

(3) مولانا شوکت علی

(4) مولانا ابوالکلام آزاد

اگر وائسرائے ہند سے آخر جون 1920ء میں ملا اور اس نے وائسرائے سے کہا کہ خلافت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ اس لیے آپ ہوم گورنمنٹ پر دباؤ ڈالیں کہ وہ معاہدۂ صلح ترکی میں مناسب ترمیمات ہمارے مطالبات کے مطابق کر دے ورنہ ہم مجبور ہوں گے کہ یکم اگست 1920ء سے ترکِ موالات کی تحریک جاری کر دیں۔

یہ تھا پہلا الٹی میٹم جو حکومتِ عالیہ برطانیہ کی "وفادار رعایا" نے اوّل بار اپنے آقاؤں کو دیا۔ گویا طوقِ غلامی اتار پھینکا اور آزاد انسانوں کی حیثیت سے بالمقابل کھڑے ہو کر چیلنج دے دیا۔ اب صرف طبل جنگ بجنے کی دیر تھی۔ اس سے پہلے 22 جون 1920ء کو مہاتما گاندھی نے بھی وائسرائے ہند سے اپیل کی جس میں لکھا کہ میں نے لندن میں انڈین والنٹیر ایمبولینس کور وغیرہ میں محنت و جانفشانی سے بھرتی کرائی اور ہمیشہ برطانیہ کا وفادار رہا میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ مسئلہ خلافت کو مسلمانوں کی مرضی کے مطابق کرا دیجئے۔ اب بھی وقت باقی ہے۔ ورنہ مجبوراً میں پہلا شخص ہوں گا جو علمِ بغاوت بلند کرے گا۔ میری رائے میں مسلمانوں کے لیے موجودہ حالات میں صرف تین راستے باقی ہیں:۔

(1) جہاد بالسیف

(2) ہجرت

(3) عدم تعاون

مسلمانوں کو میں نے عدم تعاون کا مشورہ دیا ہے۔

پنڈت مدن موہن مالویہ نے ذمہ لیا کہ وہ راجاؤں کو چرخہ چلانے کی ترغیب دیں گے سرلا دیوی چودھرانی نے جو خود راجہ کے خاندان سے تھیں چرخہ چلانا سیکھ لیا تھا۔ بہادر رتنا دیوی جو جلیانوالہ باغ کے

قتلِ عام کے موقع پر کرفیو کے باوجود سینکڑوں زخمیوں کے بیچ تمام رات بیٹھی رہی تھیں چرخہ چلا رہی تھیں۔ سر تیج بہادر سپرو نے جو مشورہ مسلمانوں کو دیا تھا کہ وہ ترکِ تعاون نہ کریں اس کے خلاف گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں ایک گرم مضمون لکھا۔

جہاں تک جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام اور پنجاب کے مظالم کا معاملہ تھا ہندوستان کے لیڈروں کا متفقہ مطالبہ تھا کہ جو افسران ذمہ دار پائے گئے ہیں فوراً تبدیل کر دیے جائیں۔ لیکن وائسرائے نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور مسٹر مانٹیگو وزیرِ ہند نے وائسرائے کی تائید کی اس سے غم و غصہ میں شدید اضافہ ہوگیا۔

ادھر مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان میں بالکل کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ انھوں نے کھدر پہننا اور گاندھی ٹوپی اختیار کرنا کثرت سے شروع کر دیا تھا۔ لمبے کرتوں اور گھٹنے پاجاموں کا رواج کالج کے طالب علموں میں بھی دیکھا جا رہا تھا اور ایک اندھے جوش میں جولائی اور اگست میں تقریباً 18 ہزار آدمی ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہجرت کا فتویٰ صحیح تھا یا غلط اسے علماء جانیں۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے گہرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے وطن اور مال و املاک کو چھوڑ کر جلاوطن ہو جانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

# دھماکے کا وقت قریب آرہا ہے

یکم اگست کا دن قریب آرہا ہے۔ خلافت کمیٹی نے تمام ہندوستان کے لوگوں سے زور دار اور پُرزور اپیل کی ہے کہ یکم اگست کے دن کو کامیاب بنایا جائے۔ 28 جولائی 1920ء کو گاندھی جی نے تمام ابنائے ملک کو آواز دی اور یکم اگست 1920ء سے ترکِ موالات شروع کرنے کے لیے پکارا۔ گاندھی جی نے کہا کہ جب تک رولٹ ایکٹ منسوخ اور معاہدہ سیورے میں ترمیم نہ ہو ہماری مہم جاری رہے گی۔

# یکم اگست 1920ء "زیرو آور"

زیرو آور آرہا ہے۔ تمام ملک میں زبردست تناؤ تھا۔ یکم اگست 1920ء سے تمام ہندوستان میں عدم تعاون سے آغازِ جنگ ہونے والا تھا۔ سردھڑ کی بازی لگنے والی تھی اور گاندھی پکارنے والا تھا۔

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

وفاداری کا اظہار، برطانوی رعایا ہونے کا تخیل، عرضداشتوں، وفود اور کاسۂ گدائی کا زمانہ "نقش و نگار طاقِ نسیان" اور ہندوستان معرکۂ کارزار بننے والا تھا۔ مسلمان ادنیٰ و اعلیٰ حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے صفِ اول کے سپاہی بننے والے تھے۔ یہ وہی مسلمان تھے جو کل تک خاک بوسانِ حکومت میں شمار ہوتے تھے

یکم اگست ۱۹۲۰ء کا دن آیا اور بڑی دھوم سے اس کا استقبال ہوا۔ تمام ہندوستان جاگ گیا۔ حلف لیے گئے۔ بے شمار جلسے ہوئے۔ مادرِ ہند پر جان تک کی قربانی دینے کا عہد کیا گیا۔ خلافتِ عثمانی پر فدا ہو جانے کا جذبہ عروج پر تھا۔

اس دن کا آغاز خود مہاتما گاندھی نے اپنے امتیازاتِ خصوصی تمغہ جات اور خطابات کی واپسی سے کیا۔ انھوں نے وائسرائے کو لکھا کہ "میں قیصرِ ہند گولڈ میڈل جو مجھے افریقہ میں خدمتِ انسانیت کے اعزاز میں عطا کیا گیا تھا اور زولو وار میڈل جو ۱۹۰۶ء میں بحیثیت افسر انچارج انڈین ایمبولینس کور مجھے عطا ہوا تھا اور بوئر وار مڈل جو مجھے بحیثیت سپرنٹنڈنٹ انڈین اسٹریچر بیرر کور ۱۸۹۹ء ۱۹۰۰ء میں ملا تھا وہ سب واپس کر رہا ہوں۔ ان تمغات کو میں کیسے استعمال کر سکتا ہوں جب ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی اس ظلم کے نیچے کراہ رہے ہیں جو ان کے مذہبی جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ پنجاب میں جبر و استبداد کا جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا وہ ایک مزید وجہ میرے اس طریقۂ عمل کی ہے۔ گاندھی جی نے اس خط میں بھی حکومت برطانیہ سے اپنی سابقہ وفادارانہ خدمات کا تفصیل سے تذکرہ کرنے کے بعد لکھا کہ اب میں وفادار نہیں رہ سکتا۔

۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کا دن آیا اور صلح نامہ کے مسودہ پر بلا ترمیم دستخط کا مطالبہ ہوا اور ترکوں کی جانب سے توفیق پاشا نے اسی طرح لرزتے ہاتھوں سے دستخط کر دیے جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے پہلے صلح کا مسودہ لیا تھا۔ صلح نامہ مکمل ہو گیا اور معاہدہ سیورے میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ دانشورانِ فرنگ کے مضامینِ خصوصی، ہندوستان کا احتجاج، مصر اور افغانستان کی مخالفت اور تمام دنیائے اسلام کی آواز سب بے اثر ثابت ہوئی۔ کیا خوب فرمایا شاعرِ مشرق نے :

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

انگریز اس زعم میں تھا کہ ہم ان نہتے ہندوستانیوں کو پیر کے نیچے کچل کر ختم کر دیں گے۔ اب مولانا محمد علی کی شعلہ بار تقریریں گاندھی جی کی معیت میں طوفانی لہروں کی طرح تیز دوروں کے درمیان شروع ہو رہی تھیں۔ مولانا محمد علی لندن اور پیرس میں ناکام ہونے کے بعد خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں اپنی عقیدت و وفاداری کے اظہار کا تار بھیج کر آئے تھے۔ اور اب جبکہ میدانِ کارزار آراستہ ہو گیا تھا، وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ انگریز کی استعمار پسندانہ پالیسی ہی ہمارے زوال کا باعث ہے۔ ہندوستان انگریز کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہندوستان سے انگریزوں کو اتار پھینکو تو دنیائے اسلام کے سینہ سے ایک بھاری سل ہٹ جائے گی۔ یہی ایک راستہ انگریز سے مقابلہ کرنے اور خلافتِ اسلامیہ کو پھر زندہ کرنے کا ہے۔ مولانا محمد علی کی علمیت و فضیلت، ان کا اندازِ خطابت، ان کے الفاظ کی شوکت اور سب سے زیادہ ان کے دل کا سوز و گداز ان سب نے

مل کرعوام وخواص کے دلوں میں ایک انتقامی جذبہ بھر دیا اور انھوں نے سمجھا کہ ایک گرتی ہوئی دیوارآزادیٔ ہندستان سے پھر سنبھل سکتی ہے۔ مولانا محمد علی کہتے تھے کہ چرخہ ایک توپ ہے جس کے گولے براہ راست انگریز کے قلب پر گرتے ہیں۔ جذباتی تقریروں کے امام وہ تھے اور گاندھی جی جو عزم راسخ کر چکے تھے اس کی تکمیل کے لیے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پنجاب، سندھ، مدراس وغیرہ کے اسٹیشنوں پر ان کا زبردست استقبال ہوا۔ رفتہ رفتہ اسکولوں اور کالجوں سے لڑکے نکلنے لگے، کچہریوں سے وکلا نے علیحدگی اختیار کرنا شروع کر دیا، خطابات واپس ہونے لگے اور لوگ نوکریوں سے استعفیٰ دینے لگے۔ وائسرائے ہند نے ان تمام باتوں کا مذاق اڑایا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مضحکہ اور طنز کے تیروں سے اس تحریک کو اکھاڑ دیں گے۔ لارڈ چیمسفورڈ نے ایک بیان میں ان کارروائیوں کو تمام احمقانہ اسکیموں میں سب سے زیادہ احمقانہ قرار دیا اور کہا کہ یہ فضول غلط مشورہ پر مبنی حقیقتاً مجنونانہ، ناقابلِ عمل اور خواب وخیال ہے۔ وقت نے ثابت کیا کہ لارڈ چیمسفورڈ کتنی ہولناک غلطی میں مبتلا تھے۔ انھوں نے سمندر کو ساکت سمجھا تھا حالانکہ اس میں بلا کا طوفان تھا۔

## پانچ سو علما کی جانب سے ترکِ موالات کا فتویٰ

اس دورِ ابتلا میں ہر طبقۂ خیال کے علمائے کرام ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ مثلاً دیوبندی فکر کے مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، اہلحدیث طبقہ کے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحکیم گیاوی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی، بریلوی جماعت کے مولانا سید محمد فاخر بیخود الٰہ آبادی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل، مولانا عبدالماجد بدایونی، معتدل طبقہ کے اور شمالی ہند کے قدیم مرکزِ اسلام سے تعلق رکھنے والے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی ناظم مدرسہ الٰہیات کانپور، علامہ سید سلیمان ندوی ناظم ندوۃ العلماء، اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد حیدر بہاری۔ الغرض ہندستان کے اکابر علماء سالہا سال کے اختلافات اور گروہ بندیوں کو نظر انداز کر کے تحریکِ خلافت میں شانہ بہ شانہ کام کر رہے تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب اور مولانا سید فاخر صاحب ہر جلسہ اور ہر کانفرنس میں نمایاں نظر آتے تھے۔

مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف "تاریخ جمعیۃ علماء پر ایک تاریخی تبصرہ" میں صفحہ ۷۶ پر تحریر فرماتے ہیں:-

> "نومبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کی تقریب سے تمام اقطاعِ ہند کے علماء کی ایک معتدبہ جماعت جمع ہو گئی۔ خلافت کانفرنس کے اجلاسوں سے فراغت کے بعد تمام علماء موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں صرف حضرات علماء ہی شریک تھے۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب کی تحریک

اور مولانا منیر الزماں صاحب اور دیگر حاضرین کی تائید میں جناب فاضل علامہ حضرت مولانا عبد الباری صاحب اس جلسہ کے صدر قرار پائے اور کارروائی شروع ہوئی۔ تمام حاضرین جلسہ نے بالاتفاق طے کر لیا کہ علماء کی ایک جمعیۃ قائم کی جائے اور اس کا نام جمعیۃ علمائے ہند رکھا جائے اور اس کے حلقے کو تمام ہندوستان کے لیے وسیع کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام حاضرین نے اسی وقت جمعیۃ کی رکنیت منظور کر لی اور جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوگئی۔"

مولانا ثناء اللہ صاحب کی تحریک اور دیگر حضرات کی تائید سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اس جمعیۃ کے عارضی صدر منتخب ہوئے۔ اس سے صاف طور پر نمایاں ہے کہ تمام علمائے اسلام متحد و متفق ہو کر خلافت کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے اور ہر طرح کی امداد فرماتے تھے۔

اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم بنائے گئے۔ حسب ذیل حضرات جو موجود تھے رکن قرار دیے گئے:۔

1۔ حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی
2۔ مولانا سلامت اللہ صاحب فرنگی محلی
3۔ مناظر اسلام مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری
4۔ حضرت پیر محمد امام صاحب
5۔ مولانا اسد اللہ صاحب سندھی
6۔ مولانا سید محمد فاخر صاحب سجادہ نشین
7۔ دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد
8۔ مولانا مولوی محمد انیس صاحب
9۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
10۔ مولانا سید کمال الدین صاحب
11۔ مولانا قدیر بخش صاحب
12۔ مولانا تاج محمد صاحب سندھی
13۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ
14۔ مولانا خدا بخش صاحب مظفر پوری
15۔ مولانا مولا بخش صاحب امرتسری
16۔ مولانا عبد الحکیم صاحب گیاوی
17۔ مولانا محمد اکرم صاحب
18۔ مولانا منیر الزماں صاحب
19۔ مولانا محمد صادق صاحب
20۔ مولانا سید داؤد غزنوی صاحب
21۔ مولانا سید اسماعیل صاحب
22۔ مولانا محمد عبید اللہ صاحب
23۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب

یہ کل علماء کے نام نہیں ہیں صرف ان حضرات کے نام ہیں جو خلافت کانفرنس میں شریک ہونے آتے تھے اور وہیں جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد رکھ دی۔ اس میں نامور ان ہند ہیں جن میں سے ایک ایک کے لاکھوں پیرو تھے۔ مولانا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے امرتسر میں پہلے جلسہ کی دعوت دی۔

6 ستمبر 1920ء کو جمعیۃ علماء کا ایک اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت مولانا تاج محمد صاحب سندھی منعقد ہوا اور 8 ستمبر 1920ء کو پانچ سو علماء کے دستخط سے ترکِ موالات کا فتویٰ شائع ہوا۔ یہ فتویٰ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیرِ شریعت بہار نے تحریر فرمایا تھا۔

جمعیۃ علماء کی پہلی مجلس عاملہ پہلی مرتبہ 9، 10 فروری 1922ء بمقام دہلی بنائی گئی اس کے ارکان حسب ذیل تھے:۔

1۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب
2۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب
3۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں
4۔ مولانا شبیر احمد عثمانی
5۔ مولانا عبدالماجد بدایونی
6۔ مولانا مظہر الدین از برالامان
7۔ مولانا عبدالقادر قصوری
8۔ مولانا حسرت موہانی
9۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی
10۔ مولانا آزاد سبحانی
11۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی
12۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی

# لوکمانیہ تلک

ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر گاندھی کے نمودار ہونے سے قبل لوکمانیہ تلک ہندوستان کے مسلّم لیڈر تھے۔ انہی کے شاگرد مولانا حسرت موہانی تھے۔ گاندھی جی برابر اعلان کرتے تھے کہ وہ سیاسی آدمی نہیں بلکہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ گاندھی جی نے جب آل انڈیا ہوم رول لیگ کی صدارت، مسز بسنٹ کے الگ ہونے کے بعد منظور کی تو کہا کہ آج اوّل بار میں سیاست میں داخل ہوا ہوں۔ اس کے برخلاف تلک اپنے کو سیاسی آدمی کہتے تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہر ممکن ذریعہ سے ہندوستان کی آزادی حاصل کی جائے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ پنجاب کے خونیں واقعات اور خلافت سے جو عظیم جذبات ابھرے ہیں ان کا استعمال مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم میں کیا جائے۔ 23 جولائی 1920ء کو تلک کی سالگرہ تھی۔ یکم اگست کو رات کے بارہ بج کر 40 منٹ پر اچانک وہ اس دنیا سے گزر گئے۔ جو عظیم ماتم ہندوستان میں تلک کی موت پر ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ جب ان کی راکھ دریائے گنگا میں ڈالنے کے لیے لائی گئی تو اس وقت میں یونیورسٹی اسکول آف الٰہ آباد کا طالب علم تھا۔ ہم سب لڑکے ہندو اور مسلمان ننگے سر اور ننگے پیر دریائے گنگا کے کنارے تک گئے تھے۔ ان کے مرنے پر گاندھی جی نے اُن کی لاش اٹھانی چاہی تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا گاندھی جی نے کہا "ایک محبِ وطن کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے" اور گاندھی جی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو نے اُن کے جنازہ کو کندھا دیا۔ حسرت نے دریائے گنگا کے کنارے ایک

نظم پڑھی جس کا مطلع یہ ہے:۔

ماتم ہو نہ کیوں بھارت میں بپا دنیا سے سدھارے آج تلک

بلونت تلک مہراج تلک، آزادی کے سرتاج تلک

اس وقت تمام ہندوستان کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب ہندوستان کی قیادت کون کرے گا اس سوال کا مکمل جواب قوم کو جلد ایسا ملنے والا تھا کہ ہر قلب سے وہی ایک صدا نکلتی۔

## کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس

4 سے 9 ستمبر 1920ء تک کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ لالا لاجپت رائے جو ابھی امریکہ سے آئے تھے، اس اجلاس کے صدر مقرر ہوئے۔ یہ جلسہ خصوصیت سے اس لیے منعقد ہوا تھا کہ مسئلۂ خلافت پر بحث و گفتگو کی جائے اور کانگریس اپنے رواجی راہِ عمل کو ترک کر کے اب راست اقدام اور ترکِ موالات کے میدان میں قدم رکھے۔ اس اجلاس کے پہلے گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے ہندوستان میں کافی دورے کر کے ملک کو ترکِ موالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس اجلاس کے لیے عوام میں بڑا جوش و خروش تھا۔ اور اس میں شرکت کے لیے تمام اقطاعِ ہند سے پانچ ہزار ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ اور تقریباً ایک لاکھ سے زائد آدمیوں کا مجمع تھا۔ مولانا شوکت علی نے راستہ میں ٹرین کے اندر ہی گاندھی جی سے ترکِ موالات کی تجویز کا مسودہ تیار کرالیا تھا۔ اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ حکومتِ برطانیہ سے ہر قسم کا عدم تعاون کیا جائے۔ بالخصوص

(1) گورنمنٹ کے درباروں اور کل سرکاری جلسوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

(2) بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے اور ان اسکولوں اور کالجوں سے جو سرکاری امداد پاتے ہیں باہر نکال لیا جائے اور ان کے لیے آزاد، خود کفیل ادارے قائم کیے جائیں۔

(3) فوج، کلریکل اسٹاف اور مزدور جماعت کے لوگ میسوپوٹامیہ میں جا کر کام کرنے سے قطعی انکار کر دیں۔

(4) تمام ممبران کونسلوں سے استعفیٰ دے دیں۔

(5) بدیشی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ کیا جائے۔

اس وقت 9 ستمبر کو مسلم لیگ کا بھی جلسہ ہوا۔ مسلم لیگ نے بھی ترکِ تعاون کے تجویز کی تائید کی لیکن خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علمائے ہند کے میدان میں آجانے کے بعد مسلم لیگ پائیں قدم میں پہنچ گئی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس زمانہ کی مسلم لیگ کانگریس کی مخالفت نہ تھی۔ خلافت کانگریس کا بھی اجلاس زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد

انھیں ایام میں منعقد ہوا۔ مولانا آزاد نے اپنے اسی خطبۂ صدارت کو خلافت کے مسئلہ پر عوام و خواص کی آگاہی کے لیے ایک مبسوط کتاب کی شکل دے دی۔

کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس میں ترکِ موالات کی تجویز جوش و خروش کے ساتھ منظور ہوئی۔ البتہ کانگریس کے اجلاس میں مسٹر محمد علی جناح نے تنہا اس کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ بہرکیف کانگریس کے اسپیشل سیشن نے خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کے لیے اب ہری جھنڈی دکھلا دی ابھی تک مہاتما گاندھی اپنے عظیم انفرادی اثرات اور خلافت کمیٹی کی پشت پناہی سے پروگرام چلا رہے تھے اب مہاتما گاندھی نے اپنا پورا پروگرام قوم کے اندر جھونک دیا۔

حکومت عوام و خواص کے اس جوش و خروش اور ان بے شمار جلسوں، جلوسوں اور گاندھی جی کی مسلمہ قیادت سے گھبرا گئی اور اس نے انتباہ جاری کیا اور کہا کہ لوگ اس میں حصہ لینے سے گریز کریں ورنہ طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ حکومت نے یہ بھی اعلان کیا کہ گاندھی جی کے ساتھ جو رعایت رولٹ بل کے خلاف احتجاج کے سلسلہ میں روا رکھی گئی تھی وہ اب روا نہ رکھی جائے گی۔ اس کا جواب گاندھی جی نے یہ دیا کہ اپنے پورے پروگرام کی مختلف طریقوں سے اشاعت کرتے ہوئے قوم کو بڑھ کر چلنے کی دعوت دی۔

آخر اگست میں گاندھی جی کی رہنمائی میں گجرات پولیٹیکل کانفرنس صرف مسئلۂ خلافت پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی اس میں عدم تعاون کی مخالفت ہوئی لیکن عدم تعاون کی قرارداد 1855 آرا کی موافقت اور 923 کی مخالفت سے پاس ہوگیا۔ تمام مسلمانوں نے بالاتفاق موافقت میں ووٹ دیے بجز محمد علی جناح کے جنھوں نے مخالفت کی اور ووٹ بھی خلاف دیا۔

ان دنوں گاندھی جی اپنے نظریات کو سمجھانے کے لیے لمبے لمبے مضامین لکھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی کلچر کو ترک کرکے ہندوستانی کلچر اختیار کرنا چاہیے اور اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تعلیم آزاد ہو چنانچہ انھوں نے نومبر 1920ء میں آزاد گجرات یونیورسٹی گجرات ودیا پیٹھ کی بنیاد رکھی۔

مہاتما گاندھی نے 27 اکتوبر 1920ء کو ایک کھلا خط ہندوستان میں مقیم تمام انگریزوں کے نام شائع کیا جس میں انھوں نے اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ اقدام کو مبنی بر حق و صداقت ٹھہرایا اور انگریزوں سے اپیل کی کہ وہ حالات کو سمجھیں اور گورنمنٹ کو صحیح مشورہ دیں۔

## ناگپور کانگریس

آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس 26 دسمبر 1920ء کو ناگپور میں منعقد ہوا۔ اس کے صدر راگھواچاریہ تھے۔ حکومت برطانیہ نے اسی زمانہ میں پرنس رف ڈیوک آف کناٹ کے ہندوستان کے دورہ کرنے کا

پروگرام تیار کیا۔ وہ لیجسلیٹو کونسل کا انصاف کرنے اور ہندوستان کو یہ فریب دینے آرہے تھے کہ برطانیہ نے ہندوستان سے جو وعدہ کیا تھا وہ ایفا کر دیا اور اسے نیابتی حکومت کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ گاندھی جی نے تجویز کی کہ ڈیوک کا بائیکاٹ کیا جائے اور تجویز پاس ہونے کے بعد ڈیوک آف کناٹ کو ایک خط بھی لکھا جس میں بدلائل ثابت کیا کہ وہ کیوں بائیکاٹ پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ڈیوک موصوف کی کوئی اہانت منظور نہیں ہے بلکہ اس نظامِ حکومت سے احتراز منظور ہے جس کا بدلنا حق و انصاف کے لیے ضروری ہے اور جو ڈیوک صاحب موصوف کے اختیار سے باہر ہے۔ گاندھی جی ہمیشہ یہ کہتے تھے اور یہی سبق دیتے تھے کہ ہماری لڑائی انگریز سے نہیں ہے بلکہ اس طریقۂ حکومت سے ہے اور اس نظام سے ہے جو عدل و انصاف پر مبنی نہیں ہے۔

ناگپور کانگریس کے اجلاس کے لیے گاندھی جی نے ترکِ تعاون کی تجویز انگریزی میں لکھی تھی۔ اس کے ابتدائی الفاظ کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"چونکہ کانگریس کی رائے میں حکومتِ ہند ملک کے اعتماد سے کلیتاً محروم ہو گئی ہے اس لیے باشندگانِ ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان میں سوراج قائم کیا جائے۔"

کانگریس کے اس اجلاس میں اس تجویز کا ترجمہ مولانا محمد علی نے پڑھ کر سنایا۔ یہاں بھی مسٹر جناح ترکِ تعاون کی تجویز کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ لیکن دیہاتی مثل ہے کہ آندھی میں ہاتھ کے پنکھے کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ مسٹر جناح کو کوئی تائید کرنے والا بھی نہ ملا اور تجویز منظور ہو گئی۔

پے درپے کانگریس کے اسپیشل سیشن اور عام سالانہ سیشن سے عدم تعاون کی تحریک منظور ہونے کے بعد اب گاندھی جی اس عدم تشدد کے جہاد کے کمانڈر انچیف تھے اور ان کی پشت پر پوری ہندوستانی قوم کی اور تمام سیاسی اداروں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کی طاقت تھی۔ ہندوستان ایک آواز سے آزادیِ ہند اور بحالیِ خلافت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ناگپور کانگریس کے فیصلے پر سری نواس شاستری کی جو ہندوستان کے بہترین مقرر ہوتے تھے کانگریس سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ عدم تعاون کی تجویز منظور ہونے کے بعد اب میرے لیے کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونا ممکن نہیں ہے اور یہی حال دوسرے معتدلین کا بھی ہوا۔ کانگریس میں اب معتدلین کی گنجائش بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ہندوستان اب میدانِ جنگ بن چکا تھا اور اس خاک و خون کے معرکہ میں صلح پسندی، خوشامد اور دریوزہ گری کی کہاں گنجائش تھی۔

گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جہاں گئے لوگوں نے آنکھیں بچھائیں، پبلک ٹوٹ پڑی، عظیم الشان جلسے ہوئے۔ گاندھی جی تو پانچ سات منٹ سے زیادہ تقریر نہ کرتے تھے۔

مگر مولانا محمد علی دو ڈھائی گھنٹہ سے کم وقت نہ لیتے تھے۔ روتے اور رلاتے تھے۔ موقع بہ موقع قرآن کی آیتیں پڑھ کر ایسی شرح کرتے تھے کہ ان پر مولانا کا خطاب پوری طرح صادق آتا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ انگریز حکومت سے، قید و بند جرمانہ بلکہ گولی سے مرنے تک کا ڈر دماغ سے کافور ہوگیا۔ حتیٰ کہ وہ دیہاتی جو کانسٹبل کی صورت سے ڈر جاتے تھے اب میدان میں سینہ کھول کر نکل آتے تھے۔ پولیس اور فوج کے سامنے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، ہندو مسلمان کی جے، مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے، مولانا شوکت علی کی جے کے فلک شگاف نعرے لگاتے تھے۔ جب کوئی جیل جاتا تھا تو اس کے گھر والوں کو مبارکباد دی جاتی تھی اور گھر والے شان سے گردن اونچی کرتے تھے کہ گویا ان کے خاندان میں کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام پایا ہے۔ لکھنؤ، اجمیر، علی گڑھ، الٰہ آباد، مدراس، بنگال، دلّی، آسام، پنجاب الغرض سارے ہندوستان کا دورہ ہوا اور ملک میں ایک طرف تکبیر اور بھارت ماتا کی جے کے نعرے تھے جو ہندو مسلمان دونوں لگا رہے تھے اور دوسری طرف گورنمنٹ کی جانب سے دار و گیر کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ اسکولوں اور کالجوں سے تمام تعلیم اور تکمیل کے ممتاز لڑکے نکل گئے اور میدان میں آکر اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور خوشی خوشی جیل گئے

## امن سبھا

گورنمنٹ نے ایک طرف گرفتاریوں کا سلسلہ وسیع کر دیا۔ دوسری جانب راجاؤں اور زمینداروں کو ملا کر ترک تعاون کے خلاف ایک اسکیم تیار کی جو یہ تھی کہ صوبہ کی سطح سے لے کر ضلع کی سطح تک امن سبھائیں قائم کی جائیں۔ ان میں زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنے سپاہی بطور رضاکار بھرتی کرنے کے لیے دے دیے۔ امن سبھا کو ایک پبلک ادارہ ثابت کرنے کے لیے اس کے کل عہدیداران غیر سرکاری لوگ رکھے گئے، جو وہی زمیندار و تعلقدار تھے۔ امن سبھا کا کہنا یہ تھا کہ گاندھی جی نے جو اسکیم چلائی ہے اس میں تشدد کا پیدا ہونا لازمی ہے جس سے ابنائے ملک کی تباہی و بربادی ہوگی اس لیے امن قائم کرنے کے لیے یہ خیر خواہانِ سرکار پبلک کے سامنے آتے ہیں اور ان کا مشورہ یہ تھا کہ لوگ گاندھی جی کی ترکِ موالات کی تحریک سے علیحدہ رہیں۔ اس کا ایک ابتدائی نظارہ دیکھنے کا مجھے بھی اتفاق ہوا تھا۔ لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے ایک اور واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب ہے۔

مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو چلانے کے لیے مسلمانوں کو اپنے موافق کر ہی لیا تھا۔ اب سارے ہندوستان کو ہلا دینے کے لیے انھوں نے تین آدمیوں کو موافقت میں لانا ضروری خیال کیا۔ یعنی پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سید حسن امام (بیرسٹر پٹنہ) جن کی وطن دوستی بہت مشہور تھی اور مسٹر سی آر داس (بیرسٹر کلکتہ)۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو تو آسانی سے آگئے۔ ان کے بیٹے جواہر لال نہرو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے اور موتی لال کے اکیلے صاحبزادے تھے۔ وہ دل و جان سے ملک کو آزادی کی طرف لے جانے کے شائق تھے اور ان کا اثر پورے خاندان

نے قبول کیا۔

سید حسن امام کی پریکٹس اس وقت پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ ان کو تحریک سے اتفاق ہے لیکن وہ وکالت نہیں چھوڑ سکتے۔ البتہ ایک سادہ چیک دستخط کر کے دے دیا اور اپنی لڑکی کو کہا کہ یہ کام کرے گی سی۔ آر۔ داس پر مولانا محمد علی نے بڑی محنت کی۔ وہ اپنے وقت کے حاتم طائی تھے۔ ان کی بھی آمدنی اگرچہ پچاس ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تھی لیکن وہ پانچ چھ لاکھ روپے کے مقروض تھے۔ بڑی بحثوں کے بعد مولانا محمد علی نے ان کو وکالت ترک کر کے تحریک میں شامل ہونے پر رضامند کر لیا لیکن شرط یہ تھی کہ قرض ادا ہو جائے جلد ہی قرض ادا ہو گیا۔ کیونکہ فقیر منش سی آر داس نے اپنی کوٹھی بیچ ڈالی۔ دوسری مرتبہ گاندھی جی پھر اسی کوٹھی میں ٹھہرے اور اب بھی سی آر داس اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ لیکن بحیثیت کرایہ دار۔ یہ تھیں وہ عظیم قربانیاں جو قوم نے دیں۔

علامہ اقبال نے لاہور میں مجھ سے کہا کہ گاندھی جی کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ وہ سی آر داس کو اپنی موافقت میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ سی آر داس روحانی حیثیت سے بہت بلند حیثیت رکھتے ہیں۔

## ضلع کانگریس کانفرنس الہ آباد

الہ آباد ضلع کانگریس نے زیر صدارت مولانا محمد علی ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس جلسہ میں مجھ کو بھی ایک پبلک کے آدمی کی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا۔ کانفرنس کے چاروں طرف گورا فوج لگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اژدہام خلائق تھا کہ الامان والحفیظ۔ کسی نے فوج کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ مولانا محمد علی عبا پہنے ہوئے آئے تھے۔ ان کی تحریک صدارت میں لوگوں نے خوب خوب مدح سرائیاں کیں۔ لالہ لاجپت رائے بھی تھے اور انھوں نے بڑی پر اثر تقریر کی۔ مہاتما گاندھی بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ اس وقت وہ سفید کھدر کی دھوتی اور کرتہ اور آج کل جسے گاندھی ٹوپی کہتے ہیں دیسی ٹوپی میں ملبوس تھے۔ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ میں بھی کہتا ہوں کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ اور کل مجمع سے کہلوایا کہ فوج کی ملازمت حرام ہے۔ مولانا محمد علی نے اپنی ابتدائی تقریر میں کہا تھا کہ لوگوں نے میری بڑی تعریف کی ہے۔ میں کوئی خاکسار آدمی نہیں ہوں، وہ سب تعریفیں پی گیا مگر میں ایک اور تعریف سننا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ میں ہندوؤں کا بہت بڑا دوست ہوں۔ پنڈت موتی لال نہرو جب کھڑے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس کو وہ پڑھ پڑھ کر اپنے دل کش انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ پنڈت موتی لال بڑے فصیح اللسان، خوش گفتار اور فارسی داں تھے۔ کہہ رہے تھے کہ آج سے قبل کلکٹر صاحب کسی کو طلب کرتے تھے تو لکھا جاتا تھا" حکم نامہ بنام فلاں" اور یہ کہ" ایں جانب" کی خدمت میں حاضر ہو۔ اب اس رقعہ کو دیکھیے کہ اس میں لکھا ہے" جناب من" پنڈت جی

نے "جناب" اور "من" پر بڑا زور دیا اور آخر میں ہے "نیاز مند" ککلرز۔ تمام لوگ اس سے بہت محظوظ ہوئے۔ پنڈت جواہر لال کو ہم لوگ دیکھ نہ سکے کیونکہ وہ بیٹھے ہی رہے۔ البتہ مولانا محمد علی کا یہ فقرہ یاد ہے کہ بھائی جواہر لال نے بدیشی سگریٹ چھوڑ دیا ہے تو ڈلی چبا رہے ہیں۔ پنڈت موتی لال نے امن سبھا کا نام "غلام سبھا" رکھا۔ مگر ان امن سبھاؤں نے آگے چل کر بڑا ظلم ڈھایا۔

## مولانا محمود حسن کی مراجعت اور جمعیۃ علمائے ہند کی کارگزاریاں

مولانا محمود حسن ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانہ ہوئے تو ابھی وہ حراست ہی میں تھے۔ "سیدی بشر" میں ۱۸ دن اور "دلیس" میں پونے دو ماہ سرکاری حفاظت میں قیام کرنے کے بعد آخر مئی ۱۹۲۰ء میں بمبئی داخل ہو کر یہاں رہا کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ حکومت کے سی آئی ڈی کے لوگ ہمیشہ لگے رہے۔ مالٹا میں 'ناصحانِ مشفق' جبہ و دستار و تسبیح و سجادہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے رہتے تھے۔ بمبئی میں بھی ایک مولانا رحیم بخش تشریف لائے اور مولانا کو بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں صرف کرنے کا مشورہ بڑی خیر خواہی سے دیا اور یہ بھی کہا کہ مولانا خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف نہ لے جائیں اور براہِ راست دیوبند روانہ ہو جائیں۔ سفر کا براہِ راست اہتمام بھی موجود تھا۔

آپ نے جہاز سے باہر قدم رکھا تو تمام ہندوستان کے قائدین استقبال کے لیے موجود تھے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضائے آسمانی گونج رہی تھی۔ بڑے تزک و احتشام سے جلوس نکلا اور آپ براہ راست خلافت کمیٹی کے دفتر تشریف لے گئے جہاں آپ کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور یہیں آپ کو زعمائے ہند نے "شیخ الہند" کا خطاب دیا جو آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا ہے۔

آپ کو خلافت کمیٹی بمبئی نے سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ دو دن بمبئی قیام کرنے کے بعد مولانا دلی تشریف لے گئے اور ڈاکٹر انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ وہاں سے دوسرے دن دیوبند کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں اہل میرٹھ نے ایک ایڈریس پیش کیا۔ مولانا سید محمد میاں علمائے حق حصہ اول کے صفحہ ۲۱۰ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

> "راستہ کے اسٹیشنوں پر زائرین کا ہجوم تھا۔ دیوبند کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہجوم کی انتہا نہ رہی۔ شہر اور دیہات کے لوگ زیارت کو آئے تھے۔"

آگے چل کر صفحہ ۲۱۱ پر لکھتے ہیں:۔

> "مسلمانوں کے قلوب کسی اطمینان کے طالب تھے۔ حضرت شیخ کی تشریف آوری نے یہ طلب پوری کر دی۔ اب مسلمانوں کا قدم سب سے تیز تھا۔ ہر شخص تحریک کا متوالا، جان و مال قربان کرنے پر آمادہ۔۔۔۔ "ایک تھوڑی تعداد جو مخالف تھی اس کی حالت یہ تھی کہ دلّی میں جب اس گروہ کے

کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوا تو باوجودیکہ وہ پہلے علماء و نیز عام مسلمانوں میں بہت زیادہ رسوخ و مقبولیت رکھتا تھا لیکن اس وقت حالت یہ تھی کہ تجہیز و تکفین کے لیے مسلمان تیار نہ تھے گھر کے مخصوص آدمیوں کے سوا کوئی شریکِ جنازہ نہیں ہوا۔ مجبوراً جنازہ کو موٹر میں قبرستان پہنچایا گیا (معاذ اللہ)"

یہ تھی اس وقت مسلمانوں کے جوش و خروش کی حالت۔ یہی اسباب تھے کہ جامع مسجد کے پیش امام کو شمس العلما کا خطاب واپس کرنا پڑا تھا۔

حضرت مولانا کے آجانے سے ساری باہمی رقابتیں جو دلوں میں چھپی رہی ہوں گی کافور ہوگئیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قائد مل گیا۔ ایک مسلّمہ قائد جس کے آگے سب کی گردنیں جھکتی تھیں اور جس کا حکم سب کے لیے واجب التعمیل تھا۔

شیخ الہند مالٹا ہی سے وجع المفاصل کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسیری کے تکلیف دہ حالات ایک ایسے صاحبِ عزیمت کے قلب و دماغ کو متاثر کرنے سے معذور عاجز تھے لیکن جسم پر تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جب آپ دیوبند پہنچے ہیں تو چلنا پھرنا تو درکنار اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا لیکن اسی حالت میں تحریک کی قیادت کرتے، سفر کی صعوبتیں اٹھاتے اور اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔

حضرت شیخ نہ صرف فہم و بصیرت اور علم و فضل کے امام تھے بلکہ زہد و ورع و تقویٰ و طہارت و عبادت و ریاضت میں بھی ممتاز تھے۔ یہ خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں، کا امتزاج قرنِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتا تھا۔

## جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس

جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں منعقد ہوا تھا، جس میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو، خلافت کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت مولانا شوکت علی اور مسلم لیگ کا اجلاس زیر صدارت حکیم اجمل خاں صاحب ہوا تھا اور ہر جگہ خلافت کے مطالبات ہو رہے تھے۔ جمعیۃ علماء کا دوسرا اجلاس ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو بمقام دہلی ہوا۔ اس کی صدارت شیخ الہند نے تمام علمائے اُمت کی خواہش کے احترام میں نیز اپنا پیام ساری ملت و ملک کے لوگوں تک پہنچانے کے لیے قبول فرمائی، اگرچہ آپ کی صحت اس وقت بہت کمزور تھی۔ ان کا خطبۂ صدارت ایک مجموعہ حقائق تھا، جس کی بنیادی باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترکِ موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت خالص اسلامی مطالبے ہیں۔ اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت

کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں۔

(3) اگر موجودہ زمانہ میں توپ بندوق ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اعداء کے لیے جائز ہو سکتا ہے اور باوجودیکہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ بندوق ہوائی جہاز نہیں ہے، یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔"

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آپ کی تقریر کے زرّیں الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے اور میں ان دونوں فرقوں کے اتحاد و اتفاق کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہیں اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر صورتِ حال اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادے گی۔ ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔"[1]

آپ نے اس کے بعد علمائے ملّت کو وصیت فرمائی کہ جو صراطِ مستقیم آپ نے معلوم کرلی ہے قرآن و سنّت کی روشنی میں اس پر سیدھے چلے جائیں۔ جو لوگ آپ سے علیحدہ ہیں ان کو بھی حکمت اور مواعظِ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجیے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو بالّتی ھی احسن ہونی چاہیے۔

## جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ہمیشہ لیڈرانِ قوم کی نگاہ رہی ہے اور ہر موقع پر لوگوں نے یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت علی گڑھ مسلمانانِ ہند کا تہذیبی و ثقافتی مرکز تھا۔ اس کی حمایت کی بڑی قیمت تھی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ بلادِ اسلامیہ، خلافتِ اسلامیہ اور اماکنِ مقدسہ سخت خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ خاص بات یہ تھی کہ تحریک کا ایک جزو کالجوں، اسکولوں اور

---

[1] علماء حق جلد دوم

یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کرنا تھا اس لیے اس پر کوشش نہ ہوئی کہ علی گڑھ کے لڑکے تعلیم ترک کر کے عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہو جائیں۔ خود طلبا میں بھی یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس اہم معاملہ پر غور کریں اور عمل کے میدان میں اتریں مولانا ابوالکلام آزاد کو وہاں کے کچھ قائدین طلبا نے مدعو کیا۔ مولانا آزاد نے علی گڑھ یونین میں تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم یہ سمجھ کر یہاں آئے ہیں کہ تم لوگوں نے شریعت حقہ کے آگے اپنی گردن جھکادی ہے اور تم کو یہ جاننا مطلوب ہے کہ حالات حاضرہ میں اللہ اور رسول کے احکام کیا ہیں۔ چونکہ حالت ایسی ہے اس لیے میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ پہلے اس بات کو طے کر لو کہ ہندوستان کا وہ کون سا عالم ہے جو تمھاری نگاہ میں اس امر کا مجاز ہے کہ احکام الٰہیہ کو حالات حاضرہ پر کتاب وسنت کی روشنی میں منطبق کر کے تم کو مطلع کرے اور دعوت عمل دے۔ اس لیے آج میں کچھ نہیں کہوں گا۔ جاؤ اور سوچ کر کل مجھ کو جواب دو۔ رات کا گہرا سناٹا ہو گا، خدا ہو گا اور تم ہو گے۔ اس وقت اپنے ضمیر کو ٹٹولو۔ اپنے باطن کا جائزہ لو اور سوچ سمجھ کر ایک رائے قائم کرو۔ یہ کہہ کر جلسہ برخاست ہو گیا۔ دوسرے دن پھر اجتماع ہوا تو لڑکوں نے کہا کہ ہم آپ ہی کو ہندوستان کا سب سے بڑا مجتہد اور عالم سمجھتے ہیں۔ تب مولانا نے کہا کہ جب مجھ کو تم لوگ مجاز سمجھتے ہو اور مجھ سے سوال کرتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ حکومت سے عدم تعاون اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان اسلام فرض ہیں۔ اور میں تم کو پکارتا ہوں کہ کالج کی چار دیواری سے باہر نکلو اور کالج کی تعلیم کا بائیکاٹ کرو۔

تعجب ہے کہ جو زمین اس کوشش وکاوش سے تیار کی گئی تھی اس نے برگ وبار نہیں دیے۔ اور خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اس وقت یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور ہر معنی میں یونیورسٹی کے حل وعقد کے ذمہ دار تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنا ایک بیان اخبارات میں خلافت عثمانیہ اور اماکن مقدسہ کی حفاظت کی تائید میں شائع کرادیا تھا۔ مگر وہ تحریک عدم تعاون کی کس طرح تائید کر سکتے تھے۔ انھوں نے پوری ہوشیاری اور چالاکی سے اپنا پروپیگنڈا تیز کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد امام الہند تو تسلیم کر لیے گئے لیکن ان کا فرمان خلیفۃ المسلمین ترکی کے فرمان کی طرح بے اثر رہا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی علی گڑھ کے دل وجگر تھے۔ ان کا علی گڑھ کے طلبا پر بڑا اثر تھا۔ وہ علی گیرین تھے مولانا عبدالماجد دریابادی نے محمد علی کی اس معاملہ میں بڑی مدح کی ہے کہ انھوں نے ایک بڑے افسر کی موجودگی میں ایک معمولی چپراسی یا خانساماں کی جانب التفات کیا اور اسے محمد علی کی اسلامی اسپرٹ سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ دراصل اسلامی اسپرٹ علی گڑھ والوں کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ محمد علی اور شوکت علی برابر علی گڑھ جایا کرتے تھے اور وہاں کا یہ معمولی واقعہ تھا۔

ایک طرف سے مسٹر ٹول پرنسپل آرہے ہیں دوسری طرف سے ان کا خدمتگار آرہا ہے تو پہلے لپک کر

خدمتگار کو السلام علیکم کہکر اس سے معانقہ کریں گے اس کے بعد گھوم کر کہیں گے "گڈ مارننگ مسٹر ٹول" یہ تو اس دار العلوم کی تعلیم و تربیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ مولانا شوکت علی افیوں کے کلکٹر تھے۔ وہ چھٹیوں میں علی گڑھ آجاتے تھے تو طلبا ان کا سامان چلتے وقت دھیرے دھیرے اٹھائے جاتے تھے۔ یہ گویا ایک منظم سازش تھی۔ کوئی کمبل لے گیا تو کوئی رلائی وغیرہ وغیرہ۔ اور روپے تو کل ختم ہو جاتے تھے۔ اور آخر کار مولانا شوکت علی یہ کہتے ہوئے کہ "بدمعاشوں نے مجھ کو لوٹ لیا" کمرے کمرے چند لڑکوں کی معیت میں آٹھ آٹھ یا چار چار آنے چندہ کرکے اپنا کرایہ فراہم کرتے تھے۔ یہ ایک کھیل تھا جو مولانا شوکت علی کے ہر سفر کے ساتھ کھیلا جاتا تھا۔ سالانہ مرسید ڈے میں دونوں بھائیوں کی شرکت ضروری تھی۔ اور محمد علی تو وہاں کے کھلنڈرے مشہور ہی تھے۔ جہل مرکب میں بڑا ذہین اور دلچسپ پارٹ ادا کرتے تھے۔ "جہل مرکب" کو شاید لوگ نہ سمجھیں۔ یہ ایک طرح کی خوش مذاقی کی مجلس شب میں ہوتی تھی جس میں ذہانت کے ساتھ شوخی و شرارت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس طرح دونوں بھائی علی گڑھ میں بے انتہا ممدوح اور ہر دلعزیز تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا جو جلسہ کانپور میں ہوا اور جس میں مولانا محمد علی سے سخت مقابلہ ہوا تھا اس میں پورا علی گڑھ مولانا محمد علی کے ساتھ تھا۔

اس کا مختصر سا قصہ یوں تھا کہ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی اس غرض سے ہی تھی کہ حکومت سے مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی حاصل کرے جو مسلمانوں کی ضروریات کی کفیل ہو۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی سارے ہندوستان کے لیے ہو اور اس میں اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کا الحاق ہو سکے۔ گورنمنٹ اس پر راضی نہ تھی۔ ہندو یونیورسٹی بنارس میں مقامی طرز کی قائم ہو چکی تھی اور مسلمان اپنی ضد پر اڑے رہے تھے۔ چنانچہ ایک وفد مرتب ہوا جس کے صدر مولانا محمد علی تھے اور انھوں نے شب میں ایک جلسہ کرکے یہ منظور کرانا چاہا کہ وفد کو شرائط طے کر لینے کا کامل اختیار دے دیا جائے۔ ان دنوں مولانا محمد علی حکومت کے طرفدار سمجھے جاتے تھے اور اعلیٰ انگریز افسران سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ یہ امر مسلمانوں کو مشکوک کرنے کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ وفد جو کچھ طے کرے وہ فاؤنڈیشن کمیٹی میں لاکر منظور کرائے۔ مولانا محمد علی کا کہنا تھا کہ کیا میرے اوپر آپ لوگوں کو اعتماد نہیں ہے۔ جواب یہ دیا جاتا تھا کہ اصولاً یہ ضروری ہے کہ فیصلہ آخری فاؤنڈیشن کمیٹی کرے۔ چنانچہ جب یہ رات کا جلسہ ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، رائٹ آنریبل سر امیر علی، خواجہ غلام الثقلین اور نواب وقار الملک کی جماعت مقابلہ میں آگئی۔ جب ریزولیوشن پیش ہوا تو علی گڑھ کے طلبا مولانا محمد علی کی جانب سے شور و غوغا کے لیے موجود تھے۔ خواجہ غلام الثقلین نے ایک دن قبل بڑی گرم تقریر کی تھی۔ دوسرے دن وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ رائٹ آنریبل سر امیر علی کو پریوی کونسل کی ججی خطرے میں نظر آنے لگی جو عنقریب ان کو ملنے والی تھی۔ مولانا حسرت موہانی کوئی بڑے مقرر نہ تھے۔ نواب وقار الملک کی

بڑی عزت تھی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے اور بہرے تھے۔ بڑے معمر، متدین، مخلص اور عاقل سمجھے جاتے تھے۔ محمد علی نے ان کو ایک تجویز دکھلائی جس پر وہ راضی ہو کر خاموش ہو گئے۔ اب رہ گئے مولانا آزاد۔ وہ جب تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو طرح طرح کی بولیاں اور سیٹیاں انتشار پیدا کرنے کے لیے شروع ہو گئیں۔ پھر آواز ہوئی اور مولانا آزاد نے ایک ایسا چسپاں شعر پڑھا کہ آواز نکالنے والا حواس باختہ ہو گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد سناٹا ہو گیا اور مولانا آزاد نے پورے زورِ خطابت کے ساتھ تجویز کی مخالفت کی۔ دو ووٹ سے مولانا محمد علی جیت گئے۔ اور اسی وقت فجر کی اذان ہوئی۔ نماز کے بعد مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر انسانوں کا تانتا لگ گیا۔ اب لوگ پچھتا رہے تھے۔ محمد علی نے نواب وقار الملک کا ہاتھ تجویز پاس ہوتے ہی چوم لیا تھا۔ اب ان کو بھی اصل واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ مولانا آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" میں "صحبتِ نیم شبی" کے عنوان سے ایک طنز سے بھرا ہوا مضمون محمد علی کے خلاف لکھا۔ مظہر الحق پر حسرت نے ایک نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع

مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

علامہ شبلی نے خواجہ غلام الثقلین کے خلاف نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ کُل کی جان ہے ؎

"تو ہم ممبرِ وفد ہستی و ایں گو نہ مجوش"

اب استعفے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے مظہر الحق صاحب نے وفد سے استعفیٰ دیا۔ جس پر "الہلال" میں "یا مظہر الحق" کے عنوان سے زوردار مدحیہ مضمون شائع ہوا۔ پھر غلام الثقلین نے استعفیٰ دیا۔ آخر میں نواب وقار الملک کی نوبت آئی۔ ممدوح نے ایک طویل مضمون میں جو "الہلال" کے اندر چھپا تھا یہ ظاہر کیا کہ محمد علی نے ان کو تجویز کا جو مسودہ دکھلایا تھا وہ دوسرا تھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے سوچا کہ ہم لوگ ترکوں میں باہمی نااتفاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ اور وہ مسودہ اگرچہ بہت اچھا نہیں تھا مگر بہرحال ایسا تھا جس سے رواداری برتی جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش رہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں قوم سے معافی مانگتا ہوں۔ میں بوڑھا اور بہرا ہوں۔ اور اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ مجھے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اب میں قومی خدمت سے ریٹائر ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہوں۔

اس مضمون نے تمام ہندوستان میں ہلچل مچا دی۔ مولانا آزاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ تجویز منظور ہونے پر مسٹر محمد علی نے نواب صاحب کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ دراصل نواب صاحب کی بزرگی کے لحاظ سے اگر محمد علی ان کا پیر چوم لیتے تو کوئی بیجا نہ تھا۔ مگر اب پتہ چلا کہ کیا معاملہ تھا۔

وفد ختم ہو گیا۔ محمد علی کی ساکھ اکھڑ گئی اور مولانا آزاد مسلمانوں کے ہیرو بن گئے۔ محمد علی نے اپنی

کھوئی ہوئی ساکھ کو پھر حاصل کیا۔ اور حکومت کی وفاداری کے داغ کو اپنی بے مثال قربانی اور بے نظیر جراتِ مردانگی اور اسلامی جذبہ کے مظاہرے سے دھو ڈالا۔ لیکن ان دو لیڈروں کے درمیان اختلاف کی جو خلیج پیدا ہوئی تھی وہ کبھی بھی پُر نہ ہو سکی۔ اور یہ ایک بڑا ملّی خسارہ تھا۔

# نواں باب

# تحریک عروج پر

## نیا ہندوستان

جنوری 1921ء ایک آزادی کے نشہ سے سرشار اور گاندھی جی کی قیادت میں آزادیٔ کامل کی منزل کی جانب دار و رسن کی دعوت دینے کے لیے سر بکف نئے ہندوستان پر طلوع ہوا۔ دیش بندھو سی آر۔ داس کی اپیل پر تین ہزار لڑکوں نے کالج سے اسٹرائک کر دیا۔ ہزاروں نے کالج چھوڑ دیا۔ 4 فروری 1921ء کو کلکتہ میں نیشنل کالج قائم ہوا۔ بہار میں ودیا پیٹھ کی بنیاد پڑی۔ پٹنہ، احمد آباد، بمبئی، بنارس اور دلی میں نیشنل کالج کھل گئے۔ بنگال، گجرات، بہار میں نیشنل یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔

نومبر 1920ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پانچ سو روپے ماہوار کی سرکاری امداد بند کر دی۔ اس وقت اگرچہ سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء کے ناظم تھے لیکن حبیب الرحمٰن خاں شروانی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ایک اہم رکن، تحریکِ ترکِ موالات کے سخت مخالف تھے۔ اس وقت ندوۃ العلماء کا خرچ ایک ہزار روپیہ ماہوار تھا جس میں سے اب صرف 450 روپیہ ماہوار نواب بھوپال کا رہ جاتا تھا۔ ان حالات میں بھی امداد بند کرنے کی تجویز کا پاس ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ جو لوگ بھی اب تحریکِ ترکِ موالات کے ہمنوا نہ تھے وہ اپنی پوزیشن اور اپنا اثر کھو چکے تھے۔

نومبر 1920ء میں 1919ء کے اصلاحات کے تحت الیکشن ہوئے۔ کانگریس نے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا اور اگرچہ گورنمنٹ کے کرایہ کے ٹٹو امیدواری کے لیے دوڑے۔ لیکن عوام میں سے بہت کم نے ووٹ دیا۔ اندازہ ہے کہ 45 فیصدی سے زیادہ نے ووٹ نہیں دیا۔ اور کالجوں اور اسکولوں کے بائیکاٹ اور قومی درس گاہوں کے قیام کی مہم جاری رہی۔ چنانچہ راجندر بابو کی کوششوں سے پٹنہ گیا روڈ پر ایک کالج قائم ہو گیا اور وہ خود اس کے پرنسپل قرار پائے اور بہت سے اعلیٰ لیاقت کے پروفیسر استعفیٰ دے کر اس کالج میں چلے آئے۔ کورس وہی رکھا گیا جو کالجوں کا کورس تھا اور سرمایہ کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اسی طرح پٹنہ انجینئرنگ اسکول کے 250 لڑکوں نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہا اور وہ مسٹر مظہر الحق بیرسٹر کے پاس گئے اور کہا کہ ہم کو کچھ جگہ رہنے کی دیجیے۔ مظہر الحق چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے۔ نہایت آرام و عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے رہنے کا مکان بہت شاندار تھا اور اسی کے ساتھ وہ دوسری عالیشان کوٹھی بھی بنا رہے تھے۔ مگر اب تو سب کا حال یہ تھا کہ ؎

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر باز ایں نگر کہ شعلۂ در گیر ما ز دوست

جب موتی لال، سی، آر، داس، راج گوپال آچاریہ، وٹھل بھائی پٹیل، محمد علی شوکت علی اپنے آرام کے بستروں کو چھوڑ کر اپنا سب کچھ قربان کر کے میدان عمل میں آچکے تھے تو مظہر الحق کیسے پیچھے رہتے۔ وہ فوراً سب عیش و آرام کوٹھی اور سامان آرائش چھوڑ، ان لڑکوں کو لے کر داناپور سڑک (پٹنہ) پر ایک باغیچہ میں چلے گئے۔ وہاں ان کے ایک دوست کا چھوٹا سا مکان تھا۔ اسی میں رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہاں تاڑ کی چٹائیوں کے کچھ جھونپڑے بھی بن گئے۔ لڑکوں میں بے پناہ جذبہ تھا۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر یہیں رہنے لگے۔ وہاں چرخوں کا ایک کارخانہ بھی کھول دیا گیا۔ گائیں پالی گئیں۔ مظہر الحق انہی لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کو پڑھاتے بھی تھے۔ موٹا کھانا جو لڑکے کھاتے تھے وہ بھی وہی کھاتے تھے۔ کبھی صرف چنے چبا کر رہنا پڑتا تھا۔ لڑکے زیادہ تر ہندو تھے مگر اب ہندو مسلمان کا امتیاز کافور ہو چکا تھا۔ لڑکے بھی ان کو باپ کی طرح مانتے تھے۔ اسی جگہ کا نام "صداقت آشرم" رکھا گیا جس نے تمام ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کی اور لوگ آج بھی اس کی زیارت کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اللہ اللہ کیسا حسین منظر ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ، ودّیا پیٹھ، صداقت آشرم، مدرسہ کلکتہ۔ اور ان میں مدرس کون ہیں مولانا محمد علی، بابو راجندر پرشاد، مسٹر مظہر الحق۔ چٹائی کا بستر ہے، فاقے ہیں یا موٹا اناج۔

اسی کے ساتھ شراب کی دوکانوں پر پہرے لگ گئے۔ اب لوگ شراب کا ٹھیکہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں، شرماتے بھی ہیں۔ بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ ہو گیا بلکہ جلا دیے گئے۔ موٹا کھدر سب کے جسموں پر آگیا۔ چرخہ چلنے لگا۔ سادگی، بے نفسی، باہمی محبت، یکجہتی، سچائی اور آزادی وطن کا عزم راسخ بعدم تشدّد یہ پیروان گاندھی کی شمشیریں تھیں۔

اپریل گزرتے گزرتے پنڈت موتی لال نہرو، راجندر پرشاد، وٹھل بھائی پٹیل اور راج گوپال آچاریہ نے وکالت کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ یہ لوگ اپنے پیشہ میں ہندوستان بھر میں شہرت رکھتے تھے اور پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار تک ان کی آمدنی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا عجیب دل خوش کن نظارہ تھا۔ تمام ہندو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے۔ علمائے اسلام سرفروشی کی تمنا دلوں میں لیے لبوں سے آگ اگلتے انگریز کے خلاف ترک موالات کو جہاد قرار دے رہے تھے۔

در نہ صرف فتویٰ دیتے تھے بلکہ خود اپنے لیے دار و رسن کو بھی دعوت دے رہے تھے۔

## علی گڑھ پر دھاوا

بڑے اطمینان اور عزم سے علی برادران نے علی گڑھ پر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں دھاوا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم گئے اور سارے طلبا ہمارے پیچھے ہوں گے مگر انھوں نے انگریزی کی سیاست اور ڈاکٹر ضیاءالدین احمد کی ریشہ دوانیوں کا غلط اندازہ کیا تھا۔ جب محمد علی کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی کہانی یہ ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد نے اپنے پٹھوں کو لگا دیا اور انھوں نے محمد علی پر یونین ہال میں ہوٹنگ کی۔ علی گڑھ کا قاعدہ ہے کہ اپنے آدمیوں پر ہوٹنگ ہو سکتی ہے، باہری آدمی آ دے تو سناٹا رہے گا لیکن یہاں معاملہ تفریحی تقریر کا نہ تھا بلکہ ایک فیصلہ کا تھا۔ مولانا محمد علی دلگیر ہو کر چلے گئے۔ لیکن طلبا کی ایک بڑی جماعت تحریک کی حامی تھی۔ خواہ سب عمل کرنے کے لیے تیار نہ رہے ہوں اس لیے بعدہٗ خود طلبا میں تحریک پیدا ہوئی اور دوبارہ جلسہ ہوا اور مولانا محمد علی کو مدعو کیا گیا۔ مولانا محمد علی آئے لیکن وہ رنجیدہ تھے اور صرف پانچ منٹ تقریر کی۔ انھوں نے کہا میں علی گڑھ کو اپنا سمجھ کر آیا تھا اب یہاں سے نکالا جا رہا ہوں۔ اس کا مجمع پر بڑا اثر پڑا اور طلبا نے خود عزم و ہمت دکھا کر عدم تعاون کی پیش کش کی جن میں ایک ذاکر حسین صاحب بھی تھے (بعدہٗ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ) جو اسسٹنٹ لکچرر ابھی حال میں مقرر ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور ایک فضا بن گئی جو پہلے سے موجود تھی لیکن نمایاں نہ ہو سکی تھی۔ اور مولانا محمد علی جو طلبا ان کے ساتھ آ سکتے تھے ان کو آواز دی اور اپنے ساتھ لے کر اولڈ بوائز لاج میں جا کر مقیم ہوئے۔ اولڈ بوائز لاج کالج کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اولڈ بوائز کی ملکیت ہے لیکن ان کو وہاں سے بھی نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ اور ڈیڑھ سو طلبا اپنے سامانوں کو اپنے سروں پر اٹھائے محمد علی کی قیادت میں اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ درس گاہ سے باہر نکل گئے اور ایک نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے نام سے علی گڑھ میں قائم کر دی گئی۔ اور وہیں مولانا محمد علی نے اقامت اختیار کر لی۔ پہلے مولانا محمد علی خود پرنسپل تھے اور حسب عادت صبح سے شام تک تقریریں کیا کرتے تھے۔ بعدہٗ خواجہ عبدالمجید صاحب شیخ الجامعہ قرار دیے گئے۔ اس طرح محمد علی کی ہمت سے ایک آزاد یونیورسٹی وجود میں آئی جو اس وقت مفید کام انجام دے رہی ہے۔ علی گڑھ میں اس انقلاب کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد ہر جگہ نیشنل کالج اور اسکول کھلنے لگے۔ شاید ہی کوئی ضلع ایسا ہوگا جہاں کوئی نہ کوئی اسکول نہ کھل گیا ہو۔ ترک موالات یا ترک تعاون کا منشا ہی یہی تھا۔ چنانچہ جو جو ادارے سرکاری امداد لیتے تھے ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔

# مدرسہ عالیہ کلکتہ پر مولانا آزاد کا دھاوا

یہ تحریک جس طرح انگریزی تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کے بارے میں ہوئی اسی طرح ان مدارس کے بارے میں بھی ہوئی جو سرکاری امداد پر چلتے تھے۔ ان میں ایک نہایت عالیشان اور مشہور خاص و عام مدرسہ، مدرسہ عالیہ کلکتہ تھا جو سرکاری امداد سے چلتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد جب رانچی میں نظربند تھے تو انھوں نے وہاں ایک قومی درس گاہ قائم کی تھی۔ اب انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کو جس کا بنگال اور کل ہندوستان کے مسلمانوں پر بڑا اثر تھا توڑ کر اس کی جگہ ایک قومی مدرسہ قائم کیا جائے۔ مولانا کی شخصیت کے اثر سے ڈھائی سو طلبا تیار ہو گئے اور روپیہ کا بھی انتظام ہو گیا۔ اب مولانا کو اچھے اساتذہ کی فکر ہوئی اور آخر کار حضرت مولانا حسین احمد مدنی چارج لینے پر تیار ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قومی مدرسہ کی رفعت و شان کیا تھی۔ مولانا آزاد جو بھی کام کرتے تھے اس میں اسی طرح کی عظمت ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کی ایک شعلہ بار تقریر سے جو ڈھائی سو لڑکے مدرسہ عالیہ سے نکل آئے تھے، عارضی طور پر ان کے لیے کلکتہ کی مشہور عظیم الشان جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں مدرسہ کھول دیا گیا۔

13 دسمبر 1920ء کو مہاتما گاندھی نے اس قومی عربی مدرسہ کا افتتاح کیا۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر جو تقریر کی وہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ تقریر ایک عربی دینی مدرسہ کے افتتاح کے لیے کی گئی تھی۔ اوّل تو اس کی تاسیس گاندھی جی کے ہاتھ سے کرانا۔ دوسرے یہ تقریر اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ اس وقت کی فضا کیا تھی اور مسلمانوں میں گاندھی جی کی محبوبیت و مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ اس تقریر کے چند فقرے حسب ذیل ہیں۔

"مہاتما جی! اس وقت طلبا کی جو جماعت آپ کے سامنے ہے اور جس کی آنکھیں آپ پر گڑی ہیں یہ وہ جماعت ہے جس نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاندار عمارت اور عالی شان ہوسٹل کو (جس میں بہترین سامان آرائش و زیبائش مہیا تھا) محض احکام الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے ترک موالات کی راہ میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کی ہیں، بھوک اور پیاس کی سختی جھیلی ہیں۔" اس کے بعد مولانا نے اس کا ذکر کیا جہاں ایک طبقہ سرکاری تعلیم کے ذریعہ رزق تلاش کر رہا ہے عربی مدارس کا ایک سلسلہ ہے جو صرف سچی علم پرستی کا چراغ روشن کیے ہوئے ہے۔ اور آخر میں کہا کہ "میں نے اس چیز کی جانب آپ کو اس لیے توجہ دلائی ہے کہ جوہر شناس صرف جوہری ہی ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ اخلاص اور ایثار کے جوہر شناس ہیں۔" (خطبات آزاد، مطبوعہ ساہتیہ اکیڈمی، صفحہ 376)

اس کے جواب میں گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ انتہائی اہم ہے۔ اس سے گاندھی جی کے اخلاص کا

اندازہ ہوگا جو انھیں خلافت الٰہیہ سے تھا۔ گاندھی جی نے طالب علموں کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

"(۱) میں آپ لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ آپ اپنے ارادوں میں مستقل رہیے۔ جو پاؤں آگے اٹھ چکا ہے پیچھے نہ ہٹائیے۔ اس وقت اسلام خطرے میں ہے۔ خلافت تباہ کردی گئی ہے۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ ہندوستان کی خودداری کو پنجاب میں شکست دے دی گئی ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کاموں پر کمربستہ ہوں اور جو فرائض آپ کے ذمہ اسلام اور ہندوستان کے ہیں انھیں ادا کریں۔"

اساتذہ سے گاندھی جی نے کہا کہ وہ دینی تعلیم دیں جو طلبا کو سچا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنادے قومی مدرسوں کے جاری کرنے کا یہی مقصد ہے کہ ان میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو غلامی سے گریز کریں اور آزادی پر جان دیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ پس اس مدرسے کے اساتذہ وطلبا میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں کہ جس میں مسئلہ خلافت اور سوراج کا دارومدار ہے اور میں ایک پست ہندو ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اسلام کی سلامتی بھی میرے پیش نظر اتنی ہی ہے جتنی ہندو ازم کی ہے۔"

گاندھی جی کی اس مختصر تقریر سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

(۱) گاندھی جی بھی خلافت کے مسئلہ کو اولیت دیتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہر بیان اور ہر تقریر میں نمایاں ہے۔

(2) خلافت اور سوراج قوم کے دو مقصد قرار پاچکے تھے اور دونوں کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیا گیا تھا یعنی ممالک اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب انگریز کی نوآبادی کی طاقت اور غلامئ ہند کی زنجیروں کو توڑا جائے۔

(3) ہندوستان آزادیٔ کامل کی جانب آہستہ لیکن مضبوط قدم اٹھا رہا ہے۔

(۴) ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دے کر اس کے حصول کی عملی اور پرجوش جدوجہد شروع کردی گئی اس اتحاد کا اصول یہ تھا کہ مذہبی امور میں دونوں الگ الگ اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے ملکی معاملات میں سر جوڑ کر کام کریں۔ ضلع ضلع جس طرح ترک موالات کی تحریک پھیل گئی تھی ان کا ذکر کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے "حیات سلیمان" کے صفحہ 221 پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کو ہر ضلع پر قیاس کرلینا چاہیے۔

"ناگپور کانگریس کے بعد پورا ہندوستان ترک موالات کی تحریک سے گونج اٹھا اور یوپی میں اعظم گڑھ اس کا بڑا مرکز بن گیا۔ پورے ضلع میں خلافت کمیٹی کی شاخیں اور پنچایتیں قائم ہوگئیں۔ عدالتوں سے مقدمات قریب قریب ختم ہوگئے۔ شراب نوشی اور شراب کی دوکانیں بالکل بند ہوگئیں۔ اس کا ٹھیکہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ ایک نیشنل اسکول بھی قائم ہوگیا تھا۔ اس میں دو سو طلبا رہتے تھے۔ دارالمصنفین ہندوستان کے

تمام بڑے بڑے لیڈروں کا مرجع بن گیا تھا۔ اعظم گڑھ کی تنظیم کا سہرا مولانا مسعود علی اور سید صاحب کے سر تھا۔ سید صاحب (یعنی سید سلیمان ندوی) زیادہ تر صوبہ اور آل انڈیا کاموں میں حصہ لیتے تھے اور خلافت اور کانگریس کے اہم اجلاسوں میں عموماً شرکت فرماتے تھے۔ اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے سب دارالمصنفین میں ٹھہرتے تھے۔ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، سب کی میزبانی کا شرف دارالمصنفین کو حاصل ہو چکا ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنفین مستقل مہمان خانہ تھا جب یہ دونوں کانگریس کے کاموں کے سلسلہ میں یوپی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو دارالمصنفین ہی کو مرکز بناتے تھے۔ اور کئی کئی دن یہاں ٹھہرتے تھے۔"

## ایک کروڑ روپے کی فراہمی کی کہانی

31 مارچ 1921ء کی بیزوادہ ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے ایک وقت مقررہ کے اندر ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ گاندھی جی جیسا نبض شناسِ قوم اس ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اول یہ کہ کانگریس کے بڑھتے ہوئے کام کے لیے ایک معقول رقم اکٹھا ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ حکومت پر نفسیاتی اثر پڑے کہ گاندھی جی کا کتنا بڑا اثر قوم پر ہے اور کس طرح وہ کل ابنائے ملک کا اعتماد حاصل کر چکے ہیں چنانچہ اس اہم اور زر رپیدا کرنے کے لیے گاندھی جی نے پبلک کے بے انتہا جوش کے پیش نظر ایک کروڑ روپیہ کی فراہمی کے لیے 31 دسمبر 1921ء کا وقت بھی مقرر کر دیا تھا۔ لیکن گاندھی جی کی پکار کے بعد اس میں کیا دقت ہو سکتی تھی خصوصاً جب کہ بڑے بڑے مہاجن گاندھی جی کو "بلینک چک" دستخط کرکے دے رہے تھے۔ اور 31 دسمبر 1921ء تک پورا ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا۔

اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انگریز نے اس کا سخت مقابلہ کیا اور پوری کوشش کی کہ ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے۔ گاندھی جی کے اندر جو عظیم خود اعتمادی تھی اس کی بنا پر وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے لیکن بعض محبان آزادی کے حلقوں میں اضطراب نمایاں ہو گیا۔ اس سلسلہ میں ظفر حسن ایبک (مقیم کابل) کی آپ بیتی جلد اول کے صفحہ 234 کا حسب ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اخبارات سے جو خبریں ہمیں ملتی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کا اس میں کامیاب ہونا محال ہے۔ کانگریس کے دسمبر 1921ء کے سالانہ جلسہ میں کوئی ہفتہ باقی تھا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ روپیہ ہونے کے لیے ابھی چند ایک لاکھ کی اور ضرورت ہے بظاہر یہ معلوم

ہو رہا تھا کہ مقررہ تاریخ تک ایک کروڑ روپیہ جمع نہ ہو سکے گا۔ اس لیے قبلہ مولانا صاحب (مولانا عبید اللہ سندھی) نے فیصلہ کیا کہ روسیوں سے مالی امداد مانگی جائے ... مولانا نے روسی سفیر سے کانگریس کمیٹی کابل کے نام یہ درخواست کی کہ وہ اپنی گورنمنٹ سے مالی مدد دیکر دسمبر 1921ء کے آخری ہفتہ سے پہلے جواب دے۔ روس نے باقی ماندہ چندہ ایک لاکھ روپیہ کانگریس کمیٹی کابل کے ذریعہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کو دینا منظور کر لیا جس کی مولانا نے کانگریس کو خبر دی مگر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ایک کروڑ روپیہ پورا ہونے کی خبر پہنچ گئی۔ مولانا نے روسی سفیر کو خبر بھیج دی۔ اب روپے کی ضرورت نہیں رہی اور کانگریس کمیٹی کابل اس مدد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔"

یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں ہندوستان کی ایک عارضی حکومت اور انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ بھی بنائی تھی اور اس عارضی حکومت کی طرف سے ہندوستان کی تمام انقلابی جماعتوں کو خبر دے دی تھی کہ جب ہندوستان پر حملہ ہو تو ابنائے ہند اس کا مقابلہ نہ کریں۔ انگریزوں کو ہر طرح سے قتل کریں۔ انھیں آدمی اور روپیہ سے مدد نہ دیں۔ ریل تار خراب کرتے رہیں۔ ہندوستان کی خبریں مشتہر کرنے کے لیے جمال پاشا نے وہاں کے اخبار کا فارسی ترجمہ کرا کے اشاعت کا انتظام کیا تھا۔

## کھدر کی اسکیم اور پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ

18 جولائی 1921ء کی ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی نے کھدر کی اسکیم پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صرف مولانا حسرت موہانی مخالف تھے۔ انھوں نے کھدر کی بجائے سودیشی کی تحریک جاری کی.... انھوں نے کانپور میں اپنی سودیشی کپڑوں کی دکان بھی کھولی تھی۔ اور وہاں شب و روز ہر آئندو روند سے کھدر کی مخالفت اور سودیشی کی تائید میں اعداد و شمار کے حوالے سے تقریر فرماتے تھے۔ حسرت موہانی کانگریس اور عوام و خواص میں ان کی بوریہ نشینی بے مثال جرأت حق گوئی، نشہ، آزادی وطن، صاف دماغی اور دیگر اخلاقی و روحانی خصائص کی وجہ سے بڑی عزت تھی۔ لوگ سنتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ مگر یہ سب سعی لاحاصل نکلا۔

31 جولائی 1921ء کو اوّل بار عمر سوبانی کے میدان واقع محلہ پریل بمبئی میں بدیسی کپڑوں کی ہولی منائی گئی۔ لوگ ذوق شوق سے بدیسی کپڑے لاتے اور آگ میں ڈالتے تھے۔ شعلے بلند ہو کر اپنی زبان سے پکار رہے تھے کہ غلامی کے تمام لوازمات نذر آتش کیے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد بدیسی کپڑوں کی ہولی منانا ایک عام طریقہ ہو گیا۔ کوئی شہر اور کوئی قریہ ایسا نہیں تھا جہاں یہ کام نہ کیا گیا ہو۔

# مہاتما گاندھی کا ملک گیر دورہ

مولانا محمد علی مولانا شوکت علی مہاتما گاندھی کے ساتھ مسلسل دورے کر رہے تھے اور ہر جگہ عظیم الشان جلسے ہوتے تھے۔ آدمیوں کی کثرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مولانا محمد علی کی تقریروں سے بڑا جوش وخروش پیدا ہوتا تھا۔ گاندھی جی کی عظمت آسمان کو چھو رہی تھی۔ شہروں میں تقریباً روزمرہ جلسے ہوتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے جن میں مقامی لیڈر تقریریں کرتے تھے۔ اور عوام وخواص ہر ممکن قربانی کے لیے تیار تھے۔ پورا ملک بغاوت پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اس منظر کو جس نے دیکھا وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اب خلافت اور سوراجیہ کی تحریک ایک میں خلط ملط ہوگئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند کے بھی جلسے ہوتے تھے اور ان میں تو گرمی ہی گرمی تھی۔ لیکن اب خلافت کے حصول کا ذریعہ بھی سوراجیہ قرار دیا گیا تھا اور کل ملک کی نگاہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ کانگریس کی اہمیت روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی۔ دوسری جماعتیں بھی اگرچہ بہت پرجوش تھیں اور انھیں کی بدولت یہ فضا پیدا ہوئی تھی۔ تاہم وہ معین ومددگار کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں سرسید احمد خاں نے اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کا افلاس انگریزی حکومت کے مراحم خسروانہ سے ہی دور ہوسکتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں دو قومی نظریہ پیش کیا اور یہ اسکیم تیار کی کہ جہاں تک ہو سکے انگریز کو ہندوستان کا حکمراں رکھا جائے۔ ورنہ اگر انگریز چلا گیا تو ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر غالب آکر مسلمانوں کا مستقبل تباہ وبرباد کر دیں گے۔ اسی کا نام علی گڑھ تحریک تھا۔ یہ بھی میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تحریک خلافت ایک بجلی تھی جو علی گڑھ کے خرمن پر گری۔ مولانا محمد علی کی مذہبیت، دینداری، علم وفضل، انگریزی اور اردو کی بے مثال انشاپردازی، فن شعرگوئی کی مہارت، خطابت کے زور، اپنے خلوص ودیانتداری اور ایثار وقربانی جیسے محاسنِ اعلیٰ سے مزین تھے۔ اور وہ نظربندی سے نکلنے کے بعد ہی ہندوستان کے مسلمہ لیڈر بن گئے تھے۔ جب وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان کا طوفانی دورہ کرتے تھے تو ہر جگہ مہاتما گاندھی کی جے کے ساتھ مولانا محمد علی زندہ باد کے بھی نعرے لگتے تھے۔ اور اللہ اکبر ہندو مسلمان دونوں پکارتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد "انڈیا ونس فریڈم" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "اس کے بعد ہندوستان کے طویل دورے کا زمانہ آیا تاکہ ملک کو تحریک ترک موالات کے لیے تیار کیا جائے۔ گاندھی جی نے کثرت سے دورے کیے۔ میں بیشتر دوروں میں ان کے ساتھ ہوتا تھا محمد علی شوکت علی بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔"

اس تحریک کا منشا اگر یہ ظاہر کرنا ہو کہ درحقیقت مولانا آزاد ہی گاندھی جی کے ساتھ دورے کر رہے تھے اور مولانا

محمد علی و شوکت علی کی پوزیشن کہیں کہیں ان کے ہمراہیوں کی سی تھیں تو یہ بات تاریخ و مشاہدہ دونوں کے خلاف ہے۔ آج اس زمانے کے دیکھنے والے زندہ ہیں۔ میں خود ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی اسکول آف الٰہ آباد سے کالج چھوڑ کر اس تحریک میں شریک ہو گیا تھا اور مسلسل حصہ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی کے دوروں میں خصوصیت سے بالالتزام علی برادران ہی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ مولانا آزاد بھی دورہ کرتے تھے اور بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کرتے تھے ان کا اور گاندھی جی کا بھی کبھی آگے پیچھے اور کبھی ہمراہی میں ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ مولانا کی عظمت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

## دسواں باب

# حکومت کا ردِّ عمل

## کراچی کا مقدمہ

۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس زیرِ صدارت مولانا محمد علی منعقد ہوا کانفرنس میں حسب معمول کافی جوش و خروش تھا۔ اکابر علماء، زعماء اسلام کے علاوہ ہندو لیڈر اور عوام بھی کانفرنس میں شریک تھے اس کانفرنس میں یہ تجویز کی گئی کہ اسلام کی رو سے انگریز کے فوج کی ملازمت حرام ہے کیونکہ اس سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گولی چلانی پڑتی ہے جس کی سزا از روئے قرآن جہنم ہے اور مسلمان فوجیوں کو اس پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ وہ مقامات مقدسہ کو اغیار کے ہاتھ میں چلے جانے میں شریک جنگ ہوں۔ اس تجویز کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تجویز منجانب صدر پیش ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدر جلسہ مولانا محمد علی اس پر تقریر کرنے کے لیے بیتاب رہے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے پورے زور خطابت کو کام میں لاتے ہوئے اور آیات و احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے انتہائی گرم اور طویل تقریر کی۔ اور صرف فوج کی ملازمت ہی کو حرام قرار نہیں دیا بلکہ تمام سامعین کو زبردست ترغیب دی کہ وہ فوجیوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے سلسلے میں پوری کوشش کریں۔ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ تجویز صدارت غیر متنازعہ مسئلہ پر ہوتی ہے اور اس کی تائید نہیں کی جاتی بس ووٹ لیا جاتا ہے۔ اس پر مباحثہ نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا محمد علی کے بعد مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد اور جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ نے بھی پرزور تقریروں سے تجویز کی تائید کی۔ اور تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

پتہ نہیں کہ اس تجویز کے لیے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا گیا تھا یا نہیں۔ جو لوگ فوج میں بغاوت

پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے انداز و اطوار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ اور تشدد ان کا بنیادی اصول ہوتا ہے۔ یہ سب کارروائی سر کو ہتھیلی پر رکھ کر خفیہ کی جاتی ہے۔ مگر شتے بعد از جنگ کی یاسیت کارفرما تھی۔ گویا کہ خود اپنے دانتوں سے لوگ اپنی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا حسرت موہانی صاحب نے مجھے سنایا۔ اس زمانہ میں شہر بشہر قریہ بہ قریہ تقریباً روزانہ جلسے ہوتے رہتے تھے۔ اسی قسم کا ایک جلسہ ان فوجیوں نے کیا جو گورنمنٹ کی طرف سے حجاز اور بیت المقدس لڑ کر آئے تھے اور حکومت کی طرف سے انعامات و اکرامات اور بعض صورتوں میں زمین کے رقبوں سے نوازے گئے تھے۔ ان لوگوں نے جلسہ کی شوکت اور نمائش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا اور سب آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ مولا حسرت فرماتے تھے کہ فرحت اللہ بیگ بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ وہ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو اس کا آغاز اپنے ایک شعر سے کیا۔ اس شعر کو بڑی دلیری سے اور لفظ 'اب' اور 'حامی' پر بڑا زور دے کر ان لوگوں کی جانب ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشارہ کرتے ہوئے پڑھا۔

بن کے اب ترک موالات کے حامی آئے
کرکے برباد حرم کو یہ حرامی آئے

بہرکیف اس تجویز سے انگریز حکومت کی چولیں ہل گئیں۔ رعایا بننے اور بندگی بجالانے کا جذبہ تو کجا یہ ظاہر ہو گیا کہ خواص و عوام سر ہتھیلی پر رکھ کر بغاوت کے میدان میں اتر آئے ہیں۔ کاسہ لیسان حکومت ان جذبات کے لہروں میں بہہ گئے۔ اور ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ گھروں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ میدان میں آنے یا ایک لفظ پبلک میں کہنے کی ہمت نہ تھی۔ خلافت کانفرنس کراچی انگریز حکومت کے تابوت آخری کیل تھی۔ اس تجویز نے جانبازانہ و بہادرانہ عزم حصول آزادی کو انتہائی تقویت دی اور انگریز کو پتہ چل گیا کہ اب اس کو بوریا بستر باندھ لینا چاہیے علماء کا آیات و احادیث سے اور جگت گرو کا ہندو مذہب سے فوج کی ملازمت کو حرام و ناجائز قرار دینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہر ہر شہر اور ہر ہر قریہ میں صدا لگنے لگی۔

باندھ لو بستہ فرنگی راج اب جانے کو ہے

ہمارے ضلع بستی کے شعلہ بار مقرر بابو رام دون سنگھ جو اس وقت کانگریس ضلع بستی کے صدر تھے اس نعرے کو دیتے اور ہر تقریریں کرنے کے لیے آہنگ مشہور ہیں "مرد میداں گاندھی درویش خو" میدان جنگ میں پیچھے رہنے والا نہ تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ "میں بھی کہتا ہوں کہ فوج کی ملازمت حرام ہے" سارا ہندوستان اس سرفروش نعرہ سے گونج اٹھا۔

کراچی کے جلسہ کے بعد حسب معمول مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستان

دورہ شروع کر دیا اور والیٹر کے مقام پر وہ گرفتار کر لیے گئے اور ان پر فوج میں بغاوت پھیلانے اور عوام کو تشدد کی ترغیب دینے کے جرم میں مقدمہ قائم ہوگیا۔

حکومت نے ان تمام لوگوں کو بھی گرفتار کیا جنھوں نے خلافت کانفرنس کراچی میں تقریریں کی تھیں یعنی مولانا شوکت علی۔ مولانا حسین احمد مدنی، جگت گرو شنکر آچاریہ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد پیر غلام مجدد۔ مولانا محمد علی پر عید گاہ کراچی میں ایک باغیانہ تقریر کرنے اور گورنمنٹ کے خلاف نفرت پھیلانے کا بھی الزام تھا۔

مجاہدین کا کارواں اس طرح کمرۂ عدالت میں داخل ہوا تھا کہ:۔

"سب سے پہلے مولانا محمد علی ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں روشنائی کی بوتل لیے داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے مولانا شوکت علی ہنستے ہوئے اور ہاتھ کے مخلص اشارے سے مخلص اور مشتاق نگاہوں اور جوشیلے سلاموں کے جواب دیتے ہوئے داخل ہوئے ان کے پیچھے مولانا حسین احمد مدنی کمال وقار اور متانت کے ساتھ تشریف لائے۔ جگت گرو نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ عصا ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے۔ ان کے بعد ڈاکٹر کچلو اور مولوی نثار احمد باتیں کرتے مسکراتے اور اشاروں سے سلام کا جواب دیتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیر غلام محمد صاحب مسکراتے ہوئے اور قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہوئے تشریف لائے۔ جب تک تمام لیڈر اپنی اپنی جگہ بیٹھ نہ گئے سب لوگ کھڑے رہے"[1]

یہ ابتدائی عدالت تھی۔ مقدمہ قابل سماعت سشن تھا۔ حکومت کی بدحواسی کا نظارہ بھی مندرجہ بالا حوالہ سے درج کیا جاتا ہے جو انتہائی دلچسپ ہے:۔

"ہال کے احاطہ کے ارد گرد خاردار تار لگا دئے گئے تھے اور چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج ایستادہ تھی اور احاطہ کے اندر ڈیڑھ سو ہندوستانی اور ڈیڑھ سو انگریزی فوج تھی۔ ایک مشین گن بھی ہال کے شمالی جانب لاکر نصب کر دی گئی تھی۔ جو لوگ ہال کے اندر تماشہ دیکھنے گئے ان میں اکثر وکلاء اور بیرسٹر صاحبان اور طلبا اور دیگر حضرات تھے

اب نہ مسلمان اور نہ ہندو ان گیدڑ بھبکیوں سے دبنے والا تھا۔ ملزمان نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور گواہان پر کوئی جرح نہیں کی۔ گواہان سی، آئی، ڈی افسر تھے جنھوں نے تقریروں کی

---

[1] سیرت محمد علی، از رئیس احمد جعفری، بحوالہ مقدمہ کراچی مہا از عبدالقادر بیگ ایم اے ایل ایل بی علیگ، مشہد قومی کلا کتبا جمر

عبارتیں پیش کیں اور آخر کار عدالت نے مقدمہ سشن کے سپرد کر دیا۔

## عدالت سشن کی کارروائی

سشن کا مقدمہ شروع ہوا تو بقیہ لوگوں نے خاموشی اختیار کی مگر مولانا محمد علی جج سے الجھ گئے اور زور دے کر کہنا شروع کیا کہ اگر خدا کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا تو میں خدا کا فرماں بردار ہوں گا۔ برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا۔ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کو قرآن کے حکم کا پابند ہونا چاہیے۔ اگر وہ قرآن کے کسی آیت کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک پورا وعظ دے ڈالا جو قطعی بے موقع اور غیر متعلق بات تھی۔ جب ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے بطور ملزم یہ تسلیم کر لیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو برطانوی فوج کی ملازمت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو اقبال جرم مکمل ہو گیا۔ اب جج کے سامنے یہ طول طویل بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ اسلام کی تعلیم اس کے بارے میں کیا ہے اور پیغمبر آخرالزماں صلعم نے کیا تعلیم دی تھی۔

الغرض اسی طرح دیر تک لفظی مقابلہ جاری رہا۔ جج مولانا محمد علی کو روکتا رہا اور وہ اس پر تلے رہے کہ وہ ثابت کر کے رہیں گے کہ قرآن اور حدیث کی رو سے ایک مسلمان کے لیے فوج کی ملازمت حرام ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جج کہتا رہا کہ یہ متعلق بات نہیں ہے اور مولانا محمد علی اڑے رہے اور پورا وعظ کہہ ڈالا اور جج عاجز آکر خاموش ہو گیا۔

جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ کو ایک سال اور بقیہ لوگوں کو دو دو سال قید کا حکم عدالت نے سنایا اس فیصلہ نے حکومت کے خلاف دہکتی ہوئی آگ پر پٹرول کا کام کیا اور تمام ہندوستان شعلہ جوالہ بن گیا۔ بجائے اس کے کہ اس سے کسی خوف و ہراس کا اثر ہوتا لوگوں کی ہمتیں اور بلند ہو گئیں۔ خوف و ہراس کا کیا ذکر ہے۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ لوگ موقع تلاش کرتے تھے کہ کہیں گولی چلے اور ہم گولی کھائیں۔ یہی حال ان ہزاروں اہم طالبعلموں کا تھا جو کالج چھوڑ کر میدان میں نکلے تھے۔

## افغانی ہوّا

اس سے پہلے مولانا محمد علی ایک "افغانی ہوّے" کے طوفان میں مبتلا ہو گئے تھے۔ واقعہ یہ تھا جسے تمام اخباروں نے اس زمانے میں "ہوّے" کے نام سے یاد کیا اور جس کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ہوّا نہ تھا بلکہ مولانا محمود حسن کی ایک اسکیم تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستانی اور قبائلی ہندوستان پر حملہ آور ہو جائیں

اور اندرون ملک بہت سی خفیہ جماعت کے مراکز قائم تھے۔ وہ مراکز جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور ملک آزاد کر لیا جائے اور اس کے بعد ایک آزاد جمہوری متحدہ قومی حکومت قائم کی جائے۔ جو شواہد تاریخی کے اشارے ملتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ الہند کی تحریک میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اور ایوان حکومت کے معززین شامل تھے۔ ان میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ وائسرائے کو سب کچھ معلوم تھا۔ وائسرائے کے پاس ان کارروائیوں، کارگزاریوں اور خطوط کی نقلیں بھی تھیں۔ جو اس سلسلہ میں تعلق رکھتی تھیں اور غداران اسلام حکومت کو پہنچا کر جلب منفعت کرتے تھے۔ ادریس احمد، انیس احمد، اللہ نواز، مولوی رحیم بخش وغیرہ کی کمی تو تھی نہیں۔ وائسرائے نے تیج بہادر سپرو اور پنڈت مالوی کو یہ سب کاغذات دکھلا دیے۔ تیج بہادر سپرو اور مالوی جی نے کی حب الوطنی، اخلاص، بے لوث خدمات کا پورے ملک کو اعتراف تھا لیکن حکومت کے خلاف راست اقدام کو تیج بہادر سپرو ملک کے لیے غیر مفید سمجھتے تھے۔ وہ جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو ایک فرد کی غلط کارروائی تصور کرتے تھے حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیتے تھے۔ مالوی جی نے جلیانوالہ باغ کے معاملہ میں بڑا سرگرم اور جوشیلا کام کیا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ اگر صلح ہو جائے تو اچھا ہے۔ ان وجوہ سے وائسرائے ان کے ذریعہ سے مطلب براری کے خواہاں تھے۔ انگریز کی جماعت میں ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ لارڈ چیمسفورڈ کی جابرانہ اور قاہرانہ پالیسی کے بعد لارڈ ریڈنگ وائسرائے بنائے گئے جو متحمل مزاج، اعلیٰ درجہ کے مدبر اور معاملہ فہم تھے۔ لارڈ ریڈنگ نے آتے ہی اپنا جال بچھا دیا۔ اس وقت تک پورا ہندوستان، غمی ہو چکا تھا اور دلیرانہ میدان اتر آیا تھا حکومت نے اپنی بندوقوں، رائفلوں، مشین گنوں کا جو مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ حکومت کی متشددانہ اور سخت گیر پالیسی بھی ناکام ہو چکی تھی۔ لارڈ ریڈنگ کی غرض یہ تھی کہ کسی طرح یہ آگ بجھ جائے۔ اس کے لیے وہ تدبر کی فسوں کاری کو ذریعہ نجات بنانے پر آمادہ ہوئے۔

ان کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح مہاتما گاندھی کو اپنے دام تزویر میں لے آئیں۔ ابھی تک اہل برطانیہ نے گاندھی جی کو پہچانا نہیں تھا۔ وہ اب تک اس غیر معمولی انسان کو عام سطح سے جانچ رہے تھے۔ دوسری کوشش یہ تھی کہ تحریک اور اس کے لیڈروں کو بدنام کیا جائے۔ چنانچہ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے لارڈ ریڈنگ نے سب سے پہلے گاندھی جی سے ملاقات کرنی چاہی اور ترکیب یہ کی کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات کی خواہش کی ہے بلکہ فضا کچھ اس طرح بنائی جائے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ گاندھی جی نے ملاقات کی درخواست کی ہے۔

رئیس احمد جعفری نے مولانا محمد علی کا ایک مفصل بیان سیرۃ محمد علی میں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالوی جی نے مہاتما گاندھی کو لکھا کہ میں بیمار ہوں ورنہ خود آتا۔ اور میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں اگر آپ الٰہ آباد نہ آسکیں تو میں آؤں۔ اس طرح گاندھی جی جب الٰہ آباد گئے تو وہاں وائسرائے سے ملاقات وائسرائے کی خواہش پر ہوئی۔ درمیان میں مالوی جی تھے۔ یہ ملاقات چھ دن میں پندرہ گھنٹوں تک جاری رہی۔ لارڈ ریڈنگ نے گاندھی جی سے یہ پیشکش کی کہ ہندوستان کو آزادی دلانے اور خلافت ترکیہ کے اقتدار کو بحال کرانے میں وہ مدد دیں گے۔ مگر وہ فقط اس کے خواہاں ہیں کہ ترک موالات کی تحریک تشدد سے بری رہے۔ یہ کوئی کہنے کی بات نہ تھی کیونکہ ترک موالات کی تحریک کی تو بنیاد ہی عدم تشدد پر تھی لیکن اس میں ایک راز پنہاں تھا۔

مولانا محمد علی کے خلاف گورنمنٹ نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان کے پاس شاہ افغانستان کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا تھا اور وہ ہندوستان پر افغانستان کا قبضہ کرا دینا چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی فرماتے ہیں "اس پر بعض معزز ہندو حضرات نے مہاتما گاندھی کو پریشان کر رکھا تھا کہ آپ ان دونوں بھائیوں پر اتنا اعتماد کیوں کرتے ہیں؟ یہ سوراج چاہتے کب ہیں یہ تو ہندوستان پر افغانستان کا راج لانا چاہتے ہیں۔

مالویہ جی اور ڈاکٹر سپرو نے مہاتما گاندھی کو مولانا محمد علی کی تقریروں کے "چند جھوٹے سچے سیاق و سباق سے بے تعلق اقتباسات (جو وائسرائے نے فراہم کیے تھے) اس غرض سے انھیں دکھائے کہ انھیں ہم سے بدظن کر دیں" اس پر مہاتما گاندھی کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان کے متعلق کہ ایک بیان شائع کر دیا جائے کہ مہاتما گاندھی کی ترک تعاون کی تحریک میں رہ کر ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ہم تشدد سے سوراج حاصل کریں۔ لیکن بعض احباب پر ہماری تقریروں کا یہ غلط اثر پڑا ہے۔ اس لیے ہم اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے یہ غلط مطلب بھی نکل سکتا ہے۔"

وہ اقتباسات وائسرائے نے گاندھی جی کو دکھلائے جو سپرو اور مالویہ جی پہلے ہی گاندھی جی کو دکھلا چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر مہاتما جی نے فرمایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ایک بیان ان دونوں بھائیوں کا شائع کرا دوں تاکہ پھر کسی کو بے اطمینانی کے لیے کوئی عذر ہی باقی نہ رہے۔ اس پر وائسرائے نے کہا کہ یہ بہت اچھا ہوگا۔ حکومت ہند نے فیصلہ کیا تھا کہ علی برادران پر مقدمہ چلایا جائے۔ لیکن اگر یہ بیان شائع ہو جائیگا تو پھر مقدمہ چلانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ سن کر مہاتما نے فرمایا کہ مقدمہ چلانا نہ چلانا آپ کا کام ہے اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو ایک ضروری بیان شائع کرانا ہے اور وہ ہمارا ہر حالت میں فرض ہے خواہ آپ مقدمہ چلائیں یا نہ چلائیں۔

چنانچہ ڈاکٹر سپرو اور پنڈت مالویہ جی کو دکھلا کر مولانا محمد علی کا مذکورہ بالا بیان اخبارات میں شائع ہو گیا لیکن بیان دینے سے قبل مولانا محمد علی نے بجا طور پر ان اقتباسات کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی

اتفاق کرتے ہوئے لارڈ ریڈنگ اور پنڈت مالویہ دونوں کو تار دیا۔ لارڈ ریڈنگ نے تو خاموشی اختیار کی لیکن مالویہ جی نے اقتباسات بھیج دیے۔

مولانا محمد علی کا بیان ہے کہ "میں نے جب یہ اقتباسات پڑھے تو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ بعض تو غلط فہمی یا غلط سننے یا غلط نویسی کا نتیجہ ہیں اور بعض کے صریحاً غلط معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ ایک بھی اقتباس ایسا نہیں ہے جس سے تشدد کی ترغیب یا نیت ثابت ہو" پھر بھی اپنے ابنائے وطن کے دل سے شک و شبہ دور کرنے کے لیے بیان شائع کر دیا۔

بیان کا شائع ہونا تھا کہ حکومت نے تمام ہندوستان میں ڈنکا پیٹ دیا کہ مولانا محمد علی نے معافی مانگ لی ورنہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔ خیال یہ تھا کہ عوام محمد علی سے بدظن ہو جائیں گے۔ لیکن اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ لوگ حیرت زدہ ضرور ہوئے مگر ریشہ دوانی کا بھید سمجھ گئے۔

لارڈ ریڈنگ نے اس بیان اور گاندھی جی کی ملاقات کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور چیمسفورڈ کلب میں تقریر کرتے ہوئے اوّل تو یہ ظاہر کیا کہ گویا گاندھی جی ملاقات کے سائل بن کر آئے تھے۔ دوسری جانب یہ اشارہ تھا کہ محمد علی نے معافی مانگ لی ورنہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا۔ مولانا محمد علی تحریر کرتے ہیں کہ "میرے جلد باز بھائی مولانا حسرت موہانی نے اس تقریر کو پڑھتے ہی مجھے ایک کارڈ لکھا جس میں درج تھا کہ اگر مہاتما جی نے تمہیں اس بیان کے شائع کرنے سے پہلے ہی اطلاع دے دی تھی کہ وائسرائے نے اس شرط پر تمہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر کوئی بزدل نہیں۔ اور اگر انھوں نے اس کی اطلاع تمھیں نہ دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں۔ لیکن میرے جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوجھا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے ملاقات خلاصہ درج کیا ہو۔"

آگے چل کر مولانا محمد علی لکھتے ہیں کہ:۔

"بہرحال جب میں نے چیمسفورڈ کلب والی تقریر پڑھی تو سارا بدن پھنک گیا اور میں نے مہاتما جی سے کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دے دوں۔ جلسہ خلافت کا تھا۔ میں صدر تھا۔ تقریر صدارت کچھ اور ہونے والی تھی مگر اس کے بعد میں نے صرف لارڈ ریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر میں اس سے زیادہ سخت کوئی تقریر کی ہو گی۔"

اس کے بعد کراچی کا مقدمہ چلایا گیا۔ کراچی کے مقدمے کے فیصلے کے بعد مولانا محمد علی اور زیادہ ہیرو بن گئے۔ اگرچہ سزا تو بہت سے لوگوں کو ہوئی مگر زیادہ ذکر مولانا محمد علی کا تھا کیونکہ اول تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیڈر تھے دوسرے انھیں نے تجویز صدر کی حیثیت سے پیش کی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی۔ روزمرّہ جلسے ہوتے تھے۔ اور جلسوں میں معلوم نہیں کہاں کہاں سے رضاکار آجاتے تھے جو جلسے کے اندر اور جلسے کے باہر اپنی محفل جماتے اور طرح طرح کے اشعار گاتے تھے۔ ٹولیاں جمع ہو جاتی تھیں اور اوقات کانفرنس کے باہر پبلک کو مشغول رکھتی تھیں۔ گھر گھر یہ صدا پہنچ چکی تھی:

بولیں اماں محمد علی کی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی　　جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی کے ساتھ بہت سے بند تھے اور آخر کا حصّہ وہی تھا "جان بیٹا خلافت پہ دے دو"۔ کاش کہ ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر سے الگ ہو کر کسی نے تاریخ کی خدمت کے لیے ان تمام اشعار کو جمع کیا ہوتا تو اس سے اس زمانہ پر اچھی روشنی پڑتی۔ اب کراچی کے فیصلے کے بعد کی ایک دلگداز نظم ملی ہے جو درج ذیل ہے:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی　　ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو ریشم کے کپڑے مبارک　　تم کو تہذیب و سلیقے مبارک
ہم کو کمبل کے ٹکڑے مبارک　　ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو محلوں میں رہنا مبارک　　تم کو تکیہ مسہری مبارک
ہم کو مٹی پہ سونا مبارک　　ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو دودھ اور حلوہ مبارک　　تم کو بسکٹ و مکھن مبارک
ہم کو کچی ہی روٹی مبارک　　ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

یہ والہانہ جذبات، یہ اظہار عقیدت و محبت کیسے دلیرانہ عزم اور قانون کی گرفت سے لاپروائی کی داستان بیان کرتے ہیں۔ اشعار پڑھے جاتے تھے اور لوگ زار قطار روتے تھے۔ بجنور میں ایک مشہور قصبہ کرتپور ہے۔ کرتپور میں مرزا عبداللطیف بیگ کا مکان تھا جو ضلع کانگریس کمیٹی بجنور کے صدر تھے۔ کرتپور میں ایک ضلعی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت خود مرزا عبداللطیف بیگ نے کی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ یہ کانفرنس احمد آباد کانگریس سے پہلے اور کراچی کے مقدمہ کے فیصلے کے بعد ہوئی تھی۔ مرزا عبداللطیف بیگ بڑے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ وہ لوگوں کا رونا اور بلکنا دیکھ کر مجھ سے اس کانفرنس کے قبل کہنے لگے کہ میں رونے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ ایک کمزوری کی بات ہے۔ بات گئی گزری ہو گئی۔ چند ہی روز بعد کرتپور میں کانفرنس ہوئی وہاں معلوم نہیں کہاں سے ایک گانے والے والنٹیروں کی ٹولی آگئی۔ پہلے ان لوگوں نے قصبہ میں گشت کرکے بڑے ہی دلکش انداز میں گھر گھر گایا:

اب تو چرخے کا آیا زمانہ      میری ماں بہنو چرخہ چلاؤ

میں نے اس پوری نظم کو لکھ لیا تھا مگر افسوس کہ اب موجود نہیں ہے صرف یہی شعر یاد رہ گیا۔ اس کے بعد کانفرنس کے باہر وہی کراچی والی نظم گائی گئی۔ جب کانفرنس شروع ہوئی تو لوگوں کی درخواست پر جناب صدر نے اندرونِ کانفرنس اس نظم کو پڑھنے کی اجازت دیدی۔ اللہ اللہ کیا سماں تھا، سارا مجمع بیقرار تھا اور سب سے زیادہ مرزا عبد اللطیف بیگ کا حال خراب تھا۔ زار و قطار رو رہے تھے۔ تمام چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ بعد کو میں نے ان سے پوچھا حضرت! آپ کا وہ وعظ کیا ہوا؟ غم انگیز لہجے میں کہا "بے قابو ہو گیا تھا"

یہ معاملہ کوئی انوکھا نہ تھا۔ سارے ملک کا یہی حال تھا۔ روزمرہ گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ لوگ خوشی خوشی جیل جاتے تھے اور بعض جگہ لاریاں کھڑی کر دی جاتی تھیں تو اتنے آدمی اس پر کود کود کر بیٹھتے تھے کہ پولیس کو روکنا پڑتا تھا کہ اب گنجائش نہیں ہے۔ بالکل یہ حال تھا ؎

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

# حکومت کا رویّہ

لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے کا رویہ جابرانہ و قاہرانہ تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ڈرا دھمکا کر کام نکال لیا جائے گا۔ وہ اپنی گورا فوج مشین گن اور رائفلوں کی نمائش کرتے تھے اور جب اس سے عوام مرعوب نہیں ہوتے تو دوسرا طریقہ بے حساب گرفتاریوں، لمبی سزاؤں اور جیل کے اندر ہر طرح کی سختی کا اختیار کیا۔ بات بات پر قیدِ تنہائی کی سزا دی جاتی تھی۔ جن لوگوں کو قید بامشقت کا حکم عدالت سے ہوتا تھا ان سے رام بانس کٹوایا جاتا تھا۔ دیواریں لپوائی جاتی تھیں۔ گرمیوں میں لوگ بارکوں میں بند کر دیے جاتے تھے اور سردیوں میں بارکوں کے دروازے کھلے رکھے جاتے تھے۔ ٹاٹ اور کمبل میں بے شمار پسّو ہوتے تھے۔ کھانے میں روٹی گیلی ہوتی تھی، آدھی کچّی تول میں پوری اتر گئی۔ بقیہ آٹا حکّام جیل کے گھر۔ لیکن اسے کون کھائے۔ صبح آٹھ بجے سور کی دال دے دی اور پانچ بجے شام کو بینگن کی ترکاری اور ترکاری بھی کیسی جس میں بعض اوقات کیڑے تیرتے رہتے تھے۔ اخبار قطعی منع تھا اور اخبار اگر کسی طرح سے آجائے اور مل جائے تو ایسا چھاپہ پڑتا تھا کہ جس طرح قتل اور ڈکیتی کے ملزم پر پڑتا ہے۔

البتہ بعض افسران ایسے بھی تھے جو امتحان لے رہے تھے کہ جذبہ کی گہرائی کیا ہے اور ہندستانی کتنے پانی میں ہیں۔ وہ یا تو چیلنج کرتے تھے یا کھلی چھوٹ دے دیتے تھے۔ مثلاً لاہور کے کلکٹر نے چیلنج کا رویہ اختیار کیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے پچاس گریجویٹ دھو بیے کا نہیں ۱۹۲۰ء کا گریجویٹ آج کا

نہیں) ایک دن جیل بھیجے۔ کلکٹر نے چیلنج کے لہجہ میں کہا۔ بہت خوب سے جاؤ ان کو انگلش کوارٹر میں۔ انگلش کوارٹر جیل کا سب سے آرام دہ مقام تھا۔ جہاں عمدہ غذا بھی ملتی تھی کیونکہ اس میں گورے رکھے جاتے تھے۔ دوسرے دن لالہ جی نے پھر پچاس گریجویٹ بھیجے۔ پھر کلکٹر نے وہی حکم دیا۔ اندازہ یہ تھا کہ دیکھیں ظرف ہندوستان کا۔ تیسرے دن بھی پچاس گریجویٹ۔ اب تو کلکٹر کے چہرے پر حیرانی اور خوف کے آثار نمایاں ہوئے۔ مگر پھر وہی حکم ے جاؤ انگلش کوارٹر۔ چوتھے دن پھر پچاس گریجویٹ۔ اب کلکٹر ہمت ہار گیا اور کہنے لگا:۔

INDIA IS MAKING A SACRIFICE AND IF INDIA
GOES ON MAKING THIS SACRIFICE WE SHALL
HAVE NO OJECTION IN LEAVING INDIA.

(ہندوستان قربانی دے رہا ہے۔ اور اگر ہندوستان اسی طرح قربانی دیتا رہا تو ہم کو ہندوستان سے چل دینے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا)

ہتھکڑیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ اسی لیے مولانا سید محمد فاخر بیخودؔ الٰہ آبادی سجادہ نشیں دائرۂ شاہ اجمل جب گرفتار ہوئے تو ایک نظم کہی اس کا ایک شعر ہے ؎

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں        باپ دادا کا طریقہ سنتِ سجاد ہے

# خواتین

شروعِ تحریک سے خواتین بھی میدان میں آگئی تھیں۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے قدم اٹھانے والی بی اماں تھیں۔ بی اماں کی گود میں علی برادران جیسے دلاور و جانبازانِ اسلام نے پرورش پائی تھی۔ بی اماں بڑی ہی دیندار اور خدا پرست بی بی تھیں۔ یہ لوگ چھوٹے ہی تھے کہ بی اماں بیوہ ہوگئیں۔ یہ انھیں کا دل و گردہ تھا کہ اس عالم میں ایسی تعلیم دلائی اور ایسی اسلامی تربیت دی کہ انگلستان جاکر اور انگریزی کے بہترین انشاء پرداز اور مقرر ہونے کے باوجود اسلامی معتقدات پر مضبوطی سے جمے رہے۔ بی اماں بوڑھی تھیں اور ان کو مالویہ جی وغیرہ بھی ماتا ہی کہتے تھے۔ وہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور کراچی کے مقدمہ کی سزا پالی کے بعد تو وہ مکمل کام کرنے لگی تھیں۔ بیگم محمد علی برقعہ اوڑھتی تھیں اور اسی طرح انھوں نے مقدمہ کراچی کے بعد کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ تمام جلسوں میں جاتی تھیں اور تقریریں بھی کرتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی کے صرف ایک لڑکی تھی۔ مولانا حسرت موہانی برقعہ کے قائل نہیں تھے۔ وہ صرف ایسا لباس پہننے کے قائل تھے جس میں سارا بدن چھپا رہے۔ بیگم حسرت موہانی اور ان کی صاحبزادی برابر جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو لمبی چادریں اوڑھے

دیکھا۔ اگرچہ برقع نہیں ہوتا تھا مگر چہرہ یا جسم کا کوئی حصہ کبھی نظر نہیں آیا۔ ان کی تقلید میں بہت سی عورتیں پردہ سے باہر نکل پڑی تھیں۔ جلوس نکالتیں اور دل پر چوٹ مارنے والے نعرے لگاتی تھیں۔

جہاں تک ہندو عورتوں کا تعلق ہے گاندھی جی کا ایک خاص مشن انھیں پردے سے باہر نکالنا اور ملکی کاموں میں لگا دینا تھا۔ چنانچہ اس کا گہرا اثر ہوا۔ ہر عمر کی عورتیں نکل پڑیں اور جیل بھی کثرت سے گئیں۔ میں نے لاہور میں عورتوں کے جلوس کے دو گانے سنے جو بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئے۔ ایک کا مطلب یہ تھا کہ آگ لگے چولہے اور گھر کو، جل لکچر سننے۔ دوسرے میں ڈاکیہ کو مخاطب کرکے بار بار کہا گیا تھا کہ خط آیا ہے کس کا ان لوگوں کا جو ملک پر قربان ہو کر جیل گئے تھے مثلاً

اے ڈاکیے اے ڈاکیے سنا بتا نا کیا آغا صفدر کا کوئی خط آیا ہے؟

اسی طرح مختلف قیدیوں کے نام لیے جاتے تھے۔ یہ ہندو مسلم اتحاد اور دلوں کی صفائی کا بھی ایک مخصوص اور دلربا منظر تھا۔

الغرض یہ تھے حالات اور کاروانِ آزادی گاندھی جی کی قیادت میں ہر مشکل اور ہر مصیبت سے لاپروا منزل کی جانب چلا جا رہا تھا اور سارے ہندوستان کے علما اور مسلم لیڈر گاندھی جی سے مل کر معاہدہ سیورے کی ترمیم اور خلافتِ عظمیٰ کی بحالی اور حصولِ سوراج کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

## چند مثالیں

ہندوستان کی جرأت و مردانگی واستقامت اور حکومت کی جابرانہ حرکات کا اندازہ اخبار زمیندار میں طبع ہونے والے چند واقعات سے ہوگا انھیں مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جا رہا ہے۔

15 دسمبر 1921ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مدیر "پیغام" کلکتہ کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

19 دسمبر 1921ء کو الہ آباد میں منظر علی سوختہ گرفتار کیے گئے اور اسی دن مولوی عبدالرحمن سکریٹری مجلس خلافت کلکتہ میں گرفتار ہوئے۔ ایک کثیر مجمع نے حلف لیا کہ وہ کھدر پہنیں گے اور خلافت فنڈ میں ہر ماہ چندہ دیں گے۔

اسی دن کی خبر ہے کہ پنڈت ہنومان پرشاد و سپاہی پلٹن 17 نے بیان کیا کہ ان کی پلٹن کو جب وہ بصرہ میں مقیم تھی اخبارات کے ذریعہ کانگرس کے احکام موصول ہوتے اور بہت سے اشخاص ترکِ ملازمت کے لیے تیار ہو گئے۔ پلٹن کراچی واپس لائی گئی جہاں ان سب لوگوں نے استعفیٰ دے دیا۔

لاہور میں آٹھ آٹھ سال کے بچے ڈبی بازار میں گشت کر کے کہہ رہے تھے کہ فوج کی ملازمت حرام ہے ان کو پولیس نے ڈنڈوں سے پیٹا۔

20 دسمبر 1921ء کو روز نامہ اینڈ پینڈنٹ الہ آباد کی دو ہزار روپیہ کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اسی دن پنڈت مدن موہن مالوی کے بھانجے شری کرشن کانت مالوی گرفتار ہوئے۔

22 دسمبر 1921ء کو پانچ سو رضا کار کلکتہ میں نکلے 253 گرفتار ہوئے۔

25 دسمبر کو مرتضیٰ احمد خاں نے ترکی خاتون فاطمہ خانم پر ایک نظم لکھی جس کے مجاہدانہ کارناموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

جنسِ لطیف عازمِ میدانِ جنگ ہے — اے ننگِ قوم مرد ہے عبرت کا یہ مقام

22 دسمبر 1921ء کو لالہ لاجپت رائے، کے سنتانم، ملک لال خاں، ڈاکٹر گوپی چند کا مقدمہ سنٹرل جیل لاہور میں پیش ہوا۔ گورنمنٹ کے وکیل مسٹر ہربرٹ نے جب کہا کہ عدالت ان چاروں میں کسی پر بھی رحم نہ کرے اور جس قدر سزا کا اختیار ہے وہ کل سزا ان کو دے تو کے سنتانم نے کہا "آمین" مسٹر ہربرٹ نے کہا کہ لالہ لاجپت رائے نے اپنے پیغام میں جو 3 دسمبر کو صبح 5 بجے کے وقت لکھا گیا تھا اور جس پر لالہ جی کے دستخط ہیں لکھا ہے کہ ہم جانتے تھے کہ اس جلسے کے انعقاد کی ممانعت کی جائے گی اور ہم گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پھر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اس حکم کا علم نہیں تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے فرمایا "لیکن کہتا ہی کون ہے" سنتانم نے کہا "ہم جانتے تھے کہ ایک پاگل کتا موجود ہے ممکن تھا کہ وہ ہمیں کاٹتا۔"

22 دسمبر 1921ء کو لالہ روپ لال سکریٹری کانگریس کمیٹی شہر امرت سر کو چھ ماہ قید سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اور سید برجیس سکریٹری کانگریس فیروز پور کے مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ لالہ لاجپت رائے جالندھر کو ایک سال قید با مشقت کی سزا ہوئی اور بیس رضا کاران لاہور نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس کا جواب پبلک نے یہ دیا کہ دو گھنٹے تک اسی ممنوعہ راستہ سے گزرتے اور نعرے لگاتے رہے۔ اسی 22 دسمبر 1921ء کو لالہ بدری ناتھ ایڈیٹر روزنامہ "سوراج" لاہور پر حسب دفعہ 124 تعزیرات ہند سزا سناتے ہوئے میجر فیر مجسٹریٹ نے کہا "میں بدری ناتھ پر دفعہ 124 تعزیرات ہند فردِ جرم لگا رہا ہوں۔ عدالت میں اس کے رویہ کو دیکھ کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ دیوانے کتے کے مانند ہے جس کو زہر پھیلانے سے قید کے سوا کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میں اس کو تین سال قید با مشقت کی سزا دیتا ہوں۔

20 دسمبر کو مولانا محمد شفیق، محمد عبدالودود، بابو جھنگ دھاری پرشاد، بابو وندھیا دری پرشاد درماکا

مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ صرف نو وکلا کو اجازت دی گئی تھی کہ ایک بجے اذان ہوئی۔ عدالت نے نماز ادا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مولوی محمد شفیق اور محمد عبدالودود نے وہیں کمرۂ عدالت میں نماز ادا کی اور کہا کہ پانچ سو رضاکار شہر میں گشت کرتے پھرے اور گھنٹہ بجا بجا کر اعلان کیا کہ لوگ کچہری کے احاطہ میں جمع ہوں۔ بابو تارکیسری پرشاد سکریٹری گرفتار کر لیے گئے۔

25 دسمبر کو ہیڈ کانسٹبل محمد اکبر جس نے تین دن ہوئے استغاثہ کی طرف سے گواہی دی تھی درخواست دی کہ میں نے جو بیان دیا ہے۔ دباؤ اور ناجائز دباؤ سے دیا ہے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر میں استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میرا ضمیر انگریزی حکومت کی ملازمت کی لعنت کو ایک منٹ بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسے دفعہ 29 پولیس ایکٹ کے ماتحت تین ماہ قید کی سزا دی گئی۔

دو لڑکوں، محمد اعظم اور عبدالعزیز جو 18، 19 سال کے تھے، ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ کھدر کا پرچار کر رہے ہیں۔ اور ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

26 دسمبر 1921ء کے زمیندار کے مقالہ افتتاحیہ میں حسب ذیل عبارت ہے:۔

"پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے دن سے تحریک کو بیش از بیش تقویت حاصل ہوئی ہے۔ مقامی کانگریس کے دفتر میں عرضیوں پر عرضیاں چلی آ رہی ہیں۔ اور شہر کے باشندے رضاکاروں میں بھرتی ہونے کے لیے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ شہزادہ ویلز کی تشریف آوری کے دن بغیر کہے ایسی مکمل ہڑتال ہوئی کہ الٰہ آباد کے آسمان نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے طالب علموں نے حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف 15 دسمبر سے 21 دسمبر 1921ء تک مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آنریبل سر نوود مسٹر جسٹس سی، ای گھوش ڈاکٹر سارت پاسک اور رائے بہادر جونی بی بہادر کے بیٹوں نے اس قرارداد کے حق میں رائے دی۔ زمیندار تبصرہ کرتا ہے:۔

"پنڈت مدن موہن مالوی جی اور ڈاکٹر سپرد کے بیٹے تو عملی حصہ لے چکے ہیں۔ اب ان حامیانِ موالات کے فرزندوں کا طرز عمل ملاحظہ ہو۔ یہ تو بزادہ کا بڑا دہ خراب ہو چلا۔"

22 دسمبر 1921ء کو احمق پھپھوندوی مشہور مزاحیہ شاعر گرفتار ہوئے۔ کلکتہ کے دس ہزار قلیوں نے کام بند کر دیا۔

24 دسمبر 1921ء کو شہزادہ ویلز کی آمد کلکتہ میں تھی۔ مکمل بائیکاٹ کا اشتہار دیا گیا اور ہو کا عالم پیدا ہو گیا۔

26 دسمبر 1921ء مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی 8 بجے صبح اپنے مکان پر گرفتار ہوئے۔ مولانا کے

اعزاز اور اتنے عظیم لیڈر کی گرفتاری کے ردعمل سے خوفزدہ ہو کر ایک کثیر تعداد پولیس کو لے کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خود معہ موٹر آیا تھا مگر مولانا نے موٹر میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معمولی رضاکار کی طرح ہتھکڑی ڈال کر لے چلو۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے خود مولانا کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور لے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد حسب ذیل پیغام دیا تھا۔

## مولانا آزاد کا پیغام

انتظار کی رات بڑی تاریک تھی لیکن امید کی صبح بھی کیسی دلفریب اور جانفزا ہے۔ افسوس ان پر جو اب بھی کروٹ نہ لیں۔ آؤ غفلت کا بستر ہمیشہ کے لیے تہہ کر دیں۔ خدا کا پاک نام لیں اور راہِ مقصد میں آخری کوچ کریں۔ راستہ صاف اور منزل سامنے آ رہی ہے۔ ہمت صبر قربانی استقامت کے چند ایام میں صدیوں کا سفر طے ہو جائے گا۔

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا　　اب لیا چشمۂ بقا تو نے

اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

فقیر ابوالکلام　10 دسمبر 1921

## باپ کا خط بیٹے کے نام

کے از ہزا ملاحظہ ہو۔

اللہ اکبر

برخوردار من اطیع اللہ خاں زاد اللہ عزہ وقدرہ

بعد دعائے ترقیِ عمر و درجات کے واضح ہو کہ شاباش فی الحقیقت مجھے مسرت ہوئی کہ خداوند تعالیٰ نے تم جیسا بیٹا دیا۔ اپنی بات اور مذہب پر قائم رہنا۔ پائے ثبات لغزش نہ کھا جائے۔ کامیابی ضرور ہوگی انشاءاللہ تعالےٰ۔ ایسے دوستوں کو جو جیل میں ہیں میری مبارک باد اور دعا پہنچا دینا کیونکہ وہ بھی میرے بچے اور بھائی ہیں۔ اور اللہ تمہاری اور سب کارکنانِ خلافت کی مدد کرے آمین ثم آمین۔

راقم چودھری حبیب اللہ خاں رئیس قصبہ سہاور

ضلع ایٹہ　25 دسمبر 1921ء

جگراؤں میں چند رضاکار گرفتار ہوئے تو دس ہزار کے مجمع نے ان کا استقبال کیا۔ 3 جنوری

1920ء کو کرشن کانت مالوی اور گووند مالوی اپنے رفقاء سمیت پھر گرفتار ہوئے۔ 8 جنوری 1922ء کو ولنگٹن اسکوائر کلکتہ میں رضاکاروں کی بھرتی روکنے کے لیے ایک یورپین کمشنر ایک ہندوستانی ماتحت افسر اور سارجنٹ نے دھاوا بول دیا۔ جس پر ہزاروں آدمی رضاکار بنے اور دوسرے چار سو رضاکاروں نے گشت کیا جس میں 169 گرفتار ہوئے۔

20 جنوری 1922ء کو علی گڑھ میں سب انسپکٹر نے رضاکاروں سے منتشر ہونے کو کہا۔ رضاکاروں کے لیڈر عبدالحمید خاں نے جواب دیا کہ تم اگر اس ریاکار حکومت کے اتنے دلدادہ ہو تو کیا ہم مو ر مذہبی اور احکام الٰہی سے سرمو سرتابی کر سکتے ہیں۔ اس پر پولیس والوں نے بندوق کے کندوں، بوٹ کے ٹھوکروں اور ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور عبدالحمید خاں نے کہہ دیا کہ بیٹھ جاؤ اور یہ شعر پڑھا۔

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت      سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور قومی نعرہ لگا کر سب بیٹھ گئے۔ سب انسپکٹر نے قریب ایک فرلانگ پیٹ اور ہتھیلیوں کے بل گھسیٹا لیکن ان کے ابرو پر بل نہ آیا۔ حتیٰ کہ ایک رضاکار صادق علی کو ایک دوکاندار کے جلتے ہوئے تیل کی کڑھائی پر ڈھکیل دیا جس سے اس کا جسم جل گیا۔ جو رضاکار مار سے بے ہوش ہو جاتا اسے اٹھا کر دفتر بھیج دیا جاتا تھا۔ مگر نہ کوئی بھاگا اور نہ کوئی ہاتھ اٹھا (ایسے واقعات عام تھے)

6 جنوری 1922ء کو 24 رضاکاروں کا دستہ پنڈت پریم پرکاش اور ماسٹر دیا رام کی سرکردگی میں نعرے لگاتا ہوا امرت سر میں نکلا۔ پولیس اور گورکھا فوج کا ایک زبردست دستہ لاٹھیوں اور بندوقوں سے مسلح وہاں پہنچا اور نہایت بے دردی سے بید اور لاٹھیوں سے مضروب کیا۔ پنڈت پریم پرکاش کو سخت ضرب آئی اور وہ بے ہوش ہو گئے مگر رضاکاروں کے دوسرے دستوں نے برابر گشت جاری رکھا۔

18 جنوری 1922ء کو مولوی منظور احمد صاحب مبلغ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو رہا کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے مسکرا کر کہا کہ ہمارے پاس ڈپٹی کمشنر کا حکم آیا ہے کہ آپ ساڑھے تین ہفتے جیل گزار چکے۔ ہم آپ کو زیادہ دیر جیل میں رکھنا نہیں چاہتے۔ مولوی منظور احمد نے جواب دیا مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ مجھے آپ رکھتے ہیں کہ چھوڑتے ہیں۔ میں تو ایک دو سال جیل میں گزارنے کی امید رکھتا تھا۔

شراب کی دوکانوں پر خریدار اب نہیں ملتے تھے۔ شراب کی دوکانوں پر مسلسل پہرے کا یہ اثر تھا جو کانگریس والنٹیر جاری رکھے ہوئے تھے۔ 23 جنوری 1922ء کو اکالی پریس اور سیاست پریس کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی گرفتاری پر ظفر علی خاں نے منٹگمری جیل سے حسبِ ذیل نظم بھیجی جو مسلم کے فرضی نام سے ۱۹ فروری ۱۹۲۲ء کے زمیندار میں طبع ہوئی۔

توبہ کو میں بھی توڑ دوں بادہ جو خانہ ساز ہو — اس میں ملی ہوئی مگر چاشنیٔ حجاز ہو
لا وہ دو آتشہ شراب جس سے ہو گرم خوں مرا — ساقیِ انجمن نواز عمر تری دراز ہو
بزم میں روشنی ہوئی شمعِ جہاں پگھل گئی — کیوں نہ دعا میں ہو اثر دل میں اگر گداز ہو
کفر کی شوخیوں کو دیکھ تاکہ ہو خوں ترا جگر — خونِ جگر سے کر وضو تاکہ تری نماز ہو
آئے ابوالکلام بھی ہو کے اسیر جیل میں — تاکہ دراز رشتۂ خلوتیانِ راز ہو

## گیارھواں باب

# جنگِ ترکی و یونان

### سمرنا پر یونانی قبضہ

جنگِ عظیم کے بعد سب سے بڑی طاقت برطانیہ عظمیٰ کی تھی۔ یہ سب سے بڑے سیاسی چودھری تھے۔ ان کے حکم پر دنیا چل رہی تھی۔ اس لیے ترکی کے ساتھ جتنی ناانصافیاں اور ترکوں پر ظلم آرائیاں ہوئیں ان کا ذمہ دار بجا طور پر برطانیہ ہی کو قرار دیا گیا۔ پیرس میں دول عظمیٰ کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ آپ کو الفاظ کہیں موسیو کلیمینشو کے ملیں گے کہیں کوئی اور آواز سنائی دے گی لیکن یہ سب بہرصورت انگریز یعنی برطانیہ ہی کے آلۂ کار تھے۔ بات وہی ہوتی تھی جو انگریز طے کرتا تھا۔ مسٹر ولسن کے نکات عالیہ محض ان کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے کاغذ پر لکھ لیے گئے تھے۔ چنانچہ ایک عجوبۂ روزگار بات یہ ہوئی کہ مستقل صلح سے قبل، جو بات عارضی صلح میں نہیں تھی، وہ کانفرنس نے منظور کر لیا اور یونان کو سمرنا پر قبضہ کرنے اور اناطولیہ پر تسلط جمانے کا حق دے دیا گیا۔ پیرس کانفرنس میں لائیڈ جارج، موسیو کلیمینشو اور لانڈرو دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ موسیو کلیمینشو کو ترکی سے بڑا بغض تھا اور وہ ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ ۵ مئی ۱۹۱۹ء کو موسیو کلیمینشو کی تجویز پر صلح کانفرنس نے یونان کو سمرنا پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی اور 13 مئی ۱۹۱۹ء کو اتحادی بیڑے کی حمایت میں یونانی فوج سمرنا پر اتری۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ 13 مئی ۱۹۱۹ء کو برطانوی اور اطالوی جہازوں کے زیر سایہ یونانی فوج سمرنا پر اتری۔ اسی دن مصطفیٰ کمال اناطولیہ کے لشکر کے انسپکٹر جنرل کی حیثیت سے سمرنا کی جانب روانہ ہوا۔ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ سمرنا کے ساحل پر یونانی فوجیں اتریں اور ایک تیز رو موٹر ساحل سمندر سے جا کر سمرنا کے ترک گورنر کو بلا لایا۔ گورنر سے کمانڈنگ افسر نے کہا کہ امیر البحر (برطانیہ) نے حکم دیا ہے کہ سمرنا اور صوبہ ایدین یونان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اگر گورنر کے پیروں کے پاس بجلی گری ہوتی تو وہ اتنا متوحش نہ ہوتا جتنا کہ اس حکم سے ہوا۔ بہادر ترک حالات سے مجبور کمانڈنگ افسر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ حکم اس نے جب سنا تو

اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ گورنر نے سر اوپر اٹھایا زبان کھولی اور کہا کہ سمرنا برطانیہ فرانس، اٹلی کسی کے حوالے کر دیا جائے مگر یونان کے حوالے نہ کیا جائے۔ افسر کمانڈنگ نے مغرور لہجہ میں جواب دیا "یہ اتحادیوں کی سپریم کونسل پیرس کا فیصلہ ہے اور ناقابلِ ترمیم ہے۔" مجبوراً گورنر نے چارج دے دیا۔ خلیفۃ المسلمین خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ، سلطان عبدالوحید خاں غازی کا فرمان واجب الاذعان پہلے ہی آچکا تھا کہ سمرنا میں مداخلت نہ کی جائے۔ ظل اللہ نے مجلس ملی (ترکی پارلیمنٹ) کو جو احتجاج کر رہی تھی پہلے ہی توڑ دیا تھا اور کاسہ لیس برطانیہ داماد فرید پاشا کو جملہ اختیارات سونپ دیے تھے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہوئی کہ سمندر کے ساحل پر ایک لاکھ کے قریب یونانی جمع ہو گئے۔ اور ان سب میں نمایاں یونان کا پادری تھا۔ جس وقت یونانی سپاہی جہازت سے ساحل سمندر پر آئے اس نے اپنے صلیب کو بلند کیا ادھر یونان کے سپاہیوں نے اپنی بندوقیں نیچی کرلیں جن کو اس نے دعائے برکت دی پھر پادری زور سے چیخا:

"یہ ایک صلیبی جہاد ہے۔ مسلمان مردہ باد۔ ان کتوں کو مار مار کر ختم کر دو۔ ان کا وجود مٹا دو۔ سمرنا اور ایدین یونان کا ہے۔"

پادری کی اس پکار نے یونانی سپاہیوں کے دل نفرت سے بھر دیے اور وہ جوش سے دیوانے ہو گئے۔ غریب گورنر کیا کرتا۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ورنہ ترکی گورنر اور اس کے بیرک کے جانباز ترک سپاہی اپنی شمشیرِ آبدار کا جوہر تو دکھلاتے ہی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہوتا۔ دوسری طرف ترک پبلک میں بے پناہ جوش تھا۔ اناطولیہ کا آہنی رگ وپے کا مسلمان اس ذلت کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جب تک کہ اس کی سانس میں سانس باقی رہتی۔ چنانچہ عام باشندے مسجد میں جمع ہوئے اور وہاں پرجوش نعرہ لگایا کہ سمرنا ترکوں کا ہے۔ سب آگ سے کھیلنے کے لیے تیار تھے لیکن یونان کی غلامی کرنے اور اپنا ملک دوسرے کو سپرد کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ سب نے ایک وفد مرتب کیا اور سمرنا کے گورنر کی خدمت میں روانہ کیا اور مقابلہ کی اجازت طلب کی لیکن گورنر کے پاس چارہ کیا تھا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ یہ جواب دیا کہ امیر المومنین کا فرمان ہے کہ مقابلہ نہ کیا جائے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کاش سلطان عبدالوحید غیرت و حمیت سے اتنا بے بہرہ نہ ہوتا تو اناطولیہ میں اتنے بے گناہوں کا خون نہ بہتا۔ اس ظلم و دہشت کی کہانی ادھوری رہ جاتی جو قیامت تک تہذیب انسانی کے استادوں کو تاریخ کے صفحات پر شرمندہ کرتی رہے گی اور وہ داغ لگا ہے جو کسی صابن سے دھویا نہ جا سکے گا۔

ادھر اگر سلطان وحید الدین دولِ متحدہ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے تیار تھا تو اناطولیہ کا مسلمان اپنی مسجدوں کی میناروں کے سائے میں اپنا دم خم دکھانے کے لیے اب بھی آمادہ تھا۔ جابجا انقلابی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ بے ضابطہ فوجیں مرتب ہونے لگیں۔ سلطان وحید الدین کو خطرہ ہوا کہ کہیں دولِ متحدہ کے اراکین ناراض نہ ہو جائیں۔ اور اس نے اناطولیہ کو آگ سے نکال کر برف میں ڈبونے کا فیصلہ کیا۔

مصطفیٰ کمال پر خلیفہ کو ہمیشہ بھروسہ رہا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ جس دن سمرنا میں یونانی درندے اترے اسی دن مصطفیٰ کمال کو اناطولیہ کی افواج کا انسپکٹر جنرل بنا کر سلطان نے اناطولیہ روانہ کر دیا۔ مصطفیٰ کمال معاملات پر غور کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لڑائی گورنمنٹ اور فوج ہارتی ہے اس سے ملک و قوم کو برباد نہیں کیا جاتا ہے۔ جرمنی جو اصل حریف تھا سر کو اونچا کیے شکست سے لاپروا دولِ متحدہ کی شرائط کو پے در پے رد کر رہا تھا اور نوٹ پر نوٹ بھیج رہا تھا جن کا رات کی نیند خراب کر کے دولِ متحدہ کے سربراہ مطالعہ کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اتحادیوں نے اپنی فوجوں کو خبردار کر دیا۔ جرمنی اس گیدڑ بھبکی سے بھی خائف نہیں ہوا اور مسلسل مقابلہ جاری رہا اور یہاں پوری قوم کو تاخت و تاراج کرنے کے منصوبے بن رہے تھے اور کوئی راہ نہ تھی۔ جو لوگ برسرِ اقتدار رہے تھے جنگ میں ترکی کو لانے کے ذمہ دار تھے وہ فرار ہو چکے تھے یا روپوش تھے۔

مصطفیٰ کمال شروع ہی سے جرمنی کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے خلاف تھا۔ اس کی عسکری ذہانت کے دیدۂ بینا یہ دیکھ رہے تھے کہ جرمنی کو آخر میں شکست ہوگی۔ مگر جنگ کا اعلان انور پاشا وزیرِ حرب کا کام تھا۔ اور جب یہ ہو گیا تو مصطفیٰ کمال نے معرکوں میں اپنی فوجی مہارت اور خود اعتمادی کا جو مظاہرہ کیا اس نے ثابت کر دیا کہ اسے صرف میجر رکھنا اربابِ حل و عقد کی کوتاہ اندیشی تھی۔

مصطفیٰ کمال نے کل معاملہ پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ صرف ایک راستہ ہے کہ ترکی کی بچی کھچی فوج کو اناطولیہ میں جمع کیا جائے اور دوبارہ جنگ کی جائے۔ دولِ متحدہ نے جو خاکہ بنایا تھا اور جو معاہدہ سیورے کے پہلے سے نظر آنے لگا تھا اس میں اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح اناطولیہ پہنچے کہ سلطان نے خود ہی اس کو اناطولیہ کے لشکر کا انسپکٹر جنرل مقرر کر دیا۔ مصطفیٰ کمال کے لیے یہ ایک غیبی امداد تھی۔

## مصطفیٰ کمال کا تدبر

مصطفیٰ کمال نے جس تدبر، جانفشانی اولوالعزمی دیدہ وری اور حب الوطنی کا اس دوران اظہار کیا ان سب کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھا۔ اس نے چنگاری کو کوہِ آتش فشاں بنا دیا اور عروقِ مردہ

میں خون زندگی دوڑادیا۔ مصطفیٰ کمال اپنے کل اعزازات و تمغات کے ساتھ سلطان کے نائب کی حیثیت سے روانہ ہوا۔ جب مصطفیٰ کمال جا چکا تو داماد فرید پاشا نے سلطان سے کہا کہ آپ نے مصطفیٰ کمال کو اناطولیہ کی افواج کا انسپکٹر جنرل بنا کر اسے اس بات کا موقع دے دیا ہے کہ وہ اناطولیہ میں بغاوت کی آگ لگا دے۔ سلطان کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا اور فوراً اس نے ہر کارے دوڑا دیے اور حکم بھیجا کہ مصطفیٰ کمال واپس چلا آئے لیکن وہ اس تیزی سے غائب ہوا کہ کہیں پتہ نہ چلا۔

مصطفیٰ کمال نائب السلطان کی حیثیت سے ایک ٹوٹے ہوئے کشتی نما جہاز پر سمسون کے بجائے سمرنا اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ پہنچا۔ وہاں دولِ متحدہ کے فوجی افسران نے اسے اپنا آدمی سمجھا۔ ساحلِ سمندر سے وہ سیدھا تار گھر گیا اور چار دن اسی تار گھر میں پڑا رہا اور مختلف مقامات کے ترکی فوجی افسران کو تار دیتا رہا کہ وہ اپنی افواج کے ساتھ اناطولیہ آ جائیں۔

۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو مصطفیٰ کمال سمسون پہنچا وہاں بھی انگریزوں کا قبضہ تھا وہ وہاں سے بھی نکل گیا۔ چنانچہ وہ اندرون ملک چلا گیا اور وہاں بغاوت پر اکساتا رہا۔ پھر وہ شہر افراعلی پہنچا۔ یہ شہر سمسون کے قریب ہے۔ اور اس جگہ کچھ دنوں رہا۔ یہاں اس کو سمرنا کے وحشیانہ مظالم کی اطلاع ملی اور وہ اور تیزی سے بغاوت کی آگ پھیلانے لگا۔ انگریز کو مصطفیٰ کمال کی کارروائیوں کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے مصطفیٰ کمال کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ مصطفیٰ کمال اماسیہ چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک مشاورتی جلسہ طلب کیا تھا اماسیہ پر انگریزوں کا قبضہ نہیں تھا

## اماسیہ کا جلسہ

اماسیہ میں مصطفیٰ کمال نے کمال رافت بے، علی فواد بے اور رؤف بے کو طلب کیا۔ ان چاروں نے اماسیہ میں بیٹھ کر ان مصیبت خیز لرزہ انگیز اور مایوس حالات میں حسب ذیل امور اتفاق رائے سے طلب کیا۔

1. سمرنا کی مدافعت کے لیے بے ترتیب ٹولیوں کے بجائے منظم فوج ترتیب دے کر تیار کی جائے۔
2. تمام شہروں اور گاؤں میں بغاوت کی روح پھیلائی جائے۔
3. رضاکاروں کو فوجی تعلیم دی جائے۔
4. روپیہ، ہتھیار اور سامان رسد مہیا کیا جائے۔
5. اناطولیہ کی مدافعت تین حصوں میں تقسیم کر دی جائے۔

(الف) مشرقی حصہ کی مدافعت کاظم قرہ بکر کے ذمہ ہو۔

(ب) مغربی حصہ علی فواد کے ذمہ ہو۔

(ج) قلب کا چارج خود مصطفیٰ کمال کے پاس ہو۔

6 پورے ملک کی مدافعت کے لیے ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے جس کا تعلق سلطان کی حکومت سے نہ ہو۔

7 اس مرکزی حکومت کو بنانے کے لیے ملک کے حقیقی نمائندوں سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ جابجا جو چھوٹی چھوٹی انجمنیں یا کمیٹیاں مدافعت کی غرض سے قائم ہوگئی ہیں۔ ان کا انضمام ایک واحد ادارہ میں کیا جائے جس کے قیام کے بعد ہی ہم لوگ اپنے ملک کو بچانے کے لیے بھرپور کوشش کرسکیں گے اور دنیا کو مخاطب کرنے کے حق دار ہوں گے۔

اس اہم اور جاندار فیصلوں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھی کس خمیر کے بنے ہوئے تھے۔ مایوسی تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔ گویا کہ علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھے۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

# ترکی کی فوجی حالت اور یونانیوں کے مظالم

جب یونانی سمرنا میں اترے تو اس وقت سترھویں آرمی کور سمرنا میں نادر پاشا کی سرکردگی میں تھی۔ دو رجمنٹ چھپن دیں ڈویژن کے لفٹیننٹ کرنل حریم بے کی قیادت میں تھیں جن میں سے ایک رجمنٹ 172 ادرے لک میں زیر کمان علی بے تھی۔

سمرنا جانے سے قبل مصطفیٰ کمال نے جب اناطولیہ جاکر مدافعت کی تنظیم کرنے کی خفیہ سازش قسطنطنیہ میں کررہے تھے تو عصمت پاشا اور رؤف بے وغیرہ سب ان کے ساتھ ہوگئے۔ یہ سب اور بہت سے دوسرے لوگ مصطفیٰ کمال کے چلے آنے کے بعد بھاگ بھاگ کر اناطولیہ پہنچے اور اماسیہ کے مشاورتی جلسہ تک کسی قسم کی مدافعت نہیں کی گئی کیونکہ سلطان کے حکم کے خلاف کوئی مدافعت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے یونانیوں کو پورا موقع اپنے وحشیانہ مظالم کے دکھانے کا مل گیا۔ وہ مغرب میں سمرنا پر اترے اور مشرق میں عسکی شہر جانا چاہتے تھے جو ایک اہم ریلوے اسٹیشن تھا۔ البتہ علی بے جس کی فوج محفوظ تھی۔ اس نے یونانیوں کا سختی سے مقابلہ کیا اور زبردست نقصانات پہنچائے۔ اب یہ سب لوگ پورے ملک میں بکھر گئے اور اپنا مشن پورا کرنے لگے۔ جنگ کی تیاریوں کا آغاز ہوا۔ اس دوران یونانی دیہاتوں میں گھس گئے اور انھوں نے وہاں کے باشندوں سے قتل عام کا اور عورتوں کی آبروریزی

کا وسیع پیمانہ پر آغاز کیا۔ وہ ان گاؤں کو جہاں ترک آباد تھے جلا دیتے تھے۔ بے شمار گاؤں انھوں نے پھونک کر خاک سیاہ کر دیئے۔

علی بے نے یونانی فوجوں کے آنے پر اپنی انفرادی ذمہ داری پر ان کا مقابلہ کیا۔ یہ واقعہ 28 مئی 1919ء کا ہے۔ اس سے پہلے یونانیوں سے کوئی مزاحم نہیں ہوا تھا۔ لیکن سوما اک حصار اور سالیہلی کے مقامات پر قومی فوجیں اپنے کو منظم کر رہی تھیں۔ 15 جون 1919ء کو کرنل قاسم بے نے عارضی طور پر اکسٹویں ڈویژن کا بالکیسری کے مقام پر خود چارج لیا۔ بعد ازاں وہ شمالی حصے کے انچارج ہوئے جس میں ادے لیک سوما اور اک حصار شامل تھے۔ بہت سے محبانِ وطن فوج کو آمادہ کر رہے تھے۔ جلال بے نام بدل کر سمرنا سے نکل گیا اور 15 جون 1919ء کی شب میں بہادر علی بے کی فوجوں نے شب خون مارا اور برگمان کے مقام پر یونانیوں کو تہس نہس کر دیا۔ علی بے کی مدد کے لیے بالکیسری اور بندرما سے بھی فوجیں آئی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیوں کو اپنی منتشر افواج کو جمع کرنے کے لیے تاسلی کو خالی کرنا پڑا۔ ایدین میں تیاری ہو رہی تھی اور عوام یونانیوں پر دباؤ ڈال رہے تھے لیکن یہ سب متفرق لڑائیاں تھیں۔ ابھی کوئی منظم پروگرام نہیں بنا تھا۔ آخر جون تک ایدین کا محاذ قائم ہو سکا۔

## مصطفیٰ کمال برخاست

اماسیہ سے مصطفیٰ کمال ارض روم چلا گیا۔ وہاں خلیفۃ المسلمین کا نامہ بر مصطفیٰ کمال کو ملا اور تحریری حکم پیش کیا کہ مصطفیٰ کمال واپس قسطنطنیہ جائیں۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ جب یہ خبر سلطان وحیدالدین کو ملی تو اس نے غصہ اور مایوسی کے عالم میں اپنا ہونٹ اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالا اور کانپتے ہوئے حکم دیا کہ مصطفیٰ کمال کو برخاست کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال نے اپنے کل تمغے اور یونیفارم اتار دیے اور دیہاتوں میں نکل گیا اور وہاں اپنی تقریروں سے بغاوت کی آگ پھیلاتا رہا۔ مصطفیٰ کمال کے سامنے حسب ذیل دقتیں تھیں:

1. پورا اناطولیہ جس کو اسے آمادۂ بغاوت کرنا تھا سب خلیفۃ المسلمین کا مطیع و منقاد تھا۔ اور خلیفۃ المسلمین مصطفیٰ کمال کے سخت مخالف تھے۔
2. پورے اناطولیہ میں آگ بھڑک رہی تھی۔ مرد تو مرد عورتوں نے بھی اپنی فوجیں بنالی تھیں۔ مگر کوئی نقطۂ اتحاد نہ تھا۔ پورے ملک میں مختلف کمیٹیاں اور انجمنیں قائم تھیں۔ اور جب تک ان کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک دستوری و جمہوری شکل نہ دی جائے اس وقت تک کوئی گفتگو کا مجاز کیسے ہو سکتا ہے۔

اور یہ ایک بڑا مشکل کام تھا۔ باہمی رقابتیں بھی کارفرما تھیں اور ایک مرکز پر سب کا جمع ہو جانا آسان نہ تھا۔ اس میں بڑے تدبر اور حکمت عملی کی مہارت کی ضرورت تھی۔

3۔ سرمایہ، سامانِ حرب اور رسد کی فراہمی کا بھی مسئلہ کچھ کم مشکل نہ تھا۔ یونان کو تو کل اتحادی طاقتیں مدد کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مگر آہنی دل و گردہ کا مصطفیٰ کمال ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس پر آج یہ ذمہ داری آن پڑی تھی کہ صرف جنرل ہی نہیں ایک مدبر کے بھی فرائض انجام دے اور کچھ بیس سے ایک جدید حکومت کی تعمیر کرے۔

مصطفیٰ کمال نے دن رات بغیر آرام کیے سادہ یونیفارم میں گاؤں گاؤں کا گشت لگانا اور تقریریں کرنا شروع کیا۔ اس مجاہدے میں اس کے کپڑے بھی تار تار ہو جاتے تھے۔ اس کو فاقہ بھی کرنا پڑتا تھا پیدل بھی چلنا پڑتا تھا۔ مگر کوئی مشکل ایسی نہیں تھی جس کو اس نے مشکل سمجھا ہو۔ اس نے اناطولیہ کے مسلمان باشندوں کے جذبات کے احترام میں اپنے کو خلیفہ کا نائب ظاہر کیا اور یہ کہا کہ خلیفہ کو انگریزوں نے قید کر رکھا ہے میں جو کہتا ہوں وہ خلیفہ کی آواز ہے۔ اس کے سوا اس کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔

جنگ کے اختتام کے بعد احمد امین آفندی ایڈیٹر روزنامہ "وقت" قسطنطنیہ کو بمقام انگورہ انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے:۔

"جب ترکی اور اتحادیوں میں شرائط التوائے جنگ پر دستخط ہوئے تب میں حلب میں تھا میں قسطنطنیہ آیا تو میں نے ہر شخص کو رنجیدہ اور زندگی سے بیزار پایا۔ ترکی کی فوری مصیبت نے ہر طبقہ کے آدمیوں کو مایوس کر دیا تھا۔ رہنما گھبرائے ہوئے تھے۔ قوم میں ایک اخلاقی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ صورتِ حال کا مقابلہ صرف ایک ایسا نظام کر سکتا ہے جس کی مدد پر قوم خود آمادہ ہو۔ بغیر اس کے اناطولیہ کے باشندوں کو ترکی کی تقسیم کے خطرات سے آگاہ کر کے ان کی موثر مدد حاصل کی جائے اور کوئی صورت نہ تھی۔ لہٰذا قوم میں جا کر اور ان سے مل کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کارروائی کا مقصد اناطولیہ ہی ہو سکتا تھا قسطنطنیہ میں کام کرنا ناممکن تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے فوج کا انسپکٹر جنرل بنا کر سمسون بھیجا گیا۔ میں قسطنطنیہ سے اسی روز روانہ ہوا جس دن یونانی سمرنا میں اترے۔

میرا نظامِ عمل یہ تھا کہ قومی مدافعت کی غرض سے ملک میں بہت سی انجمنیں قائم تھیں ان کو متحد کر کے ایک زبردست نظام مرتب کیا جائے اور پھر اس نظام کو مقصد پورا کرنے کے لیے اور قومی آزادی کی مدد اور مدافعت کے لیے فوج کو استعمال کیا جائے۔"

سیواس کے مقام پر اناطولیہ کے گوشہ گوشہ سے نمائندے جمع ہوئے۔ یہ قومی نمائندوں کا ایک حقیقی اجتماع

تھا۔ یہاں ایک انجمن تمام اناطولیہ کی بیک آواز قائم ہوئی اور مصطفیٰ کمال کو اس قومی انجمن کا صدر چنا گیا۔ اب مصطفیٰ کمال کو پوری قومِ اناطولیہ کی طرف سے بات کرنے کا حق مل گیا۔ چنانچہ یہ ایک جدید عوامی حکومت قسطنطنیہ کے مدمقابل بنائی گئی۔

ادھر داماد فرید پاشا نے اگست ۱۹۱۹ء میں خلیفۃ المسلمین سے یہ اعلان کرا دیا کہ مصطفیٰ کمال باغی ہے۔ مدافعت کر کے افتراق نہ پیدا کیا جائے اور سلطانِ وقت کی اطاعت کی جائے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ مصطفیٰ کمال کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ حاضر کیا جائے۔ اس طرح داماد فرید پاشا کو امید تھی کہ اناطولیہ کے مسلمان جو خلیفہ کے وفادار ہیں مصطفیٰ کمال سے الگ ہو جائیں گے۔ دوسرا وار داماد فرید پاشا نے یہ کیا کہ شیوخ کُرد کو مصطفیٰ کمال کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنا چاہا اور اس کے لیے انگریزوں نے شیوخ کو کثیر رقم رشوت دینے کا جال بچھایا۔ مصطفیٰ کمال نے ان دونوں کا بھرپور جواب دیا۔

پہلا کام مصطفیٰ کمال نے یہ کیا کہ سیواس کانفرنس میں ایک تجویزِ احتجاج منظور کرائی۔ یہ کل اناطولیہ کی پہلی آواز تھی اور اس میں قلبی جوش اور عزم بھرا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ مطالبہ بھی تھا کہ داماد فرید پاشا کو برخاست کیا جائے۔

پھر اس نے استنبول کے باشندوں کے نام حسب ذیل پیغام بھیجا:۔

"اے اہلِ استنبول (قسطنطنیہ کا دوسرا نام استنبول ہے) وطنی فرض انجام دینے میں شریک ہو جاؤ تاکہ ہمیں فرید پاشا کی وزارت پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔ اگر ہم چپ رہیں گے تو دنیا کہے گی کہ اس قوم نے اپنی حکومت پر اعتراض کرنے کا حق کیوں نہ بروقت استعمال کیا۔ دنیا کا یہ کہنا بے جا بھی نہ ہوگا۔ ہمارے نبی کا فرمان ہے کہ جیسے تم ہوگے ویسے ہی تم پر حاکم بنائے جائیں گے۔"

استنبول کے اخبارات نے اس پیغام کو شائع کر دیا اور اس سے بم جیسا دھماکا ہوا۔ مسجدوں میں دعائیں ہونے لگیں۔ پرجوش نوجوان چھپ چھپ کر قسطنطنیہ سے نکل کر اناطولیہ مصطفیٰ کمال کے پاس آنے لگے۔ قسطنطنیہ میں انگریزوں کا قتل ہونے لگا۔

مصطفیٰ کمال نے چند روز بعد دوسرا بم گرایا جس کا دھماکا پہلے سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ اس نے انگریزی، فرانسیسی، امریکی، اطالوی، جرمن، سویڈنی، ڈنمارکی اور اسپینی سفیروں کے نام ایک دستاویز بھیجی جس پر سیواس کانفرنس کی مہر ثبت تھی۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ داماد فرید پاشا قوم کا غدار ہے۔ اس کی حکومت کا فیصلہ ناقص ہے۔ فرید پاشا کی حکومت انگریز کی پٹھو ہے۔ یہ مجلس حقیقی مجلس ملی ہے جس میں قوم کے نمائندے ہیں۔ کوئی فیصلہ اس وقت تک قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک کہ قوم کے حقیقی نمائندوں کے

اس پر دستخط نہ ہوں۔

سلطان نے پھر حکم صادر کیا کہ ان کی اطاعت کی جائے اور افتراق نہ پیدا کیا جائے لیکن نفسیاتی طور پر داماد فرید پاشا کے خلاف جو محاذ مصطفیٰ کمال نے پیدا کر دیا تھا اس کا توڑنا آسان نہ تھا۔ انگریزوں نے دیکھا کہ داماد فرید پاشا اس درجہ غیر ہردلعزیز ہو چکا ہے کہ جب تک وہ رہے گا اناطولیہ قابو میں نہ آئے گا۔ لہٰذا فرید پاشا کو معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ علی رضا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ علی رضا نے فوراً مجلس ملی ترکی پارلیمنٹ کو طلب کیا۔ اور اس میں خوشامدیوں نے جمع ہو کر خلیفہ کی خوب خوب مدح سرائی کی اور مصطفیٰ کمال پر پھٹکار برسائی لیکن اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کی تلوار نیام سے نکل چکی تھی اور یہ لفظی لعن طعن اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

اب مصطفیٰ کمال نے انگورہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ انگورہ دو وجہوں سے اس کے لیے موزوں تھا۔ ایک تو یہ انگورہ ساحل سمندر سے دور تھا۔ اور مدافعتی تدابیر وہاں زیادہ سکون سے ہو سکتی تھیں۔ دوسرے انگورہ سے اناطولیہ کے ترکوں کا بڑا جذباتی لگاؤ تھا۔ یہیں سے ترک چلے تھے اور تین براعظموں، سات دریاؤں اور تین سمندروں پر صدیوں تک قابض رہے تھے اور اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کیا تھا۔

## بالشویکوں سے تعلقات

اب سوال اسلحہ کا تھا۔ اسلحہ کے بغیر جنگ کیسے ہو سکتی تھی۔ دولِ متحدہ ترکی کے دشمن تھے۔ جرمنی اور اس کے حلیف شکست کھا چکے تھے اور نیم مردہ تھے اس لیے مصطفیٰ کمال چاروں طرف ہاتھ پیر مار رہا تھا اور اپنی فطری ذہانت سے کام لے کر دولِ عالم کی کمزوریوں اور باہمی رقابتوں کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے روس سے بھی معاملہ کیا۔ اس وقت روس کی حالت یہ تھی کہ بالشویک اکثر حصہ پہ بالشویک پر غالب آ چکے تھے۔ لیکن دکھنی حصہ میں ڈنکن اب بھی بالشویک کے لیڈر کی حیثیت سے لڑ رہا تھا۔ اسٹالن کو روس میں بہت بااختیار بنا دیا گیا تھا۔ اور اصل لیڈر لینن تھا۔ بالشویک اسٹالن اور لینن کی قیادت میں پے در پے ایسی کارروائیاں کر رہے تھے جن سے انگریز بہت خائف ہو گیا تھا۔

بالشویکوں اور انگریز سے کھلی عداوت تھی۔ انگریز قسطنطنیہ پر قابض تھے اور خفیہ طور پر ڈنکن کی مدد کر رہے تھے جو ابھی جنوبی روس میں اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ اسے امداد غیبی سمجھ کر مصطفیٰ کمال بالشویکوں کی طرف رجوع ہوا اور بالشویکوں نے سامان و اسلحہ دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

# ترکانِ اناطولیہ کا جوش

ترکانِ اناطولیہ کا جوش بیان کرنے سے قلم عاجز ہے۔ اپنا سب کچھ لاکر ڈال دیا۔ جوان سب فوج میں بھرتی ہو گئے۔ عورتیں اور بوڑھے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ جس طرح ایک ڈاکٹر خطرناک مرض سے آخر وقت میں موت سے بچانے کے لیے لڑتا ہے اسی طرح ترکی کو موت سے بچانے کے لیے اناطولیہ کا مسلمان اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار تھا اور مصطفیٰ کمال ایک باکمال ڈاکٹر تھا۔

اس جوش وخروش کا غلغلہ تمام دنیا میں گونجا اور اس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا جس پر یونانیوں کی وحشت و بربریت کی داستانوں نے جو انصاف پسند یورپینوں کی زبانی بھی اخبارات میں آئیں آگ پر پٹرول کا کام کیا۔ یونانیوں کے مظالم اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ آستانہ عالیہ کی طرف سے بھی اس پر لفظی احتجاج کیا گیا اور ترک جہاں بھی تھے سر ہتھیلی پر رکھ کر اور بھاگ بھاگ کر اناطولیہ پہنچنے لگے۔ بہت سے فوجی افسروں نے استعفیٰ دے دیا اور قسطنطنیہ سے اناطولیہ چلے گئے اور مصطفیٰ کمال کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ سب نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حیات وموت کی لڑائی ہے۔

اب اپنی جماعت کی نمائندگی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے مصطفیٰ کمال نے خلیفۃ المسلمین کو چیلنج کیا۔ سلطان اپنے کو بے کس محسوس کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ آخرکار اس نے آقایانِ فرنگ سے فریاد کی مگر دولِ متحدہ کے اراکین میں حصے بخرے لگانے پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ عوامی تحریک کے خلاف کوئی موثر قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ رائٹر کی خبروں سے پتہ چلتا تھا کہ ترکی کا جو حشر ہونے والا ہے اس کے عمل درآمد کے لیے بری اور بحری افواج کے افسر مصطفیٰ کمال پاشا کی اناطولیہ تحریک کی وجہ سے دقت محسوس کرتے تھے کافی فوج اور سامان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اس دوران عسکی شہر سے انگریزوں کو اور جنوبی اناطولیہ میں فرانس کو مارش اور عرفا سے نکال باہر کیا۔

اس طرح ۱۹۱۹ء اور شروع ۱۹۲۰ء کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس تمام زمانہ میں اناطولیہ کی خبروں اور یونانیوں کے وحشیانہ مظالم کی داستانوں سے دنیائے اسلام کا ضمیر بیدار ہو گیا اور ہر چہار جانب سے دولِ متحدہ پر لعن طعن شروع ہو گئی۔ مصر، افغانستان اور افریقہ کے علاوہ خود عرب سے بھی انقلابی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہندوستان آتش کدہ بنا ہوا تھا اور گاندھی جی کی قیادت میں منزل آزادی کی جانب بڑے جوش سے چلا جا رہا تھا۔

ادھر انگریزی کی پروپیگنڈہ مشنری بھی تیز ہو گئی تھی۔ انگریزوں نے یہ خبر مشہور کر دی کہ مصطفیٰ کمال خلافت

کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر اناطولیہ والوں کے لیے بڑی خطرناک تھی۔ جون ۱۹۲۰ء میں ٹائمز آف لندن جیسے وقیع انگریزی روزنامہ نے یہ خبر شائع کی کہ مصطفیٰ کمال نے جمال الدین پاشا خلف شہزادہ شوکت آفندی مرحوم کو جو حال ہی میں اناطولیہ گئے ہیں اور وہاں کے تیسرے جیش کے اعلیٰ افسر ہوئے ہیں سلطان المعظم کی جگہ دی ہے اور خود مصطفیٰ کمال وزیر اعظم ہوئے ہیں۔ احمد سینیم کو سابق وزیر خارجہ وزیر جنگ فریبے سابق عامل کو وزیر امور داخلہ اور شیخ سنوسی کو شیخ الاسلام بنایا گیا ہے۔

ٹائمز نے یہ بھی لکھا تھا کہ بالشویکوں کی سرگرمیاں بہت ترقی کر گئی ہیں اور مصطفیٰ کمال بالشویک ہو گیا ہے مذہب اسلام ترک کر دیا ہے۔ یہ بھی تحریر کیا کہ عباس حلمی پاشا شیخ عبد العزیز فرید پاشا سرگروہ قوم پرستاں باہم متحد ہوئے ہیں اور بالشویکوں کی مدد سے مغربی ایشیا اور مصر میں پریشانیاں پیدا کر رکھی ہیں۔

ان سب گروہ کا ایک جواب کافی تھا کہ اناطولیہ کی مسجدوں میں سلطان وحید الدین کے نام کا خطبہ برابر پڑھا جاتا تھا۔

خلیفۃ المسلمین نے اس وقت شیخ الاسلام کو گرفتار کرا کے مالٹا روانہ کرا دیا تھا کیونکہ وہ غلط فتویٰ دینے کے لیے تیار نہ تھے اور زید العبد عبداللہ کو شیخ الاسلام اور مفتی اعظم قرار دیا تھا۔ مفتی اعظم نے اپریل ۱۹۲۰ء کو حسب ذیل فتویٰ داماد فرید پاشا کی جدید وزارت میں صادر فرمایا۔

"شریعت کی رو سے یہ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے متحد ہو کر ہز مجسٹی کی رعایا کو دھوکا دینا چاہا ان کی بیخ کنی کر دی جائے کیوں کہ ان دونوں نے بھرتی کرنی شروع کر دی ہے اور ان کی فوج تیار کرنے اور ان کی خوراک کا سامان کرنے کے بہانے سے ان پر ٹیکس لگائے ہیں۔ سلطنت کے بعض مقامات پر حملے کیے ہیں اور وفادار رعایا کو قتل کیا ہے۔ جنرل ایچ وائی (؟) آف خلافت کے ساتھ سلسلۂ رسل و رسائل قطع کر ڈالے ہیں اور سلطنت کے دوسرے حصوں سے بھی سلسلۂ رسل و رسائل کو قطع کر دیا ہے جنھوں نے مذہبی حکام کو بلا وجہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا ہے اور ان کی جگہ پر اپنے ہوا خواہوں کو مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ کے انتظامی حکم کو روک دیا ہے اور دار الحکومت کو بقیہ ملک سے علیحدہ کر کے اقتدار خلافت کے دامن پر دھبہ لگایا ہے۔ جھوٹی جھوٹی باتیں مشہور کر کے جھگڑے پھیلا دیے ہیں حالانکہ ان لوگوں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ منتشر ہو جائیں مگر اس پر بھی یہ لوگ اپنی جد و جہد سے باز نہیں آئے۔ سلطنت عثمانیہ میں جتنے مسلمان ہیں وہ خلیفہ وحید الدین خاں کے گرد کیوں نہ جمع ہوں۔ اگر خلیفہ کے سپاہیوں نے بیوفائی اور علیحدگی اختیار کی تو وہ فقط اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا میں بھی سزا کے مستحق ہوں گے۔ خلیفہ کے وہ سپاہی

جو باغیوں کو قتل کریں گے کیا وہ غازی نہ کہلائیں گے اور جو سپاہی قتل ہو جائیں گے کیا وہ شہید نہ کہلائیں گے۔ جن لوگوں سے بادشاہ لڑنے کا حکم دے اور وہ اس کے حکم کو نہ مانیں کیا وہ بموجب شریعت سزا کے مستحق نہ ہوں گے؟ ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ اس فتویٰ پر زید العبد عبداللہ کے دستخط ہیں۔"

13 مئی 1920ء کو داماد فرید پاشا کے سوال پر شیخ الاسلام نے دوسرا فتویٰ بالفاظِ ذیل شائع کیا۔

## اختصار فتویٰ شیخ الاسلام با جلاس مجلس جدید مشیرانِ سلطنت داماد فیروز پاشا

"کیا شریعت کے مطابق یہ جائز ہے اور ممکن ہے کہ ان اشخاص کو نیست و نابود کر دیا جائے جنھوں نے رعایائے ملک معظم کو دھوکہ دینے کے لیے باہمی اتفاق سے ایک غول بنا لیا ہے جنھوں نے بد ذاتی شروع کر دی ہے جن کو کھانا کھلانے اور مسلح کرنے کے بہانے سے لوگوں سے محصولات وصول کیے ہیں۔ جنھوں نے سلطنت کے مختلف حصّوں پر حملہ آور ہو کر عوام کو زیر ظلم کیا ہے، جنھوں نے خیر خواہ رعایا کو ہلاک کیا، جنھوں نے خلیفہ کے جنرل اسٹاف ہیڈ کوارٹر اور سلطنت کے دیگر حصص کے مابین آمد و رفت کے ذرائع منقطع کر دیے ہیں، جنھوں نے بلا وجہ معقول، خدا پرست حکّام کو علیحدہ کر کے آخر الذکر کے بجائے اپنے پیروؤں کو مقرر کر دیا جو عاملان سلطنت کے احکام کی بجا آوری میں سدِّ راہ ہو رہے ہیں، جنھوں نے دار الخلافت کو ملک کے دوسرے حصّوں سے جدا کر کے خلیفہ کی شہرت پر دھبہ لگایا ہے، جنھوں نے جھوٹی جھوٹی باتیں مشتہر کر کے تنازعات پیدا کر دیے ہیں۔ اور جو باوجود اس کے کہ ان کے لیے منتشر ہونے کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں اپنی کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔ کیا تمام مسلمانانِ سلطنت کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس موقع پر خلیفہ وحید الدین کی مدد کریں۔"

اگر خلیفہ کے سپاہی ان کو چھوڑ کر جائیں گے تو کیا وہ نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی سزا کے مستوجب نہ ہوں گے۔ کیا خلیفہ کے وہ سپاہی جو ایسے باغیوں کو مار ڈالیں گے "غازی" اور وہ لوگ جو مر جائیں گے وہ "شہید" نہ ہوں گے۔ کیا وہ لوگ جو اپنے بادشاہ کے لڑنے کے حکم کی انجام دہی میں مانع ہوں گے اس سزا کے سزاوار نہ ہوں گے جو ایسے لوگوں کے واسطے شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ ان تمام سوالات کا جواب اثبات میں ہے۔"

ان فتووں کو غور سے پڑھیے۔ اس سے مصطفیٰ کمال کی طاقت اور قسطنطنیہ کا اضطراب اور خلیفہ اور ان کے حامیوں

کی وطن دشمنی عیاں ہے۔

مصطفیٰ کمال کا تعلق بالشویک حکومت سے ہوگیا تھا۔ اس کو اکھاڑنے کے لیے شیخ الاسلام نے ایک تیسرا فتویٰ صادر کیا جو حسب ذیل ہے:۔

## فتویٰ حجتہ الاسلام جناب شیخ الاسلام قسطنطنیہ

"وہ لوگ جن کے دستِ قدرت میں اقوامِ عالم کی قسمت ہے مسئلہ بالشوازم پر غور کر رہے ہیں ایسی صورت میں اسلام کا جو بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے خیالات کا آئینہ ہے یہ فرض ہے کہ اپنے نقطہ نظر کا مسلمانوں بلکہ ساری دنیا پر اظہار اور اعلان کر دیں۔ بالشوازم کے اصلی اور اساسی اصول خواہ کچھ بھی ہوں .... مگر حقیقت الامر یہ ہے کہ فعلاً وعملاً بنی نوع انسان معاشرت اور تمدن کے حق میں اور بندگان خدا کے ذاتی حقوق وملکیت کے لیے مضر ہے۔ اور اس لیے ناممکن ہے کہ بالشوازم کے اصول اور اسلام کے اصول کو مطابق اور موافق مانا جا سکے۔ ابتدائے ظہورِ اسلام سے آج تک جان اور مال پر حملہ، چوری، قتل اور نہب اور زنا بالجبر ان افعال قبیحہ کی اسلام نے ہمیشہ مذمت اور نفرین کی ہے اور ہماری کتب مقدسہ نے نہ صرف ان جرائم قبیحہ کی مذمت کی ہے بلکہ ان کے لیے حدود شرعی یعنی سزا اور تعزیر کے احکام مقرر کیے ہیں۔ مقتضاء اسلام ترقی عام امن وامان اور فلاح نوع انسان ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام قتل اور غصب کی ممانعت کرتا ہے اور نہایت تاکید کے ساتھ افراد اور اقوام کے حقوقِ ملکیت کی تامین کرتا ہے۔ چنانچہ شریعت کا حکم ہے کہ ہر شخص کو اپنی ملکیت پر پورا پورا تصرف کا حق ہے۔ اور حین حیاتی ہبہ کر سکتا ہے یا مرنے کے بعد وصیت کر سکتا ہے۔ اسلام اسراف کو جائز نہیں سمجھتا اور مُسرف کو اپنی دولت لٹانے سے باز رکھنے کے لیے تاکہ غریبوں کی حق تلفی نہ ہو یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی دولت کا کچھ حصہ اقربا اور کچھ حصہ فقراء پر تقسیم ہو۔ مفاد اسلام اس کا متقاضی ہے کہ اس کی تمام قوت و نفوذ بالشوازم کے خلاف صرف کیا جائے جو تہذیب، انصاف اور حقوق العباد کے لیے ایک خطرہ ہے۔"

مصطفیٰ کمال کی پوزیشن اناطولیہ میں اچانک کمزور کر دی اور اناطولیہ کے عوام تذبذب کے شکار ہونے لگے مگر قدرت اس مردِ آہن کی مدد کرنے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ 20 مئی 1920ء کو آخری صلحنامہ ترکی

کے بارے میں شائع ہوگیا جس پر سجانب خلیفۃ المسلمین لوبیق بے نے اسی دن دستخط کر دیے۔ یہ ایک ہولناک واقعہ تھا۔ مصطفیٰ کمال نے فوراً اپنا وار کیا۔ اس نے انگورہ کی قومی اسمبلی میں ایک گرجدار تقریر کے دوران داماد فرید پاشا کو ان تمام مصائب کا ذمہ دار قرار دیا اور یہ تجویز پاس کرا دی کہ داماد فرید پاشا غدار ہے اب کل اناطولیہ میں یہی نعرہ گونج گیا کہ "داماد فرید پاشا غدار ہے" اور قوم کا رخ پلٹ گیا۔ لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ ایسے ذلیل صلح نامہ پر خلیفہ تو دستخط نہیں کر سکتا۔ یہ سب داماد فرید پاشا کی شرارت اور وطن فروشی ہے۔ اور مصطفیٰ کمال بالاتفاق ترکوں کا لیڈر قرار پاگیا۔ معاہدہ سیورے کی اشاعت اور اس پر قسطنطنیہ کا دستخط کر دینا ایک عظیم الشان ناقوس ثابت ہوا۔ معاہدہ سیورے کی شرائط ایسی سخت تھیں کہ انھیں دیکھ کر سلطان وحید الدین خاں کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا لیکن سلطان نے صرف اپنی غرض مد نظر رکھی۔ وہ سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ ایک طرف اس کا ضمیر تھا جو اسے اس معاہدے کے پرزے پرزے کر دینے پر اکسا رہا تھا۔ دوسری جانب اس کے سامنے یہ چمکدار خیال تھا کہ وہ خلیفۃ المسلمین کے خطاب کے ساتھ ایک معقول پنشن اور زر کثیر کے ساتھ راحت و آرام کی زندگی گزار سکے گا۔ آخر کار نفس ضمیر پر غالب آگیا اور وحید الدین نے ترکی کے محضر قتل پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

اب اناطولیہ کے ترکوں پر صاف واضح ہوگیا کہ دولِ متحدہ کے ارادے ترکی کے بارے میں کیا ہیں اور خلیفہ کی کیا پوزیشن ہے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان کی مدد صرف ان کا اتحاد اور ان کی تلواریں کر سکتی ہیں۔ اناطولیہ اپنی بقا کے لیے خاک و خون میں ملنے پر تیار ہوگیا اور مصطفیٰ کمال ان کی امیدوں کا آخری آماجگاہ تھا۔

## یونان کا حملہ

20 مئی 1920ء کو معاہدہ سیورے پر دستخط ہوئے تھے اور جون 1920ء میں بولون کانفرنس میں اتحادیوں نے یہ تجویز منظور کی کہ ترکانِ احرار اناطولیہ کی تحریک کو دبانے کے لیے یونان کو مجاز کیا جائے چنانچہ 24 جون 1920ء کو یونانیوں نے اناطولیہ پر حملہ کر دیا۔ ترکانِ احرار نے ان کا مقابلہ کیا لیکن یونانی کامیاب ہوتے گئے۔ ہندوستان میں رائٹر اور ٹائمز کے حوالے سے ترکانِ احرار کی شکست کی خبریں شائع ہوتی رہیں اور مسلمانوں کے غم اور غصہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت ہوگئی۔ دعائیں ہونے لگیں۔ نمازِ مغرب میں دعائے قنوت پڑھی جانے لگی اور حکومتِ برطانیہ کو ان تمام حرکتوں کا ذمہ قرار دے کر تحریکِ ترکِ موالات میں تیزی کر دی گئی۔ افغانستان، مصر، افریقہ اور تمام دنیا کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند تر شروع کی لیکن اصل بات یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال یونانی جیش سے کہیں بھی فیصلہ کن جنگ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی لائن لمبی ہو جائے اور وہ اپنے وطن سے دور آجائیں تب ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

وہ صرف یونانی فوجوں کو مشغول رکھتا تھا اور باضابطہ پسپائی اختیار کرلیتا تھا۔

اس درمیان میں اٹلی اور فرانس کا رویّہ بدل گیا۔ معاہدہ سیورے میں وہ ترمیم چاہتے تھے۔ یہ مصطفیٰ کمال کے پروپگینڈہ مشنری کی کامیابی تھی۔ وہ تمام ممالک سے تعلق قائم کیے ہوئے تھا۔ 28 نومبر کو لندن میں وزیر اعظم فرانس اور وزیر خارجہ اٹلی اور مسٹر لائڈ جارج نے مشرق کی نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی اور یہ طے کرنا چاہا کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کی جائے۔ لیکن یونان کی ضد کی وجہ سے یہ کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔ اس درمیان میں قسطنطین یونان کا بادشاہ ہوگیا تھا۔ اور اتحادیوں کی مرضی کے خلاف ایتھنز پہنچ گیا۔ اس نے فوراً پھر جنگ چھیڑنے کا ارادہ کیا۔ اس درمیانی وقفہ میں یونانی فوجیں جہاں قبضہ کرچکی تھیں قبضہ کیے پڑی رہیں اور مصطفیٰ کمال اپنی تیاریوں میں مشغول رہا۔ قسطنطین نے اوائل جنوری 1921ء میں اپنا زبردست حملہ شروع کیا۔ مصطفیٰ کمال نے اب مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور انونو کے مقام پر تین دن اور تین رات جنگ ہوتی رہی اور آخر میں تلواروں اور سنگینوں کی بھی نوبت آئی۔ انجام کار یونانیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اس پہلی فتح پر اناطولیہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور دولِ متحدہ کو اضطراب لاحق ہوگیا۔ اسی جنگ کی کارکردگی کے صلہ میں عصمت پاشا انونو کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہی اس جنگ کا ہیرو تھا۔

22 جنوری 1921ء کو پیرس کانفرنس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ معاہدہ سیورے میں ترمیم کی جائے اور دوسرا بڑا معاملہ یہ ہوا کہ پیرس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ لندن میں دوسری کانفرنس کی جائے جس میں حکومتِ انگورہ کے بھی نمائندے طلب کیے جائیں۔ یہ ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔ 21 فروری 1921ء کو لندن کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں معاہدہ سیورے میں کافی ترمیم کر دی گئی۔ لیکن یہ ترمیمات ناکافی اور ترکانِ احرار کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ جواب دیں یونان نے ان تجاویز کو مسترد کردیا۔

## یونان کا دوسرا حملہ

یونان نے بڑی تیاری سے دوسرا حملہ شروع کر دیا۔ یہ حملہ بغداد ریلوے پر قبضہ کرنے کے ارادے سے کیا گیا تھا۔ ترک پیچھے ہٹتے گئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یونانی ترکوں کے مورچے کے قریب آجائیں۔ چنانچہ جب ایسا ہوا تو انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یونانیوں کو زبردست شکست ہوئی۔ یہ معرکہ 27 مارچ 1921ء سے 31 مارچ 1921ء تک جاری رہا۔ شب و روز لڑائی ہوتی رہی۔ ایک یورپین اخبار نے لکھا کہ یونانی پسپائی کے وقت اتنا تیز دوڑے کہ ترک ان کے تعاقب سے عاجز آگئے۔ اس جنگ کے حالات فوزی پاشا نے ایک تقریر میں واضح کیے اور ہر چہار جانب سے مبارک باد اور مسرت کی صدائیں بلند ہوئیں۔

# یونان کا تیسرا حملہ

8 جون 1921ء کو یونانی زبردست جمعیت اور تیاری کے ساتھ تیسرے حملے کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے ابتدا میں یونانیوں کو کامیابی ہوتے دی لیکن 23 اگست 1921ء کو مصطفیٰ کمال نے اپنی فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی پوری طاقت سے وار کیا۔ یہ لڑائی تیرہ دن بڑی خونریزی سے جاری رہی اور آخر کار ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر بالکل پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد ہی مصطفیٰ کمال نے مجلسِ ملّی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حضرت باری تعالیٰ نے مجلسِ ملّی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے سامنے یونانی افواج کو بری طرح شکست نصیب ہوئی اور جب تک ہمارے مطالبات پورے طور پر حاصل نہ ہو جائیں اور دنیا ہمارے تمام حقوق کا اعتراف نہ کر لے ہمارے ہاتھ اسلحہ سے علیحدہ نہ ہوں گے"

مصطفیٰ کمال نے اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی اور چھ ماہ تک خاموش رہا۔ اس درمیان میں دریائے سقاریہ کے اس پار یونانی فوجیں قابض تھیں اور دوسری طرف ترکانِ احرار کی فوجیں پڑی تھیں۔ مصطفیٰ کمال نے تمام ممالک میں اپنے وفود روانہ کیے۔ مصطفیٰ کمال نے مجلسِ ملّی کی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ۔

"ہم جنگ کے شیدائی نہیں ہیں۔ ہم صلح و امن کے خواہشمند ہیں۔ ہم نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے تمام پر امن ذرائع و وسائل اختیار کیے لیکن دنیا ہر طرح بے معنی دھمکیوں کے ساتھ ہماری نیک نیتی کا مقابلہ کرتی رہی اور ہمارے ساتھ غیر مہذب قبائل کا سا سلوک کرتی رہی اس لیے تمام دنیا کو آگاہ رہنا چاہیے کہ ترکی کے باشندے اس کی حکومت اور مجلسِ ملّی عظمیٰ اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتے اور جب تک تمام مہذب اقوام کی طرح ان کی حریت اور آزادی کا احترام نہ کیا جائے اس وقت تک وہ اپنا اسلحہ اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارا قطعی فیصلہ ہے دنیا اس سے واقف ہو جائے۔ ہم روس کے دوست ہیں صرف اس لیے کہ اس نے ہمارے حقوق کا اعتراف و احترام کیا (روس نے سب سے پہلے انگورہ کی حکومت کو تسلیم کیا تھا) اور ہم ہمیشہ اس کے دوست رہیں گے کیونکہ ہمیں آج بھی اس پر اعتماد ہے۔ اور آئندہ بھی رہے گا۔ اور جب اتحادی حکومتوں نے بھی ہماری قومی آزادی کا اعتراف کر لیا تو ہم ان کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے اور مصافحہ کرنے کے لیے تیار ہیں"

یہ آواز تمام دنیا کے دارالسلطنتوں میں گونجی اور سارے عالم کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ خاک سے اٹھا کر مصطفیٰ

کمال نے ایک قوم کو زندگی بخش دی تھی اور ایک پارلیمنٹ اور ایک حکومت کی تعمیر کر دی تھی جس کی عمر اگرچہ ابھی دو ایک سال تھی مگر وہ پختہ کار معلوم ہوتی تھی۔

ترکی کے وفود جہاں جہاں گئے اپنے ملک کا مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ ترک اپنے مطالبات سے کسی امر سے دستبردار نہیں ہوں گے اور میثاق ملی سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹیں گے حتیٰ کہ اناطولیہ کا آخری جانباز سپاہی لڑتا لڑتا شہید ہو جائے۔

یہ وفد جب لندن پہنچا اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے ملاقات کی تو لائیڈ جارج کے دریافت کرنے پر اپنا کل مطالبہ اناطولیہ معہ سمرنا و تھریس قسطنطنیہ ایڈریانوپل بتلایا۔ لائیڈ جارج نے پوچھا دلیل کیا ہے؟ وفد نے کہا کہ دلیل کچھ نہیں۔ ہماری قوم اس سے کم پر راضی نہیں ہے۔ لائیڈ جارج نے کہا کہ ابھی ہندوستان کا وفد آیا تھا اس نے بہت سی دلیلیں دی تھیں آپ کوئی دلیل نہیں دیتے اور مطالبہ کر رہے ہیں۔ وفد نے کہا کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہماری قوم اس سے کم پر راضی نہیں ہے۔ لائیڈ جارج یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ میری ٹینس کا وقت ہے اور بلاوجہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔ وفد نے وہاں سے نکل کر ایک لفظ مصطفیٰ کمال کو کوڈ ورڈ میں تار دیا ATTACK "حملہ کرو"۔ اس کا مقابلہ محمد علی کے وفد سے کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک غلام کی عرضداشت اور ایک جانباز مردِ مجاہد کی للکار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

# ترکی وفد کے نتائج

مصطفیٰ کمال جس طرح میدان جنگ میں کامیاب ہو رہا تھا تدبّر اور تدبیر میں بھی اپنا سکہ بٹھا رہا تھا اس نے اس سے پہلے ہی ہموار کر لیا تھا اور اب اکتوبر 1921ء میں ترکوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس سے ترکی اور فرانس کے درمیان حالتِ حرب کا خاتمہ ہو گیا۔ کیلیکیہ ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔

اٹلی سے بھی ایک معاہدہ ہوا جس میں اٹلی نے عہد کیا کہ وہ ایطالیہ سمرنا و تھریس کی واپسی میں مساعدت کرے گا۔ اس طرح برطانیہ کے سوا اب کوئی بھی یونانیوں کا طرفدار باقی نہ رہا لیکن برطانیہ کی طرفداری معمولی بات نہ تھی۔ اس وقت برطانیہ دنیا کے تمام ممالک کا لیڈر تھا۔

مصطفیٰ کمال نے روس سے تعلقات قائم کر کے لینن سے برقی پیغامات کا تبادلہ کر کے اور روسی وفد کو انگورہ بلا کر اور ایک مستحکم عہد نامہ کر کے وسط ایشیا کی تمام جمہوریتوں سے تعلقات قائم کر لیے۔ اسی طرح پولینڈ سے معاہدہ کیا۔ قفقاز سے بھی دوستانہ معاہدہ ہوا۔ قفقاز 65 بڑے شہروں پر مشتمل ایک ملک ہے جس میں مسلمان 67 لاکھ روسی 40 لاکھ گرجی 20 لاکھ ارمنی 10 لاکھ یہودی وغیرہ 5 لاکھ

ہیں۔ قفقاز میں اس وقت پانچ جمہوری حکومتیں تھیں (۱) جمہوریہ جبلی (2) جمہوریہ آذر بائیجان (3) جمہوریہ داغستان (اسلامی) (۴) جمہوریہ گرجستان اور (۵) جمہوریہ ارمنستان۔ جمہوریہ جبلی کا پایہ تخت ارمادیہ۔ آذر بائیجان کا بارکو۔ داغستان کا تیمرخاں شورا گرجستان کا طفلس اور ارمنستان کا ابروان تھا۔ جمہوریہ جبلی کے علاوہ بقیہ تمام حکومتوں کی آزادی روس تسلیم کر چکا تھا۔ قفقازیوں کا ایک بااثر وفد جس میں کریمیا باشکرش تاتار اور کرغیز کے وسط ایشیائی نمائندے بھی شامل تھے انگورہ آیا اور عہد دوستی کیا گیا۔ اسی طرح بخارا اور نیوا ایران یوکرین وغیرہ سے تعلقات استوار کیے اور سب نے حکومت انگورہ کو تسلیم کر لیا۔ اور یہ سب اس کی دوستی اور امداد کا نتیجہ تھا۔

مصطفیٰ کمال کے روشن کارنامہ کا اثر نمایاں ہو رہا تھا ایک تو اس نے پوری قوم کو متحد کر کے ایک آزاد جمہوری حکومت بنائی تھی۔ دوسرے یونان کو میدانِ جنگ میں شکست دیا تھا۔ انگریز پر دوسرے اراکین دولِ متحدہ کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور وہ اسے کلیتاً نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے کانفرنسیں منعقد ہو رہی تھیں۔ پیرس کانفرنس 22 مارچ 1922ء کو منعقد ہوئی جس میں انگورہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس 28 مارچ کو ختم ہوئی اور اس میں معاہدہ سیورے کی کچھ ترمیم کی گئی مگر اس کانفرنس کا کوئی انجام نہیں ہوا کیونکہ یونان اناطولیہ خالی کرنے پر راضی نہ ہو سکا جو ترکوں کی ابتدائی شرط تھی۔ اس کے بعد ستمبر 1922ء میں دوسری کانفرنس اٹلی کی تجویز پر بندوقہ میں ہونے والی تھی کہ ترکانِ احرار کی خارا شگاف تلواروں نے کل مسئلہ حل کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ یونان نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھا۔ اس نے اعلان کیا کہ عنقریب شاہ یونان کی تاجپوشی ایا صوفیہ کے گرجا میں بازنطینی شاہ کی حیثیت سے ہوگی اور قوم سے کہا جا رہا تھا کہ سلسلۂ شاہنشاہان بازنطینیہ کا بارھواں تاجدار عنقریب قسطنطین اعظم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں داخل ہونے والا ہے۔ ادھر یہ زبانی لن ترانیاں جاری تھیں اُدھر مصطفیٰ کمال کے لیے آخری ضرب لگانے کا وقت آگیا تھا۔ اس کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ برطانیہ کے پاس کثرت سے ایسے آدمی ہیں جو ان لوگوں کے دوست بن جاتے ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے کچھ دوست دل میں یہ ارادہ لے کر اندازہ کریں کہ مصطفیٰ کمال کی طاقت کتنی ہے۔ انگورہ گئے اور دوستی کے پیرایہ میں سب کچھ دیکھا اور آکر رپورٹ کر دیا کہ مصطفیٰ کمال کی طاقت بہت ہی نحیف ہے اور اس میں یونانیوں کو نکال باہر کرنے کا دم نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا جیسا کہ بعد کو اخباروں اور بیانات میں کھلم کھلا تسلیم کیا گیا کہ مصطفیٰ کمال نے اپنی فوجوں کو پہاڑوں کے ایسے دامنوں میں چھپا رکھا تھا جہاں یہ محبانِ ترکی لے سے ہوائی جہاز سے بھی نہ دیکھ سکے۔

21 اگست 1922ء کو مصطفیٰ کمال نے اپنا بھرپور حملہ شروع کیا اور چشم زدن میں افیون قرہ حصار کے میدان میں سرلسٹے کوئی اور طاقچہ پر قبضہ کر لیا۔ 23 اگست 1922ء کو اسد کے میدان میں بیلہ چک لیا۔ اور 26 اگست کو افیون قرہ حصار پر حملہ بول دیا۔ اس کی کمان خود مصطفیٰ کمال کر رہا تھا۔ یہاں کا قلعہ ناقابلِ تسخیر مانا جاتا تھا مگر ترکی کی توپوں نے اس کے پرخچے اڑا دیے اور 27 اگست 1922ء کو بعد ظہر کمالی فوجیں افیون قرہ حصار میں داخل ہو گئیں اور یونانی فوجیں سب مال و اسباب و سامان رسد و اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ دوسری فوجیں جو دیار بکر اور عسکی شہر فتح کر کے آئی تھیں وہاں جمع ہو گئیں۔ دیار بکر، عسکی شہر اور افیون قرہ حصار اس طرح واقع ہیں کہ ایک دوسرے کے درمیان 40، 40 یا 45، 45 میل کا فاصلہ ہے۔ مصطفیٰ کمال نے تینوں پر یکبارگی حملہ کیا تھا اور فوجیں تینوں کو توڑ کر نکل گئی تھیں اور ایک مقام پر جمع ہوئیں۔ مصطفیٰ کمال گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اسی گھوڑے پر سجدہ کیا اور افواج کے سامنے حسب ذیل تقریر کی۔

"سپاہیو! تم نے وطن کی مدافعت اور آزادی کا ایک زریں کارنامہ انجام دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ لیکن سپاہیو ابھی کام باقی ہے۔ جب میرا گھوڑا ساحل سمندر کے کنارے کھڑا ہو۔ ایک طرف سمندر ہو اور دوسری طرف ہمارا ملک۔ یونانی یا تو سمندر میں غرق کر دیے گئے ہوں یا قتل کر دیے گئے ہوں اور ایک بھی یونانی سرزمین اناطولیہ پر نہ ہو تب تمہارا کام پورا ہوگا۔"

اس جنگ میں تقریباً بیس ہزار یونانی قتل اور اکسٹھ ہزار اسیر ہوئے۔ سات سو میدانی توپیں، دو ہزار مشین گنیں گیارہ طیارے اور 950 موٹریں 36 کھاری مالِ غنیمت ملا۔ مصطفیٰ کمال کی ایک تقریر میں ہے کہ دشمن کا خسارہ ایک لاکھ آدمیوں سے زیادہ ہے۔ اور ترکوں کا دس ہزار سے تجاوز نہیں ہوا۔ اور ان میں بھی تین چوتھائی مجروحین ہیں۔

اسی زمانہ کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک جگہ 44 یونانی جرنل بیٹھ کر مشورہ کر رہے تھے کہ مصطفیٰ کمال نے گھیر کر سب کو گرفتار کر لیا اور اخبارات نے یونان کا خوب مذاق اڑایا۔

اس کے بعد مصطفیٰ کمال 28 اگست کو التون طاش اور دومیلو کار پر حملہ آور ہوا 30 اگست سے یکم ستمبر کے درمیان عشاق، دومیلو کار اور التون طاش کی مثلث اور عشاق کدوس اور کوتاہیہ کے مثلث پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد عام ہلّہ بول دیا اور 9 ستمبر کو ترک سواروں کا ایک دستہ کپتان فوزی بک کے زیر قیادت سمرنا میں داخل ہوا اور لفٹننٹ نورالدین پاشا سمرنا کے گورنر مقرر ہوئے۔ 14 ستمبر کو مصطفیٰ کمال خود ایک

پرجلال جمعیت اور اپنے جیش کی معیت میں بصد شان وشوکت وشادمانی ومسرت سمرنا آئے۔ معرکۂ عشاق میں یونانی جنرل ترکیو میں ترکوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا اور ۷ ستمبر کو دوسرے مقامات فتح کرتے ہوئے ترکی فوجیں بحرابیض پہنچ گئیں۔ اب مصطفیٰ کمال کا خواب پورا ہوا۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف ان کا ملک تھا اور یونانی جنوبی اناطولیہ سے غائب ہو چکے تھے۔

جہاں جہاں ترکانِ احرار اپنی فوجِ ظفر موج کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے خواہ وہ افیون قرہ حصار ہو یا عسکی شہر یا سمرنا یا کوئی اور، ہر جگہ کے باشندوں نے اپنے آنسوؤں کے سیلاب سے ان کا استقبال کیا۔ بعد ازاں شمالی اناطولیہ سے یونانیوں کا اخراج اور شہر پر قبضہ معمولی کام تھے جو جلد انجام پا گئے۔

## فرانس سے جنگ

فرانس سے بھی ترکی افواج کو لڑنا پڑا اور وہ ہر جگہ غالب رہیں۔ آخر کار فروری 1921ء میں جب بکر سامی بک وزیر خارجہ انگورہ لندن کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے جارہا تھا تو وہ راستہ میں پیرس اترا اور وہاں فرانسیسی مدبرین سے ملاقات ہوئی اور وہیں صلح کی بنیاد رکھ دی گئی۔ 30 ستمبر 1921ء کو موسیو فرنکلان بولون انگورہ پہنچا اور وہاں مکمل صلح فرانس کے ساتھ ہوگئی اور 20 اکتوبر 1921ء کو اس پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس معاہدہ کی رو سے علاقہ اطنہ ترکوں کو واپس مل گیا اور 29 نومبر 1921ء کو ترکی افواج دار السلطنت اطنہ میں داخل ہوگئیں اور یکم دسمبر 1921ء کو ترکوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

## لوزان کانفرنس

جس زمانہ میں یہ سب ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی میں روزنامہ زمیندار لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک مصطفیٰ کمال نے دریائے سقاریہ پر فیصلہ کن جنگ کر کے یونانیوں کو دریا کے اس پار دھکیل نہیں دیا تھا انگریز اس کو ڈاکو کے نام سے نوازتے تھے لیکن جیسے ہی سقاریہ جنگ میں فتح حاصل ہوئی فوراً انگریز کا رخ بدل گیا اور وہ "بہادر سپاہی" کے نام سے مصطفیٰ کمال پکارا جانے لگا۔ انگریزوں نے اب صلح کا جال پھیلایا اور اس میں اس کو گرفتار کرنا چاہا۔ غرض یہ تھی کہ اناطولیہ ترکی اور یونان میں تقسیم ہو جائے۔ میں نے اس وقت زمیندار میں ایک مقالہ افتتاحیہ "سازش گاہِ صلح" کے عنوان سے لکھا تھا جس پر علامہ اقبال نے میرے بعض اور دیگر مضامین کی طرح بنظرِ تحسین مجھے چائے کی دعوت دی اور مضمون کی تعریف کی۔ نوجوانوں کی ہمت بڑھانا علامہ اقبال کا خاص رویہ تھا۔

مصطفیٰ کمال صلح سے گریز کرنے کا اقرار نہیں کرتا تھا اور برابر صلح پر اپنی آمادگی ظاہر کرتا رہتا تھا۔ وہ تمام دنیا کو مخاطب کر کے برابر کہتا تھا کہ ہم امن چاہتے ہیں لیکن اپنے وطن کی مدافعت کے لیے جب تک کہ ہمارے اوپر حملہ جاری ہے ہمارا ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رہے گا۔ الغرض مصطفیٰ کمال یہ ٹھانے ہوئے تھا کہ میثاقِ ملی کے جملہ شرائط جب تک پورے نہ ہو جائیں وہ جنگ بند نہیں کرے گا۔

اب جبکہ ارمنی اور یونانی دونوں کو اس نے زیر کر لیا تھا اور فرانس اور اٹلی پر دباؤ ڈال کر ان سے صلح کر لی تھی۔ سمرنا کی فتح کے بعد بقیہ حصص جو باقی رہ گئے تھے مثلاً بر دصہ وغیرہ وہ بھی جلد ہی تصرف میں آ گئے اور اناطولیہ سے یونانیوں کا مکمل اخراج ہوگیا اور جو خواب انھوں نے سمرنا' تھریس' ایدرین اور قسطنطنیہ کا دیکھا تھا وہ ان کے لاکھوں مقتولین کی لاشوں کے نیچے دب کر فنا ہوگیا۔

سمرنا جب فتح ہوا تو وہ آخری بگل تھا یونانیوں کے مکمل اخراج کا۔ یہ وہی سمرنا ہے جس پر دھوکہ سے قبضہ کر کے یونانیوں نے وحشت خیز مظالم کیے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اس شہر میں داخل ہونے کے بعد سب کو امن وامان و معافی کا پیغام دیا۔ سمرنا کے مظلوم باشندے اپنا پرچم اور اپنا قائد اور اپنے جاہ وحشم کو دیکھ کر خوشی کے آنسو بہاتے تھے۔

اب مصطفیٰ کمال برطانیہ کی آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے کے لیے تیار تھا۔ فرانس سے جو معاہدہ ترکی نے کیا اور جس طرح اٹلی نے اپنے مقبوضات واپس کر دیے وہ برطانیہ کے لیے ایک عظیم دھکا تھا اور برطانیہ نے فرانس کے معاہدے پر اپنے سخت تعجب کا اظہار کیا۔ مصطفیٰ کمال نے میدانِ سیاست و تدبر میں جو فتح حاصل کی تھی وہ اسی طرح عظیم الشان تھی جس طرح اس کی فتح میدانِ جنگ میں تھی۔

## معاہدہ سیورے میں ترمیم

اب وقت آگیا تھا کہ بدنامِ زمانہ معاہدہ سیورے کی دھجیاں کمال پاشا کی نوکِ شمشیر سے فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آئیں چنانچہ اس میں ترمیم کے لیے لوزان میں صلح کانفرنس ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوئی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء سے ۴ فروری ۱۹۲۳ء تک مختلف مباحث سامنے آئے۔ ترکوں کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ انگریز موصل سے نکل جائیں۔ برطانیہ کی طرف سے لارڈ کرزن اور ترکی کی جانب سے عصمت پاشا بات چیت کرتے تھے۔ لارڈ کرزن مشہور استعمار پسند اور مغرور انسان تھا۔ وہ ہندوستان میں بھی وائسرائے رہ چکا تھا اور اس کی بددماغی کا عام چرچا تھا۔ رعونت میں سرشار لارڈ کرزن نے ترکوں کو یہ محسوس کرانا چاہا کہ اب صلح میں ترکی کو اگر کچھ دیا جائے گا تو وہ بطور احسان ہوگا۔ اس کو عصمت انونو کے کردار اور ترکانِ

احرار کے آہنی دل و دماغ کا اب بھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ عصمت جیت رہا تھا۔ اس کا ایک مختصر نویس کل تقریریں لکھا کرتا تھا جو ٹائپ ہو کر اس کے سامنے رکھ دی جاتی تھیں تب وہ سمجھتا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے لیکن وہ کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بہرا ہے۔ چنانچہ تقریروں کے دوران وہ برابر مسکرایا کرتا تھا۔ تمام دنیا کے اخباروں کے نمائندے لوزان میں جمع تھے۔ وہ لوگ لکھتے تھے کہ عصمت کی مسکراہٹ بڑی الجھن میں ڈالنے والی ہے۔ برطانیہ اپنے بڑے ارادے سے اب تک باز نہ آیا تھا۔ وہ معاہدہ سیورے میں کچھ لفظی ترمیم کرنا چاہتا تھا لیکن ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے پر مصر تھا چنانچہ برطانیہ نے جو شرائط پیش کیے ان کو عصمت نے کلیتاً نامنظور کر دیا۔

۴ فروری ۱۹۲۲ء کو کانفرنس کی گفت و شنید منقطع ہو گئی اور باہمی تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھنے والے زیادہ باتیں نہیں بناتے۔ پندرہ دن کا وقت اسی ٹال مٹول میں گزر گیا۔ آخر کار لارڈ کرزن نے یہ ظاہر کرنا چاہا کہ ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے چنانچہ انھوں نے عصمت پاشا کو ایک نہایت مغرورانہ اور احساس برتری سے لبریز خط لکھا جس میں درج کیا کہ "میں حکومت برطانیہ کا وزیر خارجہ ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے لیکن میں نے CONTINENTAL MAIL کانٹی نینٹل میل دو گھنٹے کے لیے روک لی ہے۔ اس دو گھنٹے کے اندر یا تو وہ شرائط جو پیش کی گئی ہیں منظور کی جائیں ورنہ ترکی کی قسمت پر مہر لگ جائے گی۔" اس کا جواب عصمت پاشا انونو نے یہ دیا جو لارڈ کرزن کے لیے کتنا غیر متوقع رہا ہو گا۔

"میں نہ صرف حکومتِ عالیہ ترکیہ کا وزیر خارجہ ہوں بلکہ اس کی افواج کا سپہ سالارِ اعظم بھی ہوں میں محاذِ جنگ پر جا رہا ہوں اور مجھے فرصت نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے ایک کلرک کو یہاں چھوڑ دیا ہے تاکہ اگر آپ کوئی مکتوب روانہ کریں تو وہ ہمارے پاس انگورہ پہنچ جائے۔"

عصمت پاشا اس طرح ترکی کی شان خودداری و خود اعتمادی کا پرچم لہرا کر ۲۰ فروری ۱۹۲۳ء کو انگورہ چلا گیا۔ وہاں پہنچنے پر برطانیہ کی جانب سے پھر گفت و شنید جاری کرنے کی تحریک ہوئی اور مجلس ملّیہ عظمیٰ نے حکومت کو اجازت دی کہ وہ گفت و شنید کو مکمل کرے۔ چنانچہ 5 اپریل 1923ء کو دوسری کانفرنس مدعو ہوئی۔ 23 اپریل 1923ء سے کانفرنس کا افتتاح ہوا اور ۱۶ جولائی 1923ء کو عہد نامہ صلح مکمل طور پر طے ہو گیا۔ اور 24 جولائی 1923ء کو معاہدۂ صلح پر دستخط ہو گئے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ اب قسطنطنیہ کی حکومت ناپید ہو چکی تھی۔ جو کچھ بات چیت ہوئی تھی صرف حکومت انگورہ سے ہوئی تھی جسے روس نے اولاً اور بعدۂ تقریباً تمام ممالک نے تسلیم کر لیا۔ صلح نامہ لوزان کے ابتدائی و تمہیدی فقرے حسب ذیل تھے۔

"سلطنت برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان، یونان، رومانیہ، عرب، کروٹ اور سلوفات (جنگِ عظیم کے درمیان ان قوموں کی ایک آزاد سلطنت بنادی گئی تھی) کی حکومت ایک طرف اور سلطنت ترکی دوسری طرف سے اس امر پر متحد ہوگئیں کہ ۱۹۱۴ء سے جو جنگ جاری ہے اس کا اب خاتمہ کر دیا جائے۔ ان حکومتوں کی خواہش ہے کہ آپس میں خوش گوار تجارتی تعلقات پیدا کیے جائیں کیونکہ تمام حکومتوں اور قوموں کا مفاد ان ہی تعلقات پر منحصر ہے۔ ان حکومتوں نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ مذکورہ بالا تعلقات کی بنیاد باہمی اعترافِ آزادی پر قائم ہونی چاہیے لہٰذا حکومت ہائے بالا نے حسب ذیل معاہدہ پر اتفاق کیا۔"

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس صلح نامہ میں روس اور امریکہ شریک نہیں تھے۔ روس کے شریک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ زار کا تختہ الٹا جا چکا تھا اور کمیونسٹ روس کو دولِ متحدہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ امریکہ یورپین سیاست کی گندگی سے بیزار ہو کر الگ ہو گیا تھا۔ اس صلح نامہ کی رو سے ترکی کو میثاقِ ملی کی تقریباً کل شرائط حاصل ہوگئیں ترکوں نے اپنے مطالبات مرتب کرنے میں کافی تدبر اور دور اندیشی کا اظہار کیا تھا اور ایسی چیزیں طلب نہیں کی تھیں جو ناممکن الحصول ہوں۔

# تحریکِ خلافت کا فتحِ ترکی پر اثر

برطانیہ نے اگرچہ در پردہ یونانیوں کی امداد و استعانت میں کچھ کسر اٹھا نہیں رکھی لیکن علانیہ فوجی امداد نہیں دی اس کے حسب ذیل وجوہ تھے:۔

1 جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد دول متحدہ کے اراکین میں ایسا اختلاف آراء پیدا ہو ہی گیا تھا۔ اور مصطفیٰ کمال نے اپنے تدبر کا ایسا جال بچھایا تھا کہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دوبارہ کوئی اور جنگ یورپ میں نہ کھڑی ہو جائے اور برطانیہ کسی حالت میں اپنی قوم کو ایک دوسری جنگ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

2 روس نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ اس خطرے میں عظیم اضافہ تھا۔ بالشویزم ایک نیا نظریہ حیات و مملکت لے کر آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا اور وہ نو آبادی نظریے سے براہ راست متصادم تھا۔ بالشویک روس زار کی امپیریل پالیسی کو الٹ کر ہر ملک میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور انگریز اس تحریک سے بہت زیادہ خائف تھا کیونکہ اس سے اس کے وجود پر کاری ضرب لگتی تھی۔

3 . تیسری سب سے بڑی وجہ ہندوستان کی عام بغاوت تھی۔ پورا ملک انگریز کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب تک مسلمان سب سے بڑے پشت پناہ رہے تھے اور علی گڑھ تحریک انگریز کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی تھی لیکن گاندھی جی کی قیادت میں سارا اسلامی ہند سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا اور گاندھی جی اپنی تمام تقریروں میں "خلافت" کو بنیادی حیثیت قرار دیتے تھے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ خلافت مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور اس میں انگریزوں نے مداخلت بے جا کی ہے اور ہمارے بھائی مسلمان آزردہ ہیں تو ہم کیسے مسرور رہ سکتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں "تحریکِ خلافت" یہاں کے پرشور نعروں، ہندو مسلم اتحاد کے مناظر، جیل خانوں کو پر کرنے کی تمناؤں، اور گولی کھانے کی آرزو و ولولہ ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کے اس متفقہ فیصلہ سے اسلام کو بچانے کی شکل صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے انگریزوں کو اکھاڑ کر اس کی طاقت توڑ دی جائے۔ ان سب نے ترکانِ آلِ عثمان کی بڑی سے بڑی امداد کی۔ مسلمانوں نے طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کو انگریز کے چنگل سے بہرحال آزاد کرایا جائے خواہ کچھ بھی ہو۔ ادھر دانشورانِ فرنگ بھی مسلمانوں کے اس جرأتمندانہ اقدامات سے برطانیہ کے مستقبل کے لیے خوف و ہراس محسوس کرنے لگے تھے۔ چنانچہ لارڈ نارتھ کلف جس کو جرنلزم کے نپولین کا خطاب دیا گیا ہے اور جو لندن سے سات اخبار نکالتا تھا اس نے لائیڈ جارج کی مسلم کش پالیسی کے خلاف زبردست محاذ تیار کیا۔ اس کے اخبارات روزمرہ لائیڈ جارج کے خلاف آگ اگلتے تھے اور اس کا پیغام یہ تھا کہ لائیڈ جارج کی پالیسی برطانیہ کی نو آبادی طاقت کو تہس نہس کر دے گی۔ چنانچہ اس نے خود بلادِ اسلامیہ اور مشرق کے ممالک کا دورہ کیا۔ اپنے دورے کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب جہاں میں گیا مسلمانوں کو مضطرب اور بے چین پایا۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ میں نے دیکھا کہ گھٹنے پاجامے اور لمبے کرتے پہنے مسلمان بغاوت کی آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ لکھی کہ حد ہو گئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے گاندھی کیپ پہننی شروع کر دی ہے۔ لارڈ نارتھ کلف کے خیال میں یہ گاندھی کیپ ایک طرف بغاوت اور انگریز دشمنی اور دوسری جانب ہندو مسلم اتحاد کا نشان تھی۔ اس نے آگاہی دی کہ یہ سرفروش حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

ایک چیز اور انگریز کے راستہ میں آکر روڑا بن گئی۔ دولِ متحدہ کانفرنس میں انگریز کا اثر نمایاں تھا اور انگریز کے اشارے سے یونانی سمرنا میں اترے تھے اس لیے ان کے اعمال و افعال کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوتی تھی۔ یونانیوں نے سمرنا اور اناطولیہ میں لرزہ خیز مظالم کیے۔ قتل، غارت گری، آتش زنی

اور عورتوں کی عصمت دری کے واقعات اس کثرت سے ہوئے کہ یورپ کا ضمیر تھرا اٹھا۔ بہت سے فرنگی اخبار نویسوں اور دانشوروں نے چشم دید حالات لکھے جو بڑے ہی وحشیانہ تھے۔ حتیٰ کہ غلام برطانیہ خلیفہ وحید الدین کی حکومت بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مہذب دنیا نے ان ہولناکیوں کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس لیے جب انگورہ گورنمنٹ نے اقوام عالم کے سامنے اعداد و شمار پیش کیے تو مجبوراً دول متحدہ کو ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ اس تحقیقاتی کمیشن نے کھلی کارروائی کی اور شہادتیں لیں۔ شہادت کا ایک نمونہ یہ تھا کہ نوجوان اناطولیہ کا باشندہ بندوق کندھے پر لٹکائے آیا اور بندوق ایک کنارے رکھ کر کمیشن سے یوں گویا ہوا:۔

"ہم دس پندرہ نوجوان کھلنڈرے تھے۔ ملک اور اناطولیہ میں کیا ہو رہا تھا ہمیں کوئی خبر نہ تھی۔ ہم پہاڑوں پر گھومتے، شکار کرتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ ایک دن جو میں واپس لوٹا تو دیکھا کہ میرا سارا گاؤں جل رہا ہے اور ایک طرف عورتیں جمع ہو کر رو رہی ہیں۔ میں وہاں گیا تو میری چچا زاد بہن نے اپنی شال میرے منہ پر ماری اور کہا کہ جا بے غیرت چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ۔ میں نے پوچھا یونانیوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ اس نے کہا ہم سے مت پوچھو کہ ہمارے ساتھ کیا کیا لیکن اگر ایک لمبے دانتوں والا یونانی تمہیں ملے تو اس کو زندہ نہ چھوڑنا۔ اسی وقت ہم سب نے ایک جگہ بیٹھ کر قسم کھائی اور بندوقیں لے کر نکل گئے۔ ہم جلتی آگ میں کودے، بہتے دریا میں تیرے، یونانی فوجوں میں گھسے افسوس کہ وہ لمبے دانت والا یونانی مجھے نہیں ملا۔ اگر وہ ملتا تو اگر ہزار جان رکھتا ہوتا تو ایک سلامت نہیں لے جاسکتا تھا۔"

ان ہولناک اور وحشیانہ واقعات نے یونان کا چہرہ مہذب دنیا میں سیاہ کر دیا اور ترک اپنے وطن کی مشکل حالات میں مدافعت کرنے پر تمام عالم کی ہمدردی کے قدرتاً مستحق ہو گئے۔ کوئی پروپیگنڈا کمال پاشا کے خلاف کارگر نہ ہوتا تھا۔ ایک عریاں حقیقت سامنے تھی۔ برطانیہ جو تہذیب کا اپنے کو علمبردار محافظ اور پاسبان ظاہر کرتا تھا ان حالات میں علانیہ یونان کی مدد کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ البتہ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس نے مدد نہیں کی۔ انگریز فوجی افسران جنگی حرکتوں اور اسکیموں میں مدد کرنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے اور سامان اور اسلحہ بھی خاموشی سے فراہم کرتا تھا۔

ادھر ہندوستان شور و غل مچا رہا تھا کہ کل کارروائی انگریز کرا رہا ہے۔ اخباروں میں شور اٹھا کہ ایک انگریز جنرل ہیرنگٹن محاذ جنگ کے قریب دیکھا گیا ہے۔ عوام نے لعن طعن جلسے اور جلوس احتجاج

اور تجویز ملامت کی بوچھار کر دی۔ انگریز انکار کرتا رہا۔

پورا ہندوستان کمال پاشا کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ جدھر دیکھو ٹولیوں کی ٹولیاں گشت کر رہی ہیں اور کمال پاشا کی مدح وثنا کے ترانے گا رہی ہیں جو اکثر شاعرانہ نکات سے عاری لیکن جوش اور جذبے سے بھرے ہوتے تھے مثلاً ع

ہمارا غازی کمال پاشا کمال اپنا دکھا رہا ہے

کوئی یہ نہ سمجھے یہ نعرے صرف مسلمان لگاتے تھے ہندو نوجوان اور رضا کار و النٹیر سب برابر کے شریک تھے جس طرح کہ وہ اللہ اکبر کا نعرہ جوش وخروش سے لگانے میں ہم زبان تھے۔

## بارھواں باب

# تحریکِ خلافت کا دوسرا دور

## حکومت بمبئی کا کمیونک اور مہاتما گاندھی کا دنداں شکن جواب

جس وقت کراچی کا مقدمہ مولانا محمد علی وغیرہ پر 19 اگست 1921ء کو چلایا گیا تو گاندھی جی نے ستمبر 1921ء میں مسلمانوں کے نام ایک پیغام میں کہا۔

"ہم کو عدم تشدد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے لیکن بے بسی کے ساتھ نہیں۔ علی برادران نے جو فار مولا سپاہیوں کے فرض کے بارے میں بتلایا ہے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور قید خانہ کی دعوت دینا چاہیے۔ ہم کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ ہمارے بہترین آدمیوں کے بغیر تحریک جاری نہیں رہ سکتی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوراج کے قابل نہیں ہیں اور نہ خلافت کے اور پنجاب کے ساتھ جو مظالم ہوئے ہیں ان کا مداوا کر سکتے ہیں۔"

4 اکتوبر 1921ء کو گاندھی جی نے بمبئی میں لیڈروں کا ایک اجتماع کیا جس میں گورنمنٹ کے احکام کے خلاف ایک مینی فسٹو جاری کرنے کے لیے کہا۔ مینی فسٹو حسب ذیل تھے:۔

"بمبئی کی حکومت نے 15 ستمبر 1921ء کو جو کمیونک جاری کیا اور جس میں علی برادران وغیرہ پر مقدمہ چلانے کا حکم ہے اس کے متعلق ہم دستخط کنندگان اپنی انفرادی حیثیت سے یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہر شہری کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ بلا کسی رکاوٹ کے حکومت کی ملازمت میں خواہ وہ سول ہو یا ملٹری رہنے یا نہ رہنے کی بابت اپنی آزادرائے ظاہر کرے۔ ہم دستخط کنندگان اپنی یہ رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات ہر ہندوستانی کی قومی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ بحیثیت سیولین کے اور بطور ایک قومی سپاہی کے ایک ایسے نظام حکومت کی نوکری کرے جس نے ہندوستان کو اقتصادی اخلاقی اور سیاسی

حیثیت سے قعرِ مذلّت میں ڈال دیا ہے اور جس نے قومی مقاصد کے حصول کے اقدامات کو زبردستی کچلنے کے لیے پولیس اور فوج استعمال کی ہے۔ مثلاً رولٹ ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے موقع پر، اور جس نے فوج کے سپاہیوں کو عرب، مصر، ترکی اور دیگر ممالک کی آزادی کو پامال کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ہماری رائے میں ہر ہندوستانی سیویلین اور سپاہی کا فرض ہے کہ وہ گورنمنٹ سے اپنا تعلق منقطع کرے اور اپنے گزر بسر کے لیے کوئی دوسرا روزگار تلاش کرے۔"

پچاس افراد نے اس مینی فسٹو پر دستخط کیے جن میں ممتاز حضرات حسب ذیل تھے:۔

گاندھی، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، لاجپت رائے، موتی لال نہرو، مسز نائیڈو، عباس طیب جی، این سی کیلکر، وی جے پٹیل، دلبھ بھائی پٹیل، ایم آر جیکر، جواہرلال نہرو، گنگا دھر راؤ دیش پانڈے، عمر سوبانی، جمنالال بجاج، ایم ایس اینے، ڈاکٹر انصاری، خلیق الزماں، عبدالباری، سی راجگوپال آچاریہ، جتندرلال بنرجی، راجندر پرشاد، حسرت موہانی، یعقوب حسن، ڈاکٹر مونجے اور جے رام داس دولت رام۔

5 اکتوبر 1921ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس مینی فسٹو کو پاس کیا اور اس کے ساتھ ہی ہزاروں پلیٹ فارموں سے لاکھوں آدمیوں نے اس کو دہرانا شروع کر دیا۔ حکومت اس جوابی حملہ سے حواس باختہ ہو گئی۔ وہ اس کل ہند آتش فشاں کے مقابلے کے لیے تیار نہ تھی۔

گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں اور اپنی تقریروں میں اس مینی فسٹو کی وضاحت اور اپنے فلسفے کی تشریح زور شور سے شروع کی۔ لمبے لمبے مضامین لکھے، مدلل تقریریں کیں۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو گاندھی جی بہت مختصر گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں جب ان کو اپنا فلسفہ سمجھانا تھا وہ طوالت سے گھبراتے نہ تھے۔ انھوں نے یہاں تک لکھا کہ "میری خاکساری میرے راستے میں حائل ہے ورنہ میں مکانوں کی چھتوں پر سے اعلان کرتا کہ ترک تعاون، ترک تشدد اور سودیشی کا ایک ہی پیغام ہے جو میں ساری دنیا کو دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "سوراج کے معنی ہیں موت کا خوف دور کر دینا۔ جو لوگ کہ روح کا وجود مانتے ہیں، (اور کون ہندو عیسائی یا پارسی ہے جو نہیں مانتا) وہ جانتا ہے کہ روح لافانی ہے اس لیے ہم کو موت کا خوف نکال دینا چاہیے۔ اور اگر موت کا خوف نہیں ہے تو جیل خانہ کیا ہے کہ جس سے ڈرا جائے۔ ہم غلطی پر نہیں ہیں ہم کو جیل جانا یا پھانسی کے تختہ پر لٹک جانا اس لیے منظور ہے کہ ہم گورنمنٹ کے ظالمانہ قوانین کی مخالفت کرتے ہیں۔"

علی برادران کی وحشیانہ سزایابی کے مقابلہ کا عزم آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ قوم نے اس کا بھرپور

جواب یہ دیا کہ 5 نومبر 1921ء کی آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مہاتما گاندھی کے مینی فسٹو مورخہ 6 اکتوبر 1921ء کی دوبارہ توثیق کی اور تمام صوبوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری پر سول نافرمانی کا آغاز کریں جس میں عدم ادائیگی ٹیکس کا پروگرام بھی شامل ہو۔ البتہ سول نافرمانی میں شرکت سے پہلے سودیشی پروگرام کی مکمل حمایت جس میں چرخہ کاتنا بھی شامل ہے اس کی قسم لینی ہوگی اور حلف لینا ہوگا کہ وہ عدم تشدد پر پوری طرح عمل کریں گے جو شخص سول نافرمانی میں حصہ لے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد پر کامل عقیدہ رکھتا ہو اور چھوت چھات کو دور کرے۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی بھی تحریک میں آئے گا اس کو یا اس کے خاندان کو مالی امداد نہیں دی جائے گی۔ ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ جب گاندھی جی نے یہ پروگرام بنایا تو کچھ لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا کہ رضا کاروں کے خاندان کے لوگ بھوکوں مر جائیں گے گاندھی جی نے جواب دیا مر جانے دو۔ لیکن فوراً مسکرا کر کہا کہ کوئی بھوکوں نہیں مرے گا اور وہی ہوا۔ بھلا عوام ان جانبازانِ وطن کو بھوکوں مرنے دیتے ؟

## بردولی میں سول نافرمانی

اسی کے ساتھ ہی گاندھی جی نے یہ حکم دیا کہ ابھی کوئی بھی سول نافرمانی کا آغاز نہ کرے وہ خود بردولی میں سول نافرمانی کی قیادت کریں گے اسے لوگ دیکھ لیں اور پھر اسی نمونہ پر سارے ہندوستان میں سول نافرمانی شروع ہو۔ بردولی صوبہ گجرات کے ضلع سورت کا ایک تعلقہ ہے۔ ملک کے لیڈروں سے انھوں نے کہا کہ میں کسی سے کوئی مدد سوائے اس کے نہیں مانگتا کہ میری کوششوں سے لوگ ہمدردی رکھیں اور چوکتے رہیں کہ ان کے صوبوں میں کہیں تشدد رونما نہ ہو۔ اگر دوسرے صوبوں میں امن قائم رہا تو مجھے کوئی خوف نہیں اور ہماری کوششوں کے سر پر کامیابی کا تاج لازماً رکھا جائے گا۔"

گاندھی جی نے سول نافرمانی کا انحصار عدم تشدد پر ہونے کی دلیلیں بھی برابر قوم اور کانگریس کے سامنے پیش کیں۔ ورکنگ کمیٹی کے سامنے سول نافرمانی کا ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"عام سول نافرمانی ایک بھونچال کی طرح ہے جہاں سول نافرمانی کا راج قائم ہو جاتا ہے وہاں حکومت معطل ہو جاتی ہے۔ وہاں ہر پولیس کے سپاہی، ہر فوج کے سپاہی، ہر گورنمنٹ کے افسر کے لیے مجبوری ہو جاتی ہے کہ یا تو وہاں سے بھاگ جائے یا سوراج کا سپاہی بن جائے۔ پولیس اسٹیشن اور تمام گورنمنٹ کے دفاتر وغیرہ حکومت کی ملکیت سے خارج ہو کر عوام کے قبضہ تصرف اور چارج میں آجائیں گے۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے ایک بنیادی اور لازمی شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام ادنیٰ ترین مظاہرہ یا تشدد کا استعمال نہ کریں۔ نافرمانی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اگر حکومت کہے کہ داہنے جاؤ تو بلا توقف و بلا تامل

اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے ہم کو فوراً بائیں جانب چل دینا چاہیے۔ حکومت کی مخالفت اگرچہ عزم بالجزم کے ساتھ ہونی چاہیے۔ لیکن یہ سب پورے اطمینان و سکون سے انجام پانا چاہیے۔ البتہ یہی نافرمانی بجائے پرامن ہونے کے اگر بطور اظہار تہور و شجاعت یا غرور یا از راہِ تضحیک یا غصہ یا اشتعال یا انتقامی جذبہ سے ہوئی تو یہی نافرمانی سول کے بجائے حقیقتاً و واقعتاً کرمنل (مجرمانہ) ہو جائے گی۔ اس طرح ہر شخص سول نافرمانی کی تحریک میں شرکت کے قابل نہیں ہے۔" تقریر کے آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ "جب بردولی پر سوراج کا جھنڈا لہرایا جائے گا تو قریب کے اضلاع بھی یہی کریں گے۔ اسی طرح ضلع بہ ضلع تمام ہندوستان میں سوراج کا جھنڈا بلند ہوگا۔ لیکن بہر حال جب تک یہ تحریک جاری ہے اگر ملک کے کسی حصہ میں ذرا بھی تشدد کا مظاہرہ ہوا تو تحریک کو جاری رکھنا قرینِ مصلحت نہ ہوگا۔ تمام ملک کو ایک آواز ہو جانا چاہیے اور اتحاد اور یکسانیت مکمل ہونا چاہیے اس لیے اگر ملک کے اندر کسی حصہ میں تشدد ظاہر ہوا تو افتراق اسی طرح پیدا ہو جائے گا جس طرح ایک تار کے بگڑنے سے باجے کی آواز میں فرق ہو جاتا ہے۔"

چند روز کے بعد وہ بمبئی کے راستہ سے بردولی کی جانب روانہ ہوئے۔ تمام ملک سانس روکے ہوئے تھا۔ گاندھی جی نے ایک سال کے اندر سوراج دلانے کا جو وعدہ کیا تھا اس کی ابتدا ہونے جا رہی تھی۔

## پرنس آف ویلز کی آمد

اہل بمبئی کو گاندھی جی نے پیغام دیتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب بردولی میں سول نافرمانی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں فوج بلائی گئی ہے گولیاں برسائی جائیں گی لیکن ہر چہ بادا باد میں بردولی جا رہا ہوں۔ بمبئی کے لوگوں سے میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ بردولی میں جو کچھ بھی ہو وہ پرامن اور خاموش رہیں۔

17 نومبر 1921ء کو تاجِ برطانیہ کے ولیعہد شہزادہ پرنس آف ویلز بمبئی کے ساحل پر جہاز سے اترنے والے تھے۔ حکومت نے معزز مہمان کے استقبال کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ مگر کانگریس، خلافت کمیٹی اور گاندھی جی نے پرنس کے استقبال کے بائیکاٹ کا پیغام دیا۔ گاندھی جی اس دن احمد آباد سے بمبئی آ گئے تھے۔ اور انھوں نے چوپاٹی کے میدان میں ایک عام جلسہ کا اعلان کیا اور تمام قوم کو پکارا کہ کوئی بھی پرنس کے استقبال کے لیے نہ جائے بلکہ ہمارے جلسہ میں لوگ آئیں۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ پرنس جب جہاز سے اترے تو مکمل سناٹا تھا اور پورے شہر بمبئی میں مکمل ہڑتال تھی۔ اس سے بہتر مظاہرہ عوام کی بے اطمینانی اور بغاوت کا اور کیا پیش کیا جا سکتا تھا جتنا گاندھی کے جلسہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوئے۔ لیکن عدم تشدد پر قائم عمل پیرا

نہ رہ سکی اور بمبئی اور مضافات میں بلوہ ہوگیا۔ گاندھی جی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انھی کی جے بول کر پارسیوں اور سرکاری افسران کی موٹریں جلادی گئیں، سرکاری ٹرامیں توڑ ڈالی گئیں، پارسی عورتوں کی ساڑیاں کھول کر انھیں ننگا کر دیا گیا اور ان ساڑیوں کی ہولی منائی گئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان واقعات پر پردہ ڈال دیتا لیکن گاندھی جی نے جن کا بنیادی اصول ہی سچائی تھا سب باتیں من وعن تسلیم کریں اور اپنے بیان میں انتہائی رنج وغم کا اظہار کیا۔ انتہائی یاس کی حالت میں وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کن امیدوں سے وہ چلے تھے اور اب کیا ہوگیا۔ گاندھی جی کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کے پیچھے کوئی خاص دماغ کام کر رہا ہے اور سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ماہرانہ انداز میں یہ بلوے کرائے گئے ہیں تاکہ تحریک کے بادبان سے ہوا نکل جائے۔ یہ انقلاب فرانس کے وقت سے انگریزی کی آزمودہ تکنیک تھی۔ اس لیے گاندھی جی کا شبہہ بے جا نہ تھا۔

وہ ایک بجے رات تک اسی غم والم میں جاگتے رہے اور رات ہی میں انھوں نے سورت اور بردولی جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ دوسرے دن پارسی اینگلو انڈین اور یہودی کافی مسلح ہو کر مجنونانہ جوش میں نکلے۔ وہ انتقام کے لیے بے چین تھے۔ کانگریس کے لیڈر لوگوں کو امن وسکون پر آمادہ کرنے کی شہر میں مسلسل کوشش میں لگے تھے لیکن حملہ اور جوابی حملہ، پتہ نہیں تھا کہ معاملہ کہاں جاکر ختم ہوتا۔

گاندھی جی سوچتے تھے کہ میں کیا کروں، مظلومین کو میں گورنمنٹ کی امداد لینے کے لیے کہہ نہیں سکتا اور اگر میں اپنے آپ کو پارسیوں کے سامنے ٹکڑے کیے جانے کے لیے پیش کر دوں تو اور بھی خونریزی ہوگی بہت کچھ غم انگیز سوچ بچار کے بعد ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ برت رکھیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ میں خدا کے سامنے حاضر ہو کر مزید طاقت طلب کروں تاکہ اس کا کام کر سکوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب میں اپنے کو اس کے سامنے ایک ذرہ ناچیز کی حیثیت سے پیش کروں اور وہ کھانا کھانے سے اپنے کو روک دوں جو اس نے ہم کو دیا ہے۔ اس طرح یا تو وہ مجھ کو طاقت دے گا یا موت دے کر اپنے یہاں بلالے گا تاکہ مجھے نئے سرے سے تعمیر کرے۔ اس طرح گاندھی جی نے ایک طویل بیان سے اپنے برت کا اعلان کیا جس میں انھوں نے ظاہر کیا کہ خدا سچائی اور محبت کا خدا ہے۔ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ میں انگریزوں سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ میں تو اس نظام حکومت کے خلاف اٹھا ہوں جو ناجائز ہے۔ ہندو مسلم اتحاد میرا ایمان ہے اور جب تک ہندو اور مسلمان پارسیوں سے حقیقی معذرت نہ کریں میں ان کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کیا:

"میں اپنے مسلمان بھائیوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں خلافت کی تحریک میں اسے ایک مقدس معاملہ سمجھ کر شریک ہوا ہوں۔ میں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کی کیونکہ ہندوستان اس کے بغیر

زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر ہم کو ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو خدا سے انکار ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو علی برادران کی گود میں ڈال دیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سچے اور خدا ترس لوگ ہیں۔ میرا یقین ہے کہ گزشتہ دو دن کے بلووں میں مسلمانوں نے بیش از بیش حصہ لیا ہے۔ اس سے مجھ کو سخت صدمہ ہوا ہے میں ہر مسلمان کارکن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی پوری طاقت سے کھڑا ہو اور اس کے مذہب نے جو فرض اس پر عائد کیا ہے اس کا احساس کرے اور محنت کر کے اس فساد کو ختم کرے۔"

۱۹ نومبر 1921ء کو گاندھی جی نے دیوی داس اپنے لڑکے کو بمبئی واپس بلا لیا اور کہا کہ دیوی داس ایک خاص غرض کے لیے بلایا گیا ہے۔ وہ غرض یہ تھی کہ اگر قریب کے اضلاع میں پھر تشدد کا اظہار ہوا تو دیوی داس کو بلوائیوں کے ہاتھوں قربان ہونے کے لیے بھیجا جائے گا۔ اس درمیان میں گاندھی جی کو کارکن گھیرے رہتے تھے اور پوچھتے تھے کہ ہم کیا کریں کیسے یہ بلوے ختم ہوں۔ گاندھی جی جواباً کہتے تھے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ البتہ فاقہ کرنے سے میں انتہائی اندرونی سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔ اس برت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ گاندھی جی نے یہ طے کیا کہ جب تک سوراج حاصل نہ ہو جائے وہ ہر دوشنبہ کو 24 گھنٹے کا فاقہ کریں گے۔ ان کے نزدیک یہ تزکیۂ نفس کا ایک ذریعہ تھا اور روحانی طاقت سے ہی ان کے نزدیک کامیابی ممکن تھی۔

22 نومبر 1921ء کو گاندھی جی کا برت رنگ لایا۔ اراکین و ہمدردانِ تحریکِ موالات اور اس کے مخالفین ہندو مسلمان پارسی سب متحد و متفق ہو کر جمع ہوئے اور اتحاد اور اتفاق قائم ہوا تب گاندھی جی نے برت توڑا۔

23 نومبر 1921ء کو بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور گاندھی جی کی تحریک پر بردولی کی سول نافرمانی غیر معین مدت کے لیے ملتوی ہو گئی۔

# حکومت کا رویہ اور تحریک میں نیا خون

بمبئی میں شہزادہ ویلز کی مکمل بائیکاٹ اور ہڑتال نے حکومت کے اراکین میں سخت غصہ پیدا کر دیا اینگلو انڈین طبقے نے وائسرائے پر کارروائی کرنے کے لیے زور ڈالا اور مختلف جبری احکام پورے ہندستان میں جاری کیے گئے۔ ۱۹ نومبر 1921ء کو بنگال کی گورنمنٹ نے کانگریس اور خلافت کی تمام والنٹیر تنظیموں کو خلافِ قانون قرار دیا اور سیاسی جلسوں کو دبانے کا حکم صادر کر دیا۔ پنجاب صوبہ متحدہ بہار اور آسام نے تقلید کی اور اس طرح کے احکام جاری کیے۔ اس چیلنج کا دل کھول کر مقابلہ کیا گیا اور ان احکام کی مکمل خلاف ورزی بلا کسی تامل و تردد کے اور بغیر کسی پریشانی کے کی گئی۔ یوپی جبر و تشدد میں سب سے آگے نکل گیا۔

الہ آباد میں صوبائی کانگریس کمیٹی کے 55 ممبران کو جو ایک ہنگامی جلسہ میں والنٹیروں کے بارے میں ایک تجویز پہ بحث کر رہے تھے بیک وقت گرفتار کر لیا۔ مسٹر سی آر داس جو کانگریس سیشن احمد آباد کے صدر منتخب ہوئے تھے دسمبر میں گرفتار ہوئے۔ مختار لیڈران مثلاً لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہرلال نہرو تمام ملک میں گرفتار کیے گئے۔

ہزاروں والنٹیر بھی گرفتار ہوئے لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے ہزاروں دوسرے لوگ رضا کارانہ بھرتی ہو گئے۔ دھارا پلٹ گیا اور تحریک میں پھر قوت پیدا ہوگئی اور جو معمولی اضمحلال بمبئی میں آیا تھا وہ دور ہو گیا جہاں جہاں پرنس آف ویلز گئے مکمل ہڑتال نے ان کا استقبال کیا۔ جبریہ قوانین کا ایک خاص منشا یہ تھا کہ پرنس آف ویلز کا دورہ امن وسکون سے ختم ہو مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

گورنمنٹ عدم تشدد کا جواب جبر وتشدد سے دے رہی تھی حتیٰ کہ کھدر کا لباس اور گاندھی ٹوپی حکام کے لیے سخت کوفت کا باعث تھی اور جو استعمال کرتا تھا اس کی توہین وتذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا اور جھوٹے مقدمات چلائے جاتے تھے۔ پولیس محض تفریحاً یا قصداً والنٹیروں کے کپڑے اتروالیتی تھی۔ کبھی ان کو تالاب میں ڈبوتی نکالتی تھی۔ اس کے علاوہ قومی تعلیم گاہوں کے ریکارڈ جلادیے جاتے تھے مکانات پھونکے گئے۔ کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے سامان برباد کر ڈالے گئے۔ فصلیں جلائی گئیں۔ مال واسباب لوٹا گیا حتیٰ کہ ایسے واقعات کی بھی اطلاع ملی کہ عورتوں کے زیورات چھین لیے گئے اور ان پر مجرمانہ حملہ کیا گیا۔

پنڈت مدن موہن مالویہ پر ان جابرانہ حرکات کا بہت اثر ہوا اور وہ وائسرائے سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ گاندھی اور وائسرائے میں صلح ہو جائے۔ چونکہ وائسرائے کی یہ بڑی خواہش تھی کہ جب پرنس آف ویلز کلکتہ آئیں تو امن و سکون سے ان کا استقبال کیا جائے اس لیے وہ گاندھی جی سے صلح کی بات کرنے پر راضی ہو گئے لیکن ۱۹ دسمبر 1921ء کو گاندھی جی نے پنڈت مالویہ کو حسب ذیل بہادرانہ اور ولولہ انگیز تار دیا۔

> "آپ گورنمنٹ کی سختیوں کی قطعی کوئی پرواہ نہ کریں۔ اس وقت تک وائسرائے سے کانفرنس بیکار ہوگی جب تک کہ گورنمنٹ اپنے افعال پر ندامت کا اظہار نہ کرے اور تین چیزوں کو طے کرنے پر تیار نہ ہو۔ یعنی پنجاب، خلافت اور سوراج۔"

مالویہ جی اس کے بعد سی آر داس اور مولانا آزاد سے پریسیڈنسی جیل کلکتہ میں ملے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر داس اور آزاد کو چند شرائط پر ہڑتال روکنے کے لیے راضی کر لیا جائے تو گاندھی جی کو بھی موافق کیا جا سکے گا لیکن گاندھی جی نے مالویہ جی کو ان کے تار کے جواب میں دوسرا تار دیا کہ شرائط پہلے طے ہونی چاہئیں۔ اور اوّل ضروری چیز یہ ہے کہ تمام قیدی جن میں کراچی کے قیدی بھی شامل ہیں رہا کر دیے جائیں اور کانفرنس کی تاریخ پہلے سے طے کی جائے۔

اگر یہ دونوں باتیں منظور ہوں تو ہڑتال کو روکا جاسکتا ہے۔ جب مالوی جی نے گاندھی جی کا تار وائسرائے کو دکھایا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے لیکن پھر بھی بات چیت جاری رہی لیکن لارڈ ایڈنگ جو کھیل کھیل رہے تھے اسے گاندھی جی نے سمجھ لیا تھا اور آخر میں حسب ذیل تار دیا:۔

"نہایت افسوس ہے کہ جو عہد آپ کرانا چاہتے ہیں اس سے ہم معذور ہوں۔ ترکِ موالات کی تحریک اسی وقت روکی جاسکتی ہے جب کانفرنس کا کوئی کامیاب نتیجہ نکلے اور میں کسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔"

اب انگریز کو معلوم ہوا ہوگا کہ کس دل و جگر اور کس دماغ کے آدمی سے ان کا مقابلہ ہے۔ اس طرح مالویہ جی اور وائسرائے کی گفت و شنید ناکام ہوگئی۔

## آنکھوں دیکھا حال

رضاکاروں کی تحریک کو دبانے کے لیے گورنمنٹ نے جو احکام جاری کیے ان کا کس جوش سے مقابلہ کیا گیا اس کی ایک مثال خود میرے علم میں ہے۔ میں ان دنوں اخبار "مدینہ بجنور" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھا اور کانگریس میں پرزور کام کر رہا تھا۔ میں یونیورسٹی اسکول آف لاالہ آباد سے ترکِ موالات کر کے آیا تھا اور کچھ دنوں کانپور حسرت موہانی صاحب کے ساتھ رہنے کے بعد بجنور "مدینہ" میں چلا گیا تھا۔ پورا مشغلہ کانگریس کا کام تھا۔ تقریباً روزانہ جلسے ہوتے تھے اور میں زیادہ تر جلسوں کی صدارت کرتا تھا اور تقریر تو روز ہی کرتا تھا۔ بہت سے ممتاز اشخاص اس وقت وہاں تھے جن میں مہابیر تیاگی ابھی موجود ہیں۔ ہزاروں آدمی روزانہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ عورتوں نے جلوس نکالا اور ان میں سے چند گرفتار بھی ہوئیں۔ فضا میں آگ ہی آگ بھری تھی۔ ایک دن میں ایک جلسہ کی صدارت کر رہا تھا کہ ایک مقرر صاحب نے کہا کہ ایک انگریز بچوں کا خون پیتا ہوا پایا گیا ہے۔ یہ خبر غلط تھی لیکن مشہور ہو چکی تھی اور اس کی پرزور تردید بھی ہو گئی تھی۔ اب جو یہ بات پھر کہی گئی تو میں نے فوراً روک دیا اور مقرر کو بیٹھا دیا۔ میں نے کہا کہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق ہماری لڑائی انگریز سے نہیں بلکہ نظامِ حکومت سے ہے۔ بجنور کا سب انسپکٹر اس جلسہ میں موجود تھا۔ وہ میری اس کارروائی سے بہت خوش ہوا اور دوسرے دن آکر میری بڑی تعریف کی اور مجھ پر بھروسہ کرنے لگا اور مجھ سے برابر ملا کرتا تھا شاید بھید لینے کے لیے۔

جب والنٹیروں کا نظام خلافِ قانون قرار دیا گیا تو وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ کے پاس کتنے والنٹیر ہیں۔ میں نے کہا ہمارے پاس کوئی والنٹیر نہیں ہے اور اس کو یقین ہوگیا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ واقعہ بھی اس وقت کچھ

اسی طرح کا تھا۔ کام کرنے والے تو بہت تھے مگر والنٹیر خصوصیت سے بنائے نہیں گئے تھے۔ اس کے جانے کے بعد ہم لوگ نکل پڑے اور خاموشی سے قریب 150 والنٹیر بنا دیے۔ یہ کانگریس اور خلافت کے مشترک والنٹیر تھے۔ یہ سمجھ کر کہ یہاں کوئی والنٹیر نہیں ہے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اعلان کرایا کہ کانگریس اور خلافت کا والنٹیر بنا خلافِ قانون ہے۔ اور بننے پر گرفتاری کی دھمکی دی۔ جب یہ اعلان ہوا تو کئی ساتھی احمد آباد کانگریس کے لیے بجنور سے بذریعہ بس نجیب آباد میں گاڑی پکڑنے کے لیے جا چکے تھے۔ اس وقت بجنور میں ریل نہیں تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کو روک لیا جائے اور اس چیلنج کا مقابلہ کر کے مرتب کیا جایا جائے۔ چنانچہ میں فکرمند ہوا کہ کیسے نجیب آباد پہنچوں۔ ایک مسلمان ٹیکسی والا سرِ راہ مل گیا۔ میں نے کہا خلافت کی کچھ خدمت کرو گے۔ وہ فوراً بلا معاوضہ چلنے پر تیار ہو گیا اور ہم لوگ وہیں سے روانہ ہو گئے۔ نجیب آباد اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی نہیں آئی تھی ــــ ساتھیوں کو لادا اور رات ہی میں بجنور واپس آ گئے۔ میں بھی احمد آباد کانگریس سیشن میں یوپی کا ایک ڈیلیگیٹ تھا مگر ابھی کچھ دن باقی تھے۔ خیال یہ تھا کہ خوش قسمت جیل چلے جائیں گے۔ ان کے علاوہ جو بچ رہیں گے وہ احمد آباد روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن صبح کا منظر عجیب تھا۔ ایک مسلمان والنٹیر اچھے تن و توش کا کمر میں رضا کار کی پٹی لگائے والنٹیروں کا سردار بنا اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ والنٹیروں نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گانا شروع کیا۔

اے پولس والو ستانا ظلم کرنا چھوڑ دو　　بھائیوں کے حلق پر خنجر چلانا چھوڑ دو

چار دن کی زندگی ہے چار دن کی چاندنی　　چار دن کے واسطے چاندی رچانا چھوڑ دو

سب انسپکٹر ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا اور حیران ہو کر یہ نظارہ دیکھا۔ غم اور غصہ میں بار بار اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارتا تھا اور چلاتا تھا کہ قاضی عدیل نے خوب دھوکا دیا۔ یہ گیارہ رضا کار گرفتار ہو کر جیل چلے گئے تو دوسرے گیارہ دفتر کانگریس سے روانہ کیے گئے۔ کل کارروائی کی نگرانی مرزا عبداللطیف بیگ صدر ضلع کانگریس کمیٹی بذات خود کر رہے تھے۔ اب دوسرے اور تیسرے جتھے کے بعد سب انسپکٹر نے یہ کہنا شروع کیا کہ قاضی عدیل کہاں ہیں وہ کیوں نہیں آتے۔ میں نے سنا تو بے تاب ہو گیا اور فوراً والنٹیروں کے گروہ میں شریک ہونے کے لیے لپکا۔ مرزا عبداللطیف بیگ نے مجھے پکڑ لیا اور کمرے میں بند کر دیا۔ میں بہت غصہ میں تھا اور دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مرزا عبداللطیف بیگ نے ایک اور جتھا روانہ کر کے مجھے کھولا اور کہا سکون سے باتیں کر لو۔ تحریک چلانے کا طریقہ یہ ہے کہ مضبوط آدمی پیچھے رکھے جاتے ہیں تاکہ تحریک کو تھامے رہیں۔ تم سب سے آخر میں جیل جاؤ گے۔ تم سے پہلے میں جاؤں گا۔ الغرض انھوں نے مجھے سمجھا بجھا لیا۔ تین دن حکومت کے چیلنج کا جواب دے کر ہم لوگ احمد آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان تینوں دنوں کے اندر سیکڑوں آدمیوں سے دفتر کانگریس کے باہر کا میدان ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ لوگ

نعرے لگاتے تھے۔ والنٹیروں کو ہار پہناتے تھے اور پولیس اسٹیشن تک دے جاتے تھے۔ ہر شخص والنٹیر بننے کے لیے تیار تھا۔

# آگرہ صوبائی خلافت و کانگریس کانفرنس

اس سے پہلے اکتوبر 1921ء میں آگرہ کے مقام پر صوبائی خلافت کانفرنس زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد اور صوبائی کانگریس کانفرنس زیر صدارت مولانا حسرت موہانی منعقد ہو چکی تھی۔ اس کانفرنس میں اخبار مدینہ کے نمائندہ کی حیثیت سے میں بھی شریک تھا۔ مجھے مولانا آزاد کی تقریر کا پہلا جملہ اب تک یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں نے آج یہاں آتے ہوئے دریائے جمنا میں اتنا پانی بھی نہیں دیکھا جتنا مسلمان کا خون گزشتہ دس سال میں بہہ چکا ہے۔" مولانا نے اپنی طویل تقریر میں سورۃ والعصر کی تفسیر بیان کی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ زمانہ اور تاریخ شاہد ہے کہ کسی کام کے کرنے کے لیے چار شرطیں ہیں اور جب وہ چاروں پوری ہوں تو کامیابی یقینی ہے ورنہ گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ وہ چار چیزیں حسب ذیل ہیں:۔

(1) جو کام کرنا ہو اس پر پورا یقین۔

(2) اس کام کو اسی طرح کرنا جس طرح کرنا چاہیے۔

(3) خود عمل کرنے کے بعد دوسروں کو دعوت دینا۔

(4) جب ایسا ہو اور مشکلات آئیں تو اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔

مولانا آزاد پر ایک مخصوص سی آئی ڈی انسپکٹر غلام حسین تعینات تھا۔ وہ یوپی میں سب سے بہتر اردو شارٹ ہینڈ جانتا تھا ایک سو بیس الفاظ ایک منٹ میں لکھ لیتا تھا وہ کھلم کھلا سب کے آگے بیٹھتا تھا اور تقریر لکھتا تھا۔ مولانا کبھی کبھی اپنی رفتار تیز کر کے ایک سو پچاس الفاظ ایک منٹ میں بولنے لگتے تھے تو وہ پنسل رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتا تھا۔ مولانا مسکراتے تھے اور رفتار دھیمی کر دیتے تھے۔ مولانا کا ایک کیمپ علاحدہ تھا۔ غلام حسین کانی چاپلوس تھا۔ دوسرے دن صبح میں مولانا کے کیمپ میں گیا تو وہ بھی موجود تھا اور کہہ رہا تھا حضور میں لکھ نہیں پایا کیا جواب دوں گا۔ مولانا نے جہاں جہاں وہ کہتا گیا کہ سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ گیا ہے پڑھ کر ادیا۔ شفاعت اللہ خاں مینجر اخبار "زمیندار" بھی وہاں آئے تھے۔ میں دراصل مدینہ سے مستعفی ہو چکا تھا یا ہونے والا تھا۔ شفاعت اللہ خاں سے طے ہو چکا تھا کہ احمد آباد کانگریس سے فارغ ہو کر میں سیدھا لاہور جا کر اخبار "زمیندار" کا بحیثیت چیف ایڈیٹر چارج لے لوں۔ کسی وقت مولانا فتح پور سیکری کار سے جانے والے تھے۔ شفاعت اللہ خاں نے کہا کہ آپ اکیلے ہیں میں بھی ساتھ چلا چلوں تو مولانا نے فرمایا "عزیزمن تنہائی بذات خود ایک "معیت" ہے" یہ شفاعت اللہ

تنہائی پسند تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ قیدِ تنہائی کو لوگ سزا کیوں کہتے ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب نے بھی جلسہ خلافت میں بڑی معرکتہ الآرا تقریر کی تھی۔ ایک اور واقعہ شفاعت اللہ خاں نے مولانا آزاد کا بیان کیا۔ شفاعت اللہ خاں نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ آپ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مبارکہ صرف قرآن پاک سے لکھنے والے ہیں تو اس کتاب کا کیا ہوا۔ مولانا نے فرمایا "عزیزمن! وہ کتاب دماغ میں مرتب و مدوّن ہو کر مکمل ہو چکی ہے صرف کاغذ پر اسے منتقل کرنا ہے۔" افسوس کہ اس انتقالِ مکانی کا انتظار ہی ہوتا رہا اور مولانا کا انتقالِ روحانی ہو گیا۔

کانگریس کی صوبائی کانفرنس بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ جواہر لال نہرو بھی آئے ہوئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی آمد صبح کو تھی۔ میں ایک دن قبل چلا گیا تھا۔ صدر کانفرنس کے لیے ایک الگ کیمپ آراستہ کیا گیا تھا اور اسٹیشن پر استقبال اور وہاں سے جلوس کا زبردست انتظام تھا۔ ہار پھول کثرت سے مہیا تھے۔ سواریوں کا انتظام تھا پبلک کو اطلاع دی گئی تھی اور یقین تھا کہ اسٹیشن پر اژدہام خلائق ہوگا۔ مگر سادہ دل سادگی پسند تکلف و تصنع سے لاپرواہ مولانا حسرت موہانی رات کو گیارہ بجے ٹرین سے اتر ایک یکہ پر جائے کانفرنس پر پہنچے۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹین کا بکس تھا جو اوپر سے بند ہوتا تھا۔ اس میں ایک تکیہ تھا ایک دری ایک جوڑا کپڑا ایک چھوٹا لوٹا پھٹے کپڑوں کو سلنے کے لیے سوئی تاگا جو ہر سفر میں ان کا رفیق تھا۔ اور لگے اپنی نون غنہ کی آواز میں صدر مجلس استقبالیہ کو پکارنے۔ وہ بے چارہ سو رہا تھا۔ جاگا تو دیکھا کہ مولانا صدر کانفرنس ہاتھ میں ٹین کا بکس لیے کھڑے ہیں۔ دیکھتے ہی جل بھن گیا۔ مولانا نے کہا مجھے کہیں لیٹنے کی جگہ دو اس نے کہا میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ صدر کانفرنس کی آمد کل صبح ہے۔ مولانا نے ملائمت سے اسے سمجھایا اور اپنے کیمپ میں لے جائے گئے۔ میں نے دوسرے دن مولانا سے کہا یہ آخر آپ وقتِ مقررہ سے قبل کیوں آ گئے۔ منتظمین بہت رنجیدہ ہیں۔ مولانا نے لاپروائی سے سر ہلایا اور کہا کہ یہ کوئی بات نہیں۔ مولانا حسرت موہانی اپنا خطبۂ صدارت بالشت کے کاغذ پر اردو میں چھپوا کر لائے تھے جس میں صرف اس بات پر دلیلیں پیش کی تھیں کہ ہندوستان میں مکمل آزادی بیرونِ حکومت برطانیہ ہونی چاہیے اور ڈومینین اسٹیٹس کی سخت مذمت کی تھی۔ بقیہ امور کے بارے میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کی رائے میں کانفرنس کو طے کرنا چاہیے اور صدر کا یہ منصب نہیں ہے۔ آزادیِ کامل کے لیے مولانا حسرت کا موڈ دیوانگی تک پہنچا ہوا تھا۔ ایک شخص جو عرصہ تک جیل میں رہ کر آیا تھا انقلابی تھا اور کہتا تھا کہ اسے جیل میں پیشاب پلایا گیا اس نے چند بھونڈے سے اشعار لکھے تھے جو موزوں بھی نہیں تھے مگر جن کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ زیر سایہ برطانیہ رہنا چاہتے ہیں وہ گویا زیر سایۂ شیطان رہنے پر راضی ہیں۔ مولانا حسرت کا حال یہ تھا کہ اچھل اچھل کر ہر شعر پر داد دے رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ ہندوستان کا عظیم ترین شاعر ایسے بھونڈے اور غیر موزوں اشعار کی داد کیوں دیتا ہے مدعا سے ہر جگہ لیے لیے پھرتے تھے اور مدح و ثنا کرتے تھے۔

دونوں جگہ کل لیڈران جاتے تھے۔ اژدہام خلائق کی کوئی حد نہ تھی۔ ہر ضلع سے نمائندے آئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی رعایت سے مجھے بھی کانگریس کے اجلاس میں پانچ منٹ تقریر کا موقع مل گیا تھا۔

مولانا آزاد نے خلافت کانفرنس میں اپنی افتتاحی تقریر میں کہا:۔

"اٹھارہ مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اس اٹھارہ مہینہ کے اندر تحریک خلافت کی کتنی منزلیں ہیں جو ہمارے سامنے آئیں اور ہم طے کر چکے ہیں۔ میں اس وقت مسئلۂ خلافت پر مقاماتِ مقدسہ پر ہندوستان کی آزادی پر جو مسلمانوں کے لیے ویسا ہی فرض ہے جیسا تحفظِ خلافت و دفاع۔ میں مناسب نہیں سمجھتا ہوں کہ ان مسائل پر کچھ عرض کروں۔ اس کے لیے آپ کے پاس خاموش گویائی موجود ہے جو آپ کے دلوں کو متوجہ کر سکتی ہے۔

میرٹھ میں خلافت کا جو جلسہ ہوا اس میں مہاتما گاندھی بھی شریک تھے۔ اس میرٹھ کے جلسے میں سب سے پہلے ترکِ موالات کا خلافت کمیٹی کی جانب سے بطور ایک عملِ دفاع بطور ایک امرِ احتجاج کے اعلان کیا گیا کہ اٹھارہ مہینے گزر چکے اب ہمارا اوّلین فرض ہے کہ ہم اپنے سفر کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک نظر ڈالیں کہ اب تک ہم نے کتنا سفر طے کیا ہے۔

اس امر پر نظر ڈالتے ہوئے آپ کو یہ حقیقت اپنے سامنے لانا چاہیے کہ مقصدِ خلافت کی مدافعت کے لیے جو میدان تھا وہ کون سا تھا۔ کیا وہ میدان وہ تھا جو ہندوستان کے رقبے سے باہر تھا یا اس کے علاوہ دوسرا میدان بھی تھا۔ اس بارے میں فی الحقیقت دو میدان تھے۔ پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کے لیے اوّلین قیام گاہ تھا وہ ہندوستان کے باہر کا میدان تھا۔ وہ عراق و شام کا الیشیائے کوچک و سمرنا کا نہ تھا جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا ہے۔ وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور اپنے ملک کی فتح و شکست کا تھا۔ جب تک آپ اسے فتح نہ کرتے دنیا کی کامیابی آپ کا استقبال نہ کر سکتی۔

"جب آپ کی تحریک محض اپنی زندگی کی ابتدائی گھڑیاں کاٹ رہی تھی جس وقت بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں زبانیں موجود تھیں جن پر خلافت کا نعرہ تھا لیکن کوئی متفقہ میدانِ عمل آپ کے سامنے نہ تھا۔ وہ ابتدائی گھڑیاں آج تحریک خلافت پر گزر چکی ہیں۔ اللہ کے فضل و رحمت نے اپنا دروازہ کھول دیا اور چند مہینوں کے اندر ہم نے یہ میدان فتح کر لیا اور جب دنیا کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ یہ محدود جماعت کی تحریک نہیں بلکہ ہندوستان کا متفقہ مسئلہ ہے۔

تحریک کی دوسری منزل یہ تھی کہ خلافت کے مسئلے پر سات کروڑ دلوں میں گھر نہ بناتی بلکہ تین کروڑ کے دلوں میں گھر بناتی۔ تحریکِ خلافت کی اس کامیابی میں خوبی یہ ہے کہ اس نے ایسے طاقتور

بنگالے کے ساتھ کل ہندوستان کے مسئلہ کو زندہ کر دیا جو چالیس سال کی کوشش سے ہندوستان کو نہیں ملا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریکِ خلافت کے ساتھ ہندوستان کا مسئلہ پوری قوت سے زندہ ہو گیا ہے۔"

مولانا نے مہاتما گاندھی کی تحسین کی کہ ممدوح پہلے ہی دن سے تحریکِ خلافت کے سب سے بڑے رفیق رہے ہیں اب اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کر دیا کہ تحریکِ خلافت کی روشنی نے ہندوستان کے چراغ کو روشن کر دیا۔ یہ مسئلہ خلافت کی دوسری فتحمندی تھی جو اس کو ہندوستان کے میدان میں حاصل ہوئی۔

# احمد آباد کانگریس 22 دسمبر 1921ء

دسمبر 1921ء کی آخری تاریخوں میں احمد آباد میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ سیشن منعقد ہوا۔ میں وہاں یو۔ پی کانگریس کے ایک ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک تھا۔ وہیں خلافت کانگریس بھی منعقد ہوئی۔ کانگریس نگر اور خلافت نگر بڑے وسیع پیمانہ پر بڑے وسیع میدان میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کھلے اجلاس کے لیے بہت دور تک دونوں کے لیے شامیانے لگے تھے۔ پنڈال کے باہر ٹھہرنے کے انتظامات تھے۔ نمائش کا الگ کیمپ تھا۔ دو ہزار کھدر میں ملبوس والنٹیر جن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی کام کر رہے تھے۔ یہ والنٹیر زیادہ تر گریجویٹ تھے۔ احمد آباد میں تعلیم بہت آگے جا چکی تھی۔ نمائش میں قریب چالیس ہزار آدمی آ سکتے تھے۔ کانگریس سیشن کے صدر سی آر داس تھے مگر وہ گرفتار ہو چکے تھے۔ ان کی قائم مقامی حکیم محمد اجمل خاں نے کی۔ صدرِ مجلس استقبالیہ ولبھ بھائی پٹیل تھے۔ کس طرح کاروباری انداز میں یہ سیشن منعقد ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ولبھ بھائی پٹیل نے صرف پندرہ منٹ میں اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور صدر کا خطبہ صرف بیس منٹ میں ختم ہو گیا۔

کھلا اجلاس جب نہیں ہوتا تھا تو باہر مختلف قسم کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ کہیں ایک ہزار کہیں دو ہزار آدمی جمع ہیں اور لیڈران قوم لکچر دے رہے ہیں۔ اس زمانہ میں مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی سے بہت قریب تھے اور وہ اکثر ان کے اصولوں کی مدافعت کیا کرتے تھے اور ان کے آشرم میں بھی رہ چکے ہیں۔

کانگریس نگر اور خلافت نگر دونوں میں باورچی خانے تھے۔ چائے اور ناشتہ کی بھی دوکانیں تھیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میں ایک دوکان کے اندر چائے پینے گیا تو منیجر نے کہا کہ مسلمان کو ہم یہاں چائے وغیرہ نہیں دیتے ہیں۔ بس میں ابل پڑا۔ میں نے کہا کانگریس نگر میں تم مسلمان ہندو کا فرق کرتے ہو۔ میں جاتا ہوں ابھی گاندھی جی سے شکایت کرتا ہوں۔ بس وہ لگا میری خوشامد کرنے اور آخر کار بڑی خاطر داری سے مجھے

چائے پلائی۔

اجلاس میں ایک لاکھ سے زائد آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ گاندھی جی نے کانگریس پلیٹ فارم سے انگریزی میں بھی ایک نہایت پرجوش تقریر کی جس سے سب لوگوں کے دل گرما گئے۔

خلافت کانفرنس میں بھی گاندھی جی کی تقریر ہوئی۔ وہ ننگے بدن صرف آدھی ٹانگ کی دھوتی یا لنگوٹی پہنتے تھے۔ کانگریس پنڈال میں بہت تیزی کے ساتھ داخل ہوئے۔ آتے ہوئے ایک آدمی کو ان کا پیر لگ گیا وہ رک گئے اور معافی مانگی۔ اس نے تو اسے اپنے لیے ایک نعمت تصور کیا ہوگا۔

مولانا حسرت موہانی چونکہ میرے اوپر بہت مہربان تھے میں ان کے ساتھ ہر جگہ چلا جاتا تھا اور کوئی نہیں روکتا تھا۔ میں سبجیکٹ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں بھی گیا۔ ایک کنارے دور بیٹھ کر کل کاروائی دیکھتا تھا۔ وہاں گاندھی جی نے کانگریس کا نصب العین سوراج اور ذریعہ حصول عدم تشدد وہ بھی قول و عمل اور خیال میں تجویز کیا۔

SWARAJ BY NON-VIOLENCE INWARD THROUGOUT DEED

ریزولیوشن انگریزی میں تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے سوراجیہ کی جگہ آزادیٔ کامل بیرون حکومت برطانیہ اور ذریعہ قول و فعل اور خیال میں عدم تشدد کی جگہ ہر ممکن ذریعہ سے رکھنے کی ترمیم پیش کی۔ مولانا حسرت موہانی نے آزادیٔ کامل کے لیے ایک مدلل اور پرجوش تقریر کی اور یہ بھی کہا کہ اگر کانگریس کا نصب العین آزادی کامل بیرون حکومت برطانیہ منظور نہیں ہوتا ہے تو میں کانگریس سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ مگر دوسری سانس میں ہنس کر کہا "اگرچہ میں مستعفی نہیں ہونگا" گاندھی جی نے کہا کہ ایسے شخص کو استعفیٰ دے ہی دینا چاہیے۔ حسرت کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد گاندھی جی نے جو تقریر کی وہ مجھے اب تک یاد ہے:۔

> "اگر مولانا آزادیٔ کامل کے لیے آگے بڑھیں گے تو میں ان سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ مگر اس کے لیے طاقت کی ضرورت ہے۔ میں تو آگرہ کے قلعہ پر کانگریس کا جھنڈا گاڑ سکتا ہوں اگرچہ وہاں ہٹلر جیسا پاگل گورنر ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے طاقت چاہیے۔ میں کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتا جس کو میں کر نہ سکوں یا جس کے کرنے کے لیے میرے اندر طاقت نہ ہو"

سبجکٹ کمیٹی میں مولانا حسرت کی ترمیم نامنظور ہو گئی۔ دوسرے دن مولانا حسرت موہانی نے قیامت مچا دی۔ برابر چھوٹے چھوٹے جلسوں میں پرشور تقریریں کرتے تھے کہ مسلمان خیال میں عدم تشدد رکھے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جہاد کا خیال ترک کر دے گا اور اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ گاندھی جی مسلمانوں کو جین مذہب کا پیرو بنانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے ایک جلسہ میں مولانا حسرت اپنا عصا میز پر رکھ کر تقریر کر رہے تھے کہ مولانا آزاد سبحانی

کھڑے ہوئے اور کہا کہ مولانا اگر خیال THOUGHT کو ارادہ INTENTION میں بدل دیا جائے تو آپ کو پھر تو کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔ مولانا حسرت نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور چل دیے۔ بعد کو وہ تنہائی میں مولانا آزاد سبحانی پر برس پڑے " آپ کو کیا ضرورت تھی خیال کو ارادے میں بدلنے کی تحریک کرنے کی" بات یہ ہے کہ یہ بات مشہور ہوگئی تھی اور گاندھی جی مضطرب تھے اور مولانا آزاد سبحانی گاندھی جی سے خیال کو ارادے میں بدلنے کی اجازت لے آئے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی نے ایک دن قبل مولانا حسرت اور گاندھی جی میں صلح کرا دی تھی اور مولانا حسرت راضی ہوگئے تھے کہ وہ دو سال تک گاندھی جی کے مزاحم نہ ہوں گے مگر پھر وہ بدل گئے تھے مولانا آزاد سبحانی نے مجھے یہ بات بتائی اور یہی جواب انھوں نے حسرت کو بھی دے دیا۔

میں نے مولانا حسرت سے کہا کہ آپ آج ہی آزادیِ کامل پر کیوں زور دیتے ہیں۔ گاندھی جی تو ٹھیک کہتے ہیں کہ کہنے سے کیا حاصل ؟ کر دکھانا ہے۔ اور جب قوم میں طاقت ہوگی تو وہ آزادی کامل کا نعرہ دیں گے مولانا حسرت نے کہا کہ تم سمجھتے نہیں ہو گاندھی جی گوکھلے کے شاگرد ہیں جو پکے ماڈریٹ تھے۔ یہ قوم کو ابھاریں گے اور پھر ڈومینین اسٹیٹس (نوآبادیاتی طرز) پر راضی ہو جائیں گے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پر آج ہی پابندی عائد کر دی جائے۔ مولانا حسرت کا یہ مغالطہ آخر عمر تک دور نہیں ہوا اور وہ مسلم لیگ میں بھی اسی لیے بعد کو شامل ہوئے کہ جناح اور گاندھی کو مل کر ڈومینین اسٹیٹس پر صلح کرنے سے باز رکھ سکیں جیسا کہ خود انھوں نے مجھ سے کہا۔ مولانا حسرت کا شبہ کس قدر غلط تھا وقت نے ثابت کیا۔

## مسٹر محمد علی جناح

میں ایک پھاٹک پر اپنا پاس دکھانے کے لیے لائن میں کھڑا تھا کہ ایک نہایت خوب صورت خاتون نیم برہنہ لباس میں آئیں اور اندر جانا چاہا۔ والنٹیر نے پاس مانگا تو انھوں نے انگریزی میں کہا میں مسز جناح ہوں۔ والنٹیر نے انگریزی میں بڑی لجاجت سے کہا "میں اپنے فرض کی انجام دہی سے مجبور ہوں کہ کسی کو بلا پاس جانے نہ دوں" اتنے میں بہترین سوٹ میں خود مسٹر جناح تشریف لائے۔ خاتون نے ان کی جانب مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا " جے (J)، یہ مجھ سے پاس مانگتے ہیں اور اندر جانے نہیں دیتے " مسٹر جناح نے نہایت خاموشی سے اپنا پاس ان کو دے دیا وہ اندر چلی گئیں اور خود اپنی نوٹ بک سے ایک پرچہ لکھ کر والنٹیر سے کہا کہ وہ ڈائس پر پہنچا دے۔ تب تک میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ دیکھا کہ پرچہ پہنچا اور ہل چل مچ گئی۔ خود حکیم اجمل خاں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی دیر میں مسٹر جناح ڈائس پر آگئے۔ یہ کانگریس میں ان کی آخری شرکت تھی۔ اس کے بعد وہ کانگریس سے مستعفی ہو گئے۔

ناز پروردۂ منعم نہ برد راہ بدوست    عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

گاندھی جی نے یو پی کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کو طلب کیا اور ان کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندو لنگوٹ اور مسلمان کہنی بند کرتا اور گھٹنا پاجامہ پہن کر دیہاتوں میں نکل جائیں۔ مولانا آزاد سبحانی نے کہا کہ گاندھی جی آپ جب اتنی بڑی قربانی مانگتے ہیں تو مقصد بھی بڑا ہونا چاہیے۔ آزادی کامل کو آپ تسلیم کر لیجئے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ مولانا کا خیال ہے کہ بڑی برائی کو روکنے کے لیے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے مگر میرا یقین ہے کہ چھوٹی برائی کو روکنے کے لیے بھی بعض اوقات بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اسی جلسہ میں گاندھی جی نے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ یو۔ پی کانگریس پر حسرت کا بڑا اثر ہے۔ آپ لوگ یا حسرت کو لے کر رہیں یا مجھ کو۔ دونوں کو لے کر نہیں رہ سکتے۔ ہرش چندر باجپئی جو بعد کو رفیع پارٹی کے ایک رکن رہے اور ایم۔ ال۔ اے ہوئے، اٹھے اور کہا کہ ہم لوگوں پر حسرت کا اثر نہیں ہے۔ گاندھی جی نے کہا آپ بیٹھ جائیے میں نے ایک حقیقت بیان کی ہے آپ سے رائے نہیں مانگی ہے۔ احمد آباد کانگریس ہی میں میں نے عباس طیب جی کو دیکھا جن کے بال برف کی طرح سفید تھے نوجوان لڑکیاں ان کو ہر دم گھیرے رہتی تھیں اور وہ اپنی لڑکی کو اپنے ساتھ درمیان میں نے مکبرہ پر سے گئے تھے جہاں سے انھوں نے ترانہ گایا تھا۔

# اندرا گاندھی

مختلف جلسے سیشن کے اوقات کے باہر میدان میں ہوا کرتے تھے، جن میں مختلف لیڈران تقریریں کرتے تھے ان جلسوں میں میں نے ایک چھوٹی سی لڑکی دیکھی جس کی عمر کا اندازہ اس وقت میں نے 6۔7 سال کیا۔ وہ گاندھی ٹوپی پہنے جہاں جاؤ دیکھو کہ بڑی ہی متانت سے خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ بی۔ اے میں میرا مضمون نفسیات (سائیکالوجی) تھا اور اس میں میں نے پڑھا تھا کہ سات سال سے کم عمر بچے سے یہ امید کرنا کہ وہ خاموش بیٹھے، سخت ظلم ہے۔ اس لیے مجھے اس بچی کی متانت اور سنجیدگی دیکھ کر حیرت ہوئی اور میں نے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ جواہر لال جی کی لڑکی اندرا ہے۔

# صلح کی بات

احمد آباد کانگریس میں یہ بھی مشہور تھا کہ وائسرائے گاندھی جی سے کہتے ہیں کہ صلح کر لیجیے۔ اور

مالوی جی نے ایک گول میز کانفرنس کی تجویز بھی پیش کی تھی جو مسترد ہو گئی تھی لیکن گاندھی جی نے کہا کہ ابھی صلح کا وقت نہیں آیا ہے کیونکہ ابھی ہندوستان نے کافی تکلیف نہیں اٹھائی ہے۔ یہ بھی کہا کہ ابھی قوم میں ڈسپلن نہیں ہے یہ تو میں نے بھی دیکھا کہ پنڈال کے اندر آتے جاتے لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں۔

احمد آباد کانگریس سے لوگ نئے عزم اور ولولے کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ لے کر واپس ہوئے۔ میں احمد آباد سے سیدھا لاہور اخبار زمیندار کی چیف ایڈیٹری کا چارج لینے روانہ ہو گیا۔

# احمد آباد کانگریس کے بعد

احمد آباد کانگریس کے بعد تحریک زوروں سے چلی۔ نہ گورنمنٹ گرفتاریاں کرنے سے تھکتی تھی اور نہ لوگ اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے سے تھکتے تھے۔ اخبارات پر چھاپے پڑتے تھے، پرچے ضبط ہوتے تھے، ایڈیٹر پرنٹر پبلشر گرفتار کیے جاتے تھے۔ دراصل یہ تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ ادھر اناطولیہ میں یونانیوں کے وحشیانہ مظالم کی روزمرہ خبریں آتی تھیں اور بچہ بچہ کو یقین تھا کہ یہ صرف برطانیہ کرا رہا ہے۔ اس لیے انگریز سے نفرت بہت ترقی کر گئی تھی۔ احمد آباد میں کام کو تیزی سے چلانے کے لیے کانگریس نے مہاتما گاندھی کو جملہ انتظامی اختیارات سونپ دیئے تھے۔

گاندھی جی سے لوگ سوال کرتے تھے جن میں بعض ہندوستان کے نامور لوگ اور بالخصوص معتدل طبقہ کے لیڈران تھے کہ آپ نے ایک سال کے اندر سوراجیہ دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک سال گزر گیا اب آپ کو کیا کہنا ہے۔ گاندھی جی نے ایک طویل اور مدلل جواب ینگ انڈیا میں شائع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سوراج تو ضرور نہیں ملا لیکن دماغ جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا آزاد ہو گیا ہے۔ یہ بھی لکھا کہ سوراج کے معنی گورنمنٹ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دلوں میں حقیقی تبدیلی پیدا ہو جانا ہے۔ صحیح ہندو مسلم اتحاد رونما ہو، لوگ چرخہ کاتنے لگیں اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہوں۔ اب گاندھی جی نے زوروں کے ساتھ آزادیٔ تحریر و آزادیٔ تقریر و آزادیٔ مطابع کا پروپیگنڈا بھی گورنمنٹ کی جابرانہ پالیسی کے مقابلے میں شروع کیا۔

# آل پارٹیز کانفرنس

گورنمنٹ کا جبر و تشدد ان لوگوں کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا جو حکومت کے مخالف نہ تھے اور تحریک ترکِ موالات کے حامی نہ تھے۔ چنانچہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح نے ایک آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں ۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو منعقد کی جس میں تین سو ڈیلیگیٹ آئے۔ حامیانِ ترکِ موالات کو بطور مدعوئین

خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ سر سنکرا نائر اس کانفرنس کے چیرمین قرار دیے گئے۔ این۔ سی کیلکر کی تجویز پر مہاتما گاندھی سب نارکانِ موالات کی طرف سے واحد مقرر تھے۔ بانیانِ کانفرنس نے ایک مسودہ گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان صلح کا مرتب کیا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے اور اس میں پنجاب خلافت اور سوراج کا مسئلہ زیر بحث آکر طے کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے کہا کہ کوئی گفتگو اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کل قیدی رہا نہ کر دیے جائیں۔ اس مسودہ میں علی برادران اور دوسرے قیدیوں کی رہائی کا ذکر نہیں ہے اسے ہونا چاہیے۔ اور گورنمنٹ کے جبر و ظلم کی مذمت ہونی چاہیے۔ کانفرنس کا رخ دیکھ کر چیرمین صاحب کرسی چھوڑ کر بھاگ گئے اور ان کی جگہ سر دیسوا سرن چیرمین بنائے گئے۔ 17 جنوری 1922ء کو آخری فیصلہ ہوا مسودہ میں جبر کی مذمت اور قیدیوں کی رہائی بطور شرط اولین شامل کر دی گئی۔ اس پر گاندھی جی نے عارضی طور پر تحریکِ ترک موالات کو ملتوی کر دیا۔ 18 جنوری 1922ء سے جناح صاحب اور مالوی جی تار پر تار وائسرائے کو دیتے رہے مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر کار 30 جنوری 1922ء کو ایک خط ملا جس میں وائسرائے نے ان شرائط کو ماننے سے مجبوری ظاہر کی تھی۔ اب تحریک پھر جاری ہو گئی اور یہ سب کوششیں بے سود رہیں۔

## بردولی میں پھر سول نافرمانی

29 جنوری 1922ء کو ولبھ بھائی پٹیل نے بردولی میں سول نافرمانی کے آغاز کرنے کی اجازت طلب کی چار ہزار نمائندوں کے سامنے، جن میں پانچ سو عورتیں بھی تھیں، پٹیل صاحب نے ایک سنجیدہ اور ٹھوس تقریر کی اور سب سے عدم تشدد کا حلف لیا۔ 31 جنوری 1922ء کو ورکنگ کمیٹی نے بردولی میں عام سول نافرمانی کرنے کی اجازت دے دی۔ بردولی کی آبادی 78 ہزار تھی۔ مہاتما گاندھی نے یکم فروری 1922ء کو وائسرائے کو الٹی میٹم دیا کہ پنجاب خلافت اور سوراج کا مسئلہ حل کیا جائے ورنہ بردولی میں عام سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔ 6 فروری 1922ء کو وائسرائے نے ایک کمیونک شائع کیا جس میں گاندھی جی کے مطالبات کو بدلائل ماننے سے انکار کر دیا۔ 7 فروری 1922ء کو گاندھی جی نے اس کا جواب دیا اور گورنمنٹ جو جبر و تشدد کر رہی ہے اور وائسرائے نے جس سے انکار کیا تھا اس کی مثالیں پیش کیں جو حسب ذیل تھیں۔

(1) کلکتہ میں ہنتوں پر گولی چلائی گئی۔

(2) سول گارڈس نے وحشیانہ سلوک پبلک کے ساتھ کیا۔

(3) ڈھاکہ اور علی گڑھ میں تمام پرامن جلسے زبردستی منتشر کیے گئے۔

(4) بہار کے بہت سے گاؤں لوٹ لیے گئے۔

(5) کانگریس اور خلافت کے والنٹیروں کو بہت جگہ شدت سے زدوکوب کیا گیا۔

(6) سون پور میں کھدر اور کانگریس اور خلافت کے دفتروں کے کاغذات جلا دیے گئے۔

(7) آدھی آدھی رات کو کانگریس اور خلافت کے دفتروں کی تلاشی لی گئی وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب خط وکتابت گاندھی جی بردولی سے کر رہے تھے جہاں وہ خود عام سول نافرمانی کی تیاری کے لیے موجود تھے۔ اب کل مسالہ تیار تھا صرف سگنل دینا تھا کہ ایک خطرناک رکاوٹ آگئی۔

## چوری چورا کا واقعہ

8 فروری 1922ء کے صبح کے اخبار میں گاندھی جی نے چوری چورا کے واقعہ کی تفصیل پڑھی جو 5 فروری کو پیش آیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ چوری چورا میں ایک پر امن جلوس نکلا اور ختم ہوگیا۔ بعد کو کچھ لوگوں سے اور کانسٹبلوں سے گرم گرم بات چیت ہوگئی۔ کانسٹبلوں نے بندوق سنبھالی اور فائر کرنا شروع کر دیا اور جب تک ایک کارتوس بھی باقی تھا گولی چلاتے گئے۔ جب گولی ختم ہوگئی تب بھاگ کر تھانہ میں پناہ لی۔ مجمع اس پر سخت مشتعل ہوگیا اور اس نے تھانہ کو گھیر لیا اور تھانہ کو آگ لگا دی۔ آگ لگانے پر کانسٹبلان باہر نکلے تو 22 کانسٹبلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور ان کے جسم کے ٹکڑے آگ میں پھینک دیے وہ جل کر خاک ہوگئے۔

گاندھی جی اس خبر کو پڑھ کر نڈھال ہو گئے۔ تحریک ان کی عزت کا معاملہ تھی اس کو روکنا اور ایسی حالت میں جب کہ وہ وائسرائے کو چیلنج دے چکے تھے بہت ہی تکلیف دہ بات تھی۔ وہ سوچتے رہے اور آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ شیطان کی آواز ہے وہ مجھے عزدر کی تعلیم دے رہا ہے۔

گاندھی جی نے اعلان کیا کہ بردولی کی سول نافرمانی ملتوی کی جاتی ہے۔ 16 فروری کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ خدا نے مجھے تین مرتبہ متنبہ کیا۔ اول بار جب رولٹ بل ایکٹ ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں احمد آباد، ویرگھام، امرت سر اور قصور نے تشدد پر عمل کر کے غلطیاں کیں اور میں خدا کے سامنے ذلیل ہوا میں نے تسلیم کیا کہ مجھ سے ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دوبارہ بمبئی میں اور اب چوری چورا میں یہ حادثے پیش آئے چنانچہ انھوں نے بطور تزکیہ نفس وسزا پانچ دن کے برت کا اعلان کیا۔

بردولی میں سول نافرمانی رد کئے کا ساتھیوں اور پیروؤں پر بہت اثر پڑا۔ ہر شخص تلملا رہا تھا جواہرلال نہرو نے جیل سے گاندھی جی کو احتجاج کے خطوط لکھے۔ سارے ملک میں مایوسی چھا گئی۔ محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری سابق ایڈیٹر ہمدرد نے جو حاجی بغلول کے نام سے مشہور ہیں اپنے خاص مزاحیہ انداز میں ایک استغاثہ مسماۃ بردولی مستغیثہ بنام مہاتما گاندھی ملزم بدرگاہ رب العلیٰ شائع کیا۔ چھوٹے بڑے اپنے پرائے سب

مضطرب تھے مگر گاندھی جی اپنی جگہ مطمئن تھے وہ سب کو جواب دیتے تھے کہ تحریک عدم تشدد کے ساتھ ہی چل سکتی ہے۔ اور قوم میں ابھی عدم تشدد پیدا نہیں ہوا۔ لوگ کہتے تھے کہ بردولی چوری چورا سے بہت دور ہے۔ بردولی نے کیا کیا تھا۔ گاندھی جی کا جواب تھا کہ صرف بردولی ہندوستان نہیں ہے۔ بردولی سے شروع کر کے پورے ملک میں یہی کام کرنا ہے۔ جب تک پورا ہندوستان تیار نہ ہو ایک جگہ عام سول نافرمانی کیا کر سکے گی۔

# گاندھی جی کی گرفتاری

تحریک میں اتنی تیزی آگئی کہ انگریز بدحواس ہو گیا اور اس نے اور سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند نے ایک دلخراش تقریر میں ہندوستان کو دھمکی دی کہ ابھی گورنمنٹ کے پاس کچلنے کا سامان موجود ہے اور متنبہ کیا کہ لوگ وفاداری کی طرف لوٹ آئیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی نے اس کا دنداں شکن جواب دیا اور ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو وہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے بعد گاندھی جی نے ایک بھجن سنا اور مولانا حسرت موہانی سے جو اتفاقاً آگئے تھے معانقہ کیا اور پولیس کی موٹر میں بیٹھ کر سبرامتی جیل روانہ ہو گئے۔ یہ عجیب اتفاق بھی حسرت کے لائحہ عمل پر لائق وجد ہے وہ عمر بھر گاندھی جی کی مخالفت کرتے رہے لیکن گاندھی جی کی ہر تحریک میں جیل گئے اور آج جب گاندھی جی کے بارے میں گورنمنٹ کی پالیسی بدلی اور وہ گرفتار کیے گئے تو حسرت صاحب وہاں موجود تھے اور گاندھی جی نے جیل جانے سے قبل ان سے معانقہ کیا۔ یہ معانقہ اس بات کی دلیل تھی کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ دونوں کے دلوں میں آگ سلگ رہی ہے۔ گاندھی جی کے ساتھ بنکر بھی تھے جنہیں گاندھی جی بہت مانتے تھے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو سبرامتی جیل سے گاندھی جی یرودا جیل بھیجے گئے اور وہاں بنکر کو گاندھی جی سے جدا کر دیا گیا۔

لندن کی بنچز آف ان BENCHES OF INN نے گاندھی جی کی بیرسٹری کی سند چھین لی جیل میں گاندھی جی کو اذیت دی جاتی تھی۔ روزانہ ان کی تلاشی لی جاتی تھی۔ اگرچہ وہ صرف ایک لنگوٹی پہنتے تھے۔ کمبل جھاڑ کر دیکھا جاتا تھا۔ ان کا برتن جیلر نے جوتے سے چھوا۔ سال میں ان کو صرف چار خط لکھنے کی اجازت ملی۔ انگریز اب اپنی شرافت ترک کر کے بزدلانہ انتقام پر اتر آیا تھا۔ گاندھی جی نے بحیثیت ستیہ گرہی سب کچھ برداشت کیا اور آخر کار حکام جیل نے معافی مانگی۔ ان کا جیر خدمتی دے دیا اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے لگے۔ یعنی ظلم کی تلوار سچائی اور اہنسا کی روحانی ضرب سے ٹوٹ گئی۔

انگریز یہ سمجھتا تھا کہ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد کوئی اور اتنا بڑا لیڈر نہیں ہے جو سارے ملک کو متاثر کر سکے لیکن کانگریس نے اپنا فرض پوری مستعدی سے ادا کیا۔ ۷ جون ۱۹۲۲ء کو آل انڈیا

کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کے سکریٹری راج گوپال آچاریہ تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو رہا ہو چکے تھے۔ وہ بھی شریک تھے حکیم اجمل خاں، موتی لال نہرو، راج گوپال آچاریہ، ڈاکٹر انصاری، ولبھ بھائی پٹیل اور کستوری رنگا آئنگر کی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی گئی کہ وہ 30 ستمبر 1922ء تک یہ رپورٹ دے کہ سول نافرمانی کو پھر کس طرح چلایا جائے۔ اوپر کے ناموں سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ہندوستان قیادت کے معاملہ میں تہی دست نہ تھا۔

اگست 1922ء میں گورو کے باغ کا واقعہ پیش آیا۔ اکالی دل سکھوں کا اصلاح یافتہ طبقہ تھا۔ یہ کل مٹھ پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ایک جگہ کے مٹھ راضی نہ تھے۔ گورنمنٹ ان کے ساتھ تھی۔ جتھا جاتا تھا اور اسے ڈنڈوں سے خوب مارا جاتا تھا اور وہ صرف "واہ گرو کی جے" کے نعرے لگاتے تھے۔ عدم تشدد کی اس شاندار مثال نے گاندھی جی کے فلسفہ کو بڑی طاقت دی اور بیرونی ممالک کے اخباری رپورٹر فوٹو لینے اور واقعات کا صحیح مرقع کھینچنے کے لیے دوڑ پڑے۔

30 ستمبر 1922ء کو کانگریس کی مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ تیار ہوئی اور سی۔ آر داس کو جو کانگریس کے صدر تھے، دی گئی۔ رپورٹ کا منشا یہ تھا کہ سول نافرمانی ناقابلِ عمل ہے۔

20 اکتوبر 1922ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ صوبائی کمیٹیاں اپنی ذمہ داری پر انفرادی سول نافرمانی کی اجازت دے سکتی ہیں۔ عام سول نافرمانی منظور نہیں ہوئی۔ دراصل گاندھی جی کے سوا اور کون اسے جاری کر سکتا تھا۔

دسمبر 1922ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ سیشن گیا میں ہوا۔ وہاں یہ تجویز پیش ہوئی کہ کونسلوں میں داخل ہو کر اندر سے اسے توڑا جائے۔ سی۔ آر داس نے اس کی تائید کی مگر یہ کہا کہ اگر خلافت کانفرنس اختلاف کرے گی تو کونسل کے داخلہ کو منظور نہیں کیا جائے گا۔ راج گوپال آچاریہ نے تجویز پیش کی کہ مکمل ترک موالات قائم رکھا جائے اور خلافت کانفرنس نے مکمل ترک تعاون ہی کی تجویز منظور کی۔ راج گوپال آچاریہ کی تجویز 1740 ووٹوں کی حمایت اور 890 ووٹوں کی مخالفت سے پاس ہوگئی۔ کانگریس نے یہ طے کیا کہ 25 لاکھ روپیہ جمع کیا جاوے اور پچاس ہزار والنٹیر بنائے جائیں۔

## گاندھی اور مالویہ

ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں میں گاندھی جی کی ایک سال میں سوراج دلانے والی اسکیم پر یقین اور اعتقاد میں تذبذب بزدولی کی سول نافرمانی ملتوی کرنے کے وقت ہی پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگوں نے علانیہ

کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اکثر لوگ زیرِ لب بڑبڑاتے تھے کہ جب پورا ہندوستان فرشتہ بن جائے گا تب ہم منزل کی جانب کوچ کریں گے۔ یہ کب ہوگا؟ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے ایک گوشہ کے واقعہ سے دوسرے گوشہ کو کیا تعلق ہے۔ کسی کو یہ بھروسہ نہ ہوتا تھا کہ کبھی ایسا ہوگا کہ پورے ہندوستان میں کہیں ایک پتہ نہ ہلے۔ خاص کر جبکہ گاندھی جی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ مخالف بھی اگر تشدد کا باعث ہو تب بھی ذمہ داری ان کی ہے کیونکہ تحریک وہ چلا رہے ہیں۔ یہی وجوہ تھے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد موتی لال نہرو اور سی آر داس نے داخلہ کونسل کا پروگرام بنایا اور گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد جب حکومت پر یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ تحریک حکومت کی سخت گیری سے جس میں ان کے سب سے بڑے لیڈر کی گرفتاری بھی شامل ہے، دب نہیں سکتی اور کانگریس نے انفرادی سول نافرمانی کی اجازت صوبہ کانگریس کمیٹیوں کو دی۔

گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد ہی پنڈت مدن موہن مالوی میدان میں اُتر آئے اور انھوں نے سارے ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔ وہ تحریکِ ترکِ موالات کی اپنی خودساختہ تعبیر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ترکِ موالات کی اسکیم میں عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ شامل ہی نہیں ہے۔ یہیں سے ہندوستان میں چار سیاسی پارٹیاں ظہور پذیر ہوئیں:۔

(۱) وہ لوگ جو گاندھی جی کے سچے پیرو تھے اور جن کا عقیدہ ترکِ موالات، عدم تشدد، کھادی اور ہندو مسلم اتحاد پر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ تحریک کا رنگ و رخ جو گاندھی کا نکھارا ہوا تھا غیر مبدّل رہے۔

(2) کانگریس کے وہ لوگ جو گاندھی جی کی اسکیم سے اکتا چکے تھے اور کونسلوں کے اندر داخل ہوکر 1919ء کے مضحکہ خیز اصلاحات کو اندر سے توڑنے کے خواہشمند تھے ان میں ممتاز ہستیاں سی۔ آر داس، موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں وغیرہ کی تھیں۔

(3) انڈی پنڈنٹ جس میں مسٹر محمد علی جناح، پنڈت مدن موہن مالوی وغیرہ تھے۔ یہ لوگ وائسرائے اور گاندھی جی میں صلح کرا کے کام استوار کرنے پر مصر تھے۔

(۴) معتدل (ماڈریٹ) جن میں سر تیج بہادر سپرو، مسٹر چنتامنی، سر شنکرا نائر وغیرہ تھے جو انگریز کے زیرِ سایہ حکومت اور آہستہ آہستہ اصلاحات اور ترقی پسندانہ قانون سازی کو ذریعہ بتلاتے ہیں۔

پنڈت مدن موہن مالوی جی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے ان کا دامن ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک تھا۔ ہندو دھرم کے ایک سچے اور باوفا پیرو ہوتے ہوئے ان پر تعصب یا تنگ نظری کا الزام کبھی عائد نہیں ہوا۔ ان کی خدمات بھی عظیم تھیں اور بنارس ہندو یونیورسٹی ان کے پرشکوہ کارناموں کی باشوکت مثال تھی۔ ان کا لحاظ اور خیال گاندھی جی بھی کرتے تھے مگر ان کے خیالات انتہاپسندانہ کبھی نہیں رہے البتہ وہ انتہاپسندی کی مخالفت پر

بھی کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی کوششیں صرف اصلاحِ حالات تک محدود رہیں۔

گاندھی جی کی عدم موجودگی میں پنڈت مالوی کے دورے اور ترک موالات کی الٹی تشریح سے جس خطرے کا اندیشہ ہوسکتا تھا وہ بہر حال پیش نہیں آیا۔ گاندھی جی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ جمالیا تھا۔

# کونسلوں میں داخلہ

سی۔ آر داس اور موتی لال نہرو نے یکم جنوری 1923ء کو سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی اور یہ کہہ کر رکھی کہ یہ کانگریس کے اندر ایک پارٹی ہوگی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ کونسلوں کو اندر سے توڑا جائے اور جب کانگریس میں اس پارٹی کی اکثریت ہو جائے گی تو وہ پھر کام کرے گی۔ مولانا حسرت موہانی نے کلکتہ جاکر داس اور نہرو سے میل کر لیا اور اخبارات نے صفحۂ اول پر اسے موٹی موٹی سرخیوں سے درج کیا۔

یکم مئی 1923ء کو مولانا آزاد کانگریس کے صدر ہوئے۔ ستمبر 1922ء میں کانگریس کا اسپیشل سیشن دلی میں ہوا۔ اس وقت مولانا محمد علی رہا ہو چکے تھے اور اس جلسہ میں شریک تھے۔ اس اجلاس میں کونسلوں کا داخلہ منظور ہو گیا۔

سی آر داس اور موتی لال کا اتحاد کامیاب رہا۔ سوراج پارٹی الیکشن لڑی۔ کئی صوبوں میں اس نے اکثریت حاصل کرلی اور سنٹر میں آدھی سیٹیں جیت لیں۔

# ترکی کا حال

نومبر 1922ء مصطفیٰ کمال نے ترکی کے ایک جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا اور سلطان وحید الدین کو معزول کر دیا جو ایک انگریزی جہاز پر مالٹا بھاگ گئے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن    بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اب سلطان عبدالمجید خاں ان کی جگہ خلیفہ مقرر کیے گئے۔ مگر ایک جمہوریہ کے ساتھ ایک بے اختیار سلطان کا بحیثیت خلیفۃ المسلمین کیا جوڑ ہوسکتا ہے۔ اور یہیں سے ہمارے ملک میں بحثیں شروع ہوئیں جن میں اکابرین علماء و زعماء نے حصہ لیا۔

## 1923ء

# شبہات ــــ کانگریس میں اختلاف آراء

گاندھی جی ابھی جیل ہی میں تھے کہ رفتہ رفتہ ہر مرحلہ پر ان کی تعلیمات کو دھکا لگنا شروع ہوا۔ حکیم اجمل خاں، سی، آر داس، موتی لال نہرو وغیرہ تحریک کی اس شرط سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ متفق نہ تھے کہ سول نافرمانی کو تمام ہندوستان کے یک قلم عدم تشدد پر عمل پیرا ہو جانے پر منحصر کیا جائے۔ درحقیقت بردولی کی سول نافرمانی کو روکنے کا جو فیصلہ گاندھی جی نے کیا تھا اس سے ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا لیڈر متفق نہ تھا۔ مگر سول نافرمانی اور پھر عام سول نافرمانی کا ضلع بہ ضلع اجراء کرنا گاندھی جی کے سوا کسی دوسرے کے بس کی بات بھی تو نہ تھی۔ لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اگر ملک کے کسی حصہ میں بلوہ ہو جائے تو سول نافرمانی ملک کے دوسرے حصہ میں بالکل روک دی جائے گی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ سول نافرمانی ایک قطعی ناقابلِ عمل چیز ہے کیونکہ حکومت کے لیے کسی ایک جگہ بلوہ فساد کرا دینا کون سا مشکل کام ہے۔ اور یوں بھی اتنے بڑے ملک کا ایک دم مطمئن ہو جانا بعید از قیاس ہے۔ اس لیے داس اور موتی لال نے یہ سوچا کہ صحیح نمائندوں کے نہ ہونے سے مظلومین کی فریاد لیجانے والا کوئی نہیں ہے۔ بھاری بھاری ٹیکس لگائے جا رہے ہیں اور عوام سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اب اس وقت کا انتظار کرنے کے بجائے کہ جب سارا ہندوستان عدم تشدد پر عمل پیرا ہو جائے گا بہتر ہے کہ ہم کونسلوں اور مرکزی کونسل میں گھس کر نااہل لوگوں کو نکال دیں اور اندر سے ان اصلاحات کو توڑ دیں اور اس راستہ سے آزادی کی منزل کی جانب رواں ہوں۔ اس طرح ترکِ تعاون اور ترکِ موالات سول نافرمانی حتیٰ کہ سودیشی بھی۔ الغرض گاندھی جی کی کل تنظیم و تعلیم پیچھے رہ گئی اور لوگ الیکشن لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

دوسرا سانحہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد کو کئی طرف سے سخت دھکا لگا۔ ایک تو بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلم دنگے شروع ہو گئے جن سے اتحاد پرزے پرزے ہو گیا۔ دوسرے ضلع آگرہ میں ملکانہ راجپوت شہر آگرہ کے آس پاس رہتے تھے جو عرصہ ہوا مسلمان ہو چکے تھے۔ 1923ء میں آریہ سماج نے ان کی شدھی کرنے اور ان کو از سرِ نو ہندو بنانے کا فیصلہ کیا اور جوق در جوق لوگ شدھی ہونے لگے۔ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک آگ لگا دی اور مذہبی جوش جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ بہت سی تبلیغی جماعتوں نے اطرافِ ہند سے مقابلہ کا کام کرنے، لوگوں کو شدھی ہونے سے روکنے اور جو شدھی ہو چکے تھے ان کو مشرف بہ اسلام کرنے کا کام شروع کیا۔ اس تحریکِ شدھی کے لیڈر سوامی شردھانند جی تھے جو تحریکِ ترکِ موالات کے ابتدائی دور میں

جامع مسجد دلی میں مؤذن کے کٹہرے پر سے تقریر کر چکے تھے۔ اس سے مسلمانوں میں بڑی آزردگی پیدا ہوئی اور اس سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو کسی حال میں مل جل کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ علمارِ حق نے بڑی کوشش کی کہ یہ مسئلہ باعثِ نزاع نہ بنے۔ مولانا ابوالکلام آزاد خود آگرہ گئے اور وہاں سے واپس آکر لاہور ایک بیان دیا جو اخبار زمیندار لاہور کے ۱۶ اپریل 1923ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ مولانا نے فرمایا:۔

"ہندوستان میں ہر شخص اور ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ جائز اور با امن طریقہ سے اپنے مذہب کی اشاعت و تبلیغ کرے۔ اعتقاد اور پسند کی آزادی انسان کا قدرتی حق ہے۔ انسان نے اپنے بہت سے حقوق کی طرح یہ حق بھی کھو دیا تھا۔ تیرہ سو برس ہوئے قرآن نے از سرِ نو اس کا اعلان کیا۔
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

مولانا نے اس طرح یہ تعلیم دی کہ جہاں تک نفسِ مسئلہ کا تعلق ہے مسلمانوں کو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر معترض ہوں بلکہ چاہیے کہ وہ اپنا فرض انجام دیں۔ لیکن مولانا نے یہ بھی لکھا کہ ملکانہ میں جو ہو رہا ہے وہ بطور ایک تحریک کے ہے اور جن لوگوں نے اس کا آغاز کیا ہے انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کر دیا ہے۔ لوگوں کو اس وقت ان تمام باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو ملک کے جذبات اور توجہ کو ملکی اتفاق اور مشترک جدوجہد سے ہٹا کر کسی اشتعال انگیز مقصد کی طرف لے جائیں۔

یہ ہوشمندانہ دانشورانہ اور غیر جانبدارانہ مشورہ نہ ہندوؤں کی سمجھ میں آیا نہ مسلمانوں کی۔ چنانچہ پنجاب میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اس کے مقابلہ میں "تبلیغ اور تنظیم" کی تحریک شروع کر دی اور ملک کی کل طاقت اسی نزاع میں صرف ہونے لگی۔

میں نے اخبار زمیندار میں ایک سلسلہ مضامین اس پر لکھا جس میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ کس طرح مسلمان کلمہ تک سے ناواقف ہیں۔ ایسی جگہیں ہیں جہاں کوئی نمازِ جنازہ پڑھنے والا نہیں ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ علمار کی ایک جماعت مسلمانوں کی اصلاح میں لگ جائیں اور قومی کام جو ہو رہا ہے اسی طرح ہوتا رہے اور جو جماعتیں کر رہی ہیں وہ کرتی رہیں۔ یہ ایک علیحدہ تعمیری کام ہے جو خالص مذہبی رنگ میں کیا جائے۔ اخبار ہفتہ وار "الامان" جس کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین تھے اور جو میرے کرم فرما تھے وہ اس سے شدت سے اختلاف کرتے تھے اور دونوں اخباروں میں مضامین کا سلسلہ جاری رہا آخر کار "الامان" نے تسلیم کیا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل شعر لکھا تھا ؎

فیصلۂ عدلیٔ پر آخرِ کار ہے عمل          مان گیا ہے "الاماں" ، بھی آپ کے اجتہاد کو

اس کے علاوہ بنگال کی تشدد انگیز انقلابی پارٹیاں جو گاندھی جی کی وجہ سے دب گئی تھیں وہ ابھر آئیں اور انھوں نے ڈکیتی لوٹ اور تشدد کا بازار گرم کر دیا۔

اس طرح ہر چہار جانب سے گاندھی جی کے فلسفہ سے عملاً انحراف شروع ہو گیا۔

# گاندھی جی کی رہائی

جیل کے اندر گاندھی جی کی آنتوں میں پھوڑا نکل آیا۔ وہ پونا کے سلیون اسپتال منتقل کیے گئے وہاں ان کا آپریشن ہوا صحت کی خرابی کے باعث وہ 5 فروری 1924ء کو رہا کر دیے گئے اور 10 مارچ 1924ء کو وہ جوہو صحت بنانے چلے گئے۔ اپریل کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے ینگ انڈیا کا چارج لیا اور ہندو مسلم اتحاد پر مسلسل مضامین لکھتے رہے 19 جون 1924ء کو انھوں نے کانگریس کی تنظیم نو کا پروگرام بھیجا جو 27 جون 1924ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوا۔ وہاں گاندھی جی نے جو منظر دیکھا اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے اور 30 جون 1924ء کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا کہ مجھ کو شکست ہو گئی اور میں شرمندہ ہوں۔ انھوں نے اجلاس کے آخر میں بڑی دلگیری کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں تمام لوگوں کا رنگِ رخ خوب دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ ادھر امیٹھی سنبھل اور گلبرگہ میں بلوے ہو چکے تھے اب کوہاٹ میں بڑا زبردست ہندو مسلم بلوہ ہوا۔

گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے 18 دسمبر 1924ء کو 21 دن کے برت کا اعلان کیا۔

# ملاپ کانفرنس

اس کے نتیجہ میں ایک ملاپ کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ملک کے تمام ممتاز لیڈر شریک ہوئے کانفرنس کے صدر موتی لال نہرو تھے۔ ایک حصہ بانس سے الگ گھیرا ہوا تھا۔ اس میں تمام لیڈر بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے آرام کرنے کا یا باہمی گفت و شنید تنہائی میں کرنے کا انتظام تھا۔ دوسری جانب تمام پبلک کو آنے اور بیٹھنے کی اجازت تھی۔ میں مولانا عبد الحلیم اور مولانا محمد عرفان کے ساتھ (دونوں میرے رفیق اور جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں تھے) برابر شریک رہا۔ اس کانفرنس میں مختلف مسائل زیر بحث آئے اور سب پر بحث و گفتگو کے بعد اتفاق رائے ہو گیا۔ اس طرح اس وقت گویا تمام ہندو مسلم مسائل طے ہو گئے تھے۔

جس دن گائے کی قربانی پر بحث آنے والی تھی اس کے ایک دن قبل تمام مسلم لیڈر حکیم اجمل خاں

کے مکان پر جمع ہوئے اور وہاں یہ طے ہوا کہ سب مسلمان لیڈر چپ بیٹھے رہیں اور جب سب لوگ کہہ لیں تو صرف مفتی کفایت اللہ جواب دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ جیسے ہی جلسہ شروع ہوا مولانا مظہرالدین کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ایک مہمل سی تقریر کر دی۔ اس کا تو کسی نے لحاظ نہیں کیا کیونکہ ان کی کل ہند پوزیشن ہی نہ تھی۔ لیکن مولانا محمد علی نے یہ ضابطہ توڑ دیا اور ایک تقریر کے دوران کہہ دیا کہ "اگر ہندو میری بیوی یا میری ماں کی عصمت دری کریں تب بھی میں ہندوؤں سے نہیں لڑوں گا"۔ اس جملے سے مسلمانوں میں بڑا خلجان پیدا ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر ٹھہر گیا دیکھا کہ حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی سے کہہ رہے ہیں کہ جب یہ طے ہو گیا تھا کہ کوئی تقریر نہیں کرے گا تو آپ نے کیوں تقریر کی۔ مولانا محمد علی جھلا گئے اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کہا "میں ایسا ذلیل نہیں ہوں کہ آپ مجھے ڈانٹیں" میں یہ جواب سن کر سکتہ میں رہ گیا۔ عصر کی نماز کے لیے مولانا عرفان، مولانا عبدالعلیم، مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے قریب کی مسجد میں گئے وہاں ہُو کا عالم تھا۔ مولانا مدنی نے دریافت کیا کہ نماز عصر کا کیا وقت مقرر ہے۔ تو ان دونوں نے (جو ان کے مرید بھی تھے) کہا کہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے جب لوگ آجاتے ہیں نماز ہو جاتی ہے۔ مولانا مدنی مسکرائے اور کہا کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ نماز باجماعت پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا ہے۔ وہاں مولانا عبدالعلیم نے یہ بھی مولانا مدنی سے کہا کہ مولانا محمد علی نے اپنی بیوی کی عصمت دری کے بارے میں کہا تو خیر مگر ماں کے لیے کیوں کہا کیونکہ وہ تو ہم سب کی بھی ماں ہیں۔ مولانا مدنی پھر مسکرائے اور کہا کہ ان کو بھی تو آپ کہہ دیں گے کہ ہماری بہن ہیں۔ گویا کہ کسی اشتعال میں نہیں آئے اور ٹال گئے۔ یہ ٹال جانا مولانا محمد علی کی زندگی میں ناپید تھا۔

کانفرنس نہایت سادگی کے ساتھ منعقد ہوئی کوئی آرائش نہ تھی خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت میں بھی وقت نہیں لگایا گیا۔ براہ راست کام کی باتیں شروع ہوئیں۔ پہلی تجویز یہ مندروں کے گرائے جانے پر آئی۔ فوراً کسی صاحب نے یہ ترمیم پیش کر دی "مساجد کا لفظ مندروں کے بعد بڑھا دیا جائے"۔ اس پر گرم بحثیں ہونے لگیں مولانا ابوالکلام آزاد کھڑے ہوئے اور انھوں نے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ایک حرف "ابھری ہوئی" حقیقتیں ہیں (نمایاں کا سہل ترجمہ "ابھری ہوئی" پہلی مرتبہ ہم لوگوں نے مولانا آزاد کی زبان سے سنا اور تعجب کیا) جن صاحب نے یہ ترمیم پیش کی وہ کسی مسجد کے گرائے جانے کی مثال نہ پیش کر سکے اور ترمیم واپس لے لی۔

بڑا معرکہ اس دن ہوا جب گائے کی قربانی کا مسئلہ پیش ہوا۔ مسلمان سب خاموش رہے۔ پٹیل لنگوٹی پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی ہندو ہوں۔ گائے میرے نزدیک مقدس اور متبرک ہے لیکن مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ گائے کے بارے میں ہم اپنا عقیدہ مسلمان بھائیوں پر

زبردستی تھوپیں۔ البتہ اگر وہ خود برضا و رغبت اسے ترک کردیں تو بہتر ہے۔ اس کے بعد لالہ لاجپت رائے کھڑے ہوئے اور انھوں نے طنزیہ انداز میں تقریر شروع کی اور کہا کہ میں ہندوؤں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آج ان میں ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ کل مجھ سے پٹیل جی نے کہا تھا کہ میں ہندو نہیں ہوں اور آج کہہ رہے ہیں کہ میں ہندو ہوں۔ لالہ جی نے مکمل امتناعِ گاؤکشی کی تجویز پیش کی۔ پنڈت مدن موہن مالوی جی نے ایسی شستہ اردو میں تقریر کی کہ ہم سب محوِ حیرت رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ درمیانی راستہ بہتر ہے۔ جہاں کہیں قربانی ہوتی ہے وہاں ہندو کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں اور نہ قانونی جبر ڈالا جائے لیکن جہاں نہیں ہوتی ہے وہاں مسلمان نئے سرے سے گائے کی قربانی نہ کریں۔ کچھ اور تقریروں کے بعد مفتی کفایت اللہ نے بڑی مدلل تقریر کی اور ذبیحہ گاؤ اور قربانی گاؤ کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمان گائے کا ذبیحہ بالکل بند کر دیں۔ بحث ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پنڈت مالوی جی مولانا کفایت اللہ صاحب سے کہہ رہے تھے کہ "مولانا ذرا غور کیجیے۔ اس پر نظر دوڑائیے کہ ہم ہندوؤں کے جذبات گائے کے بارے میں کیا ہیں پھر بھی ہم اس پر راضی ہیں کہ جہاں گائے کی قربانی ہوتی ہے ہو اور اس پر بھی راضی ہیں کہ قانون سے کہیں روکا نہ جائے۔ جب ہم اس حد تک جھک رہے ہیں تو آپ بھی اپنی جگہ سے کچھ ہٹیے۔ آخر اس میں آپ کو کیا قباحت ہے کہ آپ یہ تسلیم کریں کہ جہاں نہیں ہوتی ہے نہ ہو ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں آج تک گائے کی قربانی ہوئی نہیں صرف انہیں جگہوں پر آپ برضا و رغبت آئندہ بھی نہ کریں۔" مفتی صاحب پہلے تو اڑے مگر اڑنے کی گنجائش کہاں تھی۔ آخرکار مان گئے۔ اور پنڈت مالوی کی تجویز پاس ہو گئی۔ افسوس ہے کہ بعد میں کوئی اس پر قائم نہ رہا اور شاید اس عہد کو توڑنے کی پہل مسلمانوں ہی نے کی۔

کانفرنس میں سی آر داس موجود نہ تھے۔ ان کو کلکتہ تار دیا گیا اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے۔ سنا کہ پہنچتے ہی پوچھا کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ گاندھی جی برت رکھ رہے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے راستہ کی رکاوٹیں دور کرنی ہیں۔ داس نے جواب دیا کہ گاندھی اپنے ضمیر کی آواز پر برت رکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے وہ کسی کے کہنے سے اس کو روک نہیں سکتے۔ رہا ہندو مسلمان کا معاملہ تو میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان میری کیا ضرورت ہے۔ دوسری ٹرین سے واپس آ گئے۔ الغرض اسی طرح بہت سے نزاعی امور پر بحث رہی اور آخرکار کل مسائل اتفاق رائے سے طے ہو گئے مگر اختلاف کی جڑیں زیادہ گہری تھیں۔ صرف مسجد کے سامنے باجہ، دنگا فساد، گائے کی قربانی وغیرہ فروعی مسائل پر بحث آئی اور بظاہر اتحاد قائم ہو گیا جو دیرپا ثابت نہیں ہوا۔

# خلافت کانفرنس بلگام

بلگام میں 24 دسمبر 1924ء کو خلافت کا اجلاس ہوا اور 26 دسمبر 1924ء کو یہیں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ مہاتما گاندھی اس اجلاس کے صدر تھے۔ بڑی مشکل سے ان کو صدارت قبول کرنے پر راضی کیا گیا تھا۔ خلافت کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ 30 دسمبر 1924ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں مسٹر جناح نے مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کی اسکیم پیش کی تھی۔ مسٹر جناح کا فرقہ پرستی کی جانب یہ پہلا قدم تھا۔ اس سے پہلے وہ مشترکہ انتخاب کی تائید میں فرمایا کرتے تھے کہ " اگر مسلمان سیاست میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو وہ صدر دروازے سے آئیں نہ کہ عقبی دروازے یعنی کھڑکی سے۔

بلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں 27 دسمبر 1924ء کو ہندو مہاسبھا کا بھی اجلاس ہوا جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالوی نے کی۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالوی جی نے دعویٰ کیا کہ ہندو مہاسبھا کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔

بلگام میں آخر کار گاندھی جی نے سپر ڈال دی اور گاندھی نہرو داس معاہدہ تیار ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کر لیا جائے اور چرخہ کاتنا ممبری کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔ گاندھی جی نے ترکِ موالات کو خیر باد کہا اور اپنے آشرم میں واپس چلے گئے۔

16 جون 1925ء کو سی۔آر۔داس کا انتقال ہوگیا جس کا پورے ہندوستان نے ماتم کیا۔ اور 16 جولائی 1925ء کو گاندھی جی نے کانگریس کا کل انتظام پنڈت موتی لال نہرو کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ 22 ستمبر 1925ء سے سوراج پارٹی کانگریس بن گئی۔

یہ ایک درمیانی وقفہ ہے جس کا نام گاندھی جی نے MASTERLY INACTIVITY ————— ماہرانہ تعطل) رکھا تھا اور ان کا یہ بھی منشا تھا کہ لوگ بہت تکلیف اٹھا چکے کچھ دنوں آرام کرلیں۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو خود شناسی اور آزادی کی امنگ کی جس راہ پر ڈال دیا تھا وہاں سے واپس ہونے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ بلگام کے جلسہ میں گاندھی جی کی جیت ہوئی تھی۔ مگر انھوں نے آبدیدہ ہوکر یہ کہا تھا کہ ان عظیم رفیقوں کے بغیر کیا کام ہو سکے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی آنکھیں نم تھیں۔ گاندھی جی نے خود جو سپر ڈال دی وہ ان کی دسعت قلبی تدبّر کی مہارت حقیقت پسندی اور اخلاص کا پتہ دیتی ہے۔ گاندھی جی اپنے دیدۂ بینا سے یہ دیکھ رہے تھے کہ پھر بگل بجے گا اور ان کی ٹڈی دل فوج پھر جمع ہوگی اور پھر دار و رسن کی دعوت دی جائے گی۔

## تیرھواں باب

# خلافت کا خاتمہ

مصطفیٰ کمال نے وحید الدین خاں کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید خاں کو خلیفہ مقرر کیا اور ترکی کو ایک یورپین طرز کی جمہوریہ قرار دے کر سیاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ یہ واقعہ یکم نومبر 1922ء کو پیش آیا۔ 3 مارچ 1924ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور ترکی دیگر حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح ایک دنیوی حکومت رہ گئی۔ اس واقعہ نے ہندوستان میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑا دی۔ اور وہی مصطفیٰ کمال جو مسلمانوں کا اب تک ہیرو تھا لعن و طعن کا نشانہ بننے لگا۔ کچھ لوگ اس حد تک تجاوز کر گئے کہ اسے اسلام سے منحرف بلکہ اسلام کا دشمن قرار دینے لگے۔ وفادارانِ حکومت اور انگریز کے پٹھو اخبارات کی خوب بن آئی۔ وہ خوب بغلیں بجاتے اور مضحکہ اڑاتے تھے کہ آخر یہ سب کرنے سے کیا حاصل ہوا۔

گاندھی جی جب جیل سے رہا ہو کر آئے تو ان سے بھی لوگوں نے یہی سوالات کیے۔ گاندھی جی نے اپریل 1924ء کے پہلے ہفتہ میں ینگ انڈیا کا چارج لے لیا تھا اور اولین فرصت میں انھوں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا:

اگر میں کوئی پیغمبر ہوتا اور مجھے غیب کا علم دیا گیا ہوتا اور میں جانتا کہ تحریکِ خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔

گاندھی جی کے یہ زرّیں الفاظ ان لوگوں کے تمسخر کا کافی و شافی جواب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے تحریکِ خلافت شروع کرنے میں ایک بھیانک غلطی کی تھی۔ گاندھی جی جن کا اصول سچائی تھا اور جو کبھی حق گوئی سے انحراف نہیں کرتے تھے، تحریکِ خلافت کو ہندوستان کی بیداریِ عوام کا سبب قرار دیتے ہیں اور تحریکِ خلافت

کی حمایت میں بس یہ کافی ہے۔

مسلمانوں کا جوش و خروش بدستور قائم تھا۔ خلافت کمیٹیاں کام کر رہی تھیں، جلسے ہو رہے تھے اور کوشش کی جا رہی تھی کہ مصطفی کمال اپنا فیصلہ بدل دیں۔ اپنے کو تسکین دینے کے لیے علم و ذہانت کی پوری طاقت لگ رہی تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس عظیم حادثہ کے بعد ہی ایک مضمون "النبا العظیم" کے عنوان سے لکھا جو خلافت بمبئی اور زمیندار لاہور میں باقساط شائع ہوا۔ یہ مضمون اگرچہ عزل خلافت ہی سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس میں خلافت کے سلسلہ کے بہت سے مسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ جہاں تک نفسِ مسئلہ عزلِ خلافت کا براہ راست تعلق ہے ہم مولانا کی عبارت درج کرتے ہیں:۔

"اسلامی خلافت سے مقصود در اصل حکومت ہے اور خلیفہ وہ ہے جو اس حکومت کا رئیس ہو . . . اب غور کرنا چاہیے کہ خلافت کی موقوفی سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ آئندہ سے ترکی حکومت موقوف کر دی گئی یا آئندہ سے ترکی حکومت ایک مسلمان حکومت نہیں رہے گی؟ کیونکہ یہی دو صورتیں خلافت کی منسوخی ہو سکتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ترکی کی مسلمان حکومت اب بھی موجود ہے

"انھوں نے ترکی حکومت کو جمہوریت کے نظام میں بدل دیا تھا تو اسلامی نقطۂ خیال سے یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان مطلوبات میں سے تھا جن کا صدیوں سے مصلحینِ اسلام کو انتظار تھا لیکن اس کے بعد یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ حکومت سے الگ خلیفہ کا ایک منصب قرار دیا جائے . . . اگر اسمبلی عثمانی خاندان کے خلاف نہ ہوتی تو چاہیے تھا کہ جمہوریہ کے صدر عبدالمجید ہوتے۔ اگر وہ اس کے خلاف تھی تو چاہیے تھا کہ جو صدر منتخب ہوتا وہی خلیفہ ہوتا۔ اس کے کوئی معنی نہ تھے کہ اسلام میں پوپ کے روحانی تاج و تخت کا ایک نیا ہیکل تیار کیا جائے۔

"گزشتہ سال جنوری میں جیل سے رہا ہوا تھا۔ (یہ مضمون ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ہے) اور ایسوسی ایٹڈ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے کہا تھا کہ اسلام میں پوپ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اور ضروری ہے کہ اس معاملہ پر نظر ثانی کی جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند نے اس کے خلاف کوئی علانیہ مظاہرہ نہیں کیا کیونکہ ترک ابھی ابھی جنگ سے نکلے تھے۔ صلح کی گفت و شنید مکمل نہیں ہوئی تھی۔ مخالفین ان کی ہر مخالفت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے مصلحت کے خلاف تھا کہ ان کے خلاف عام لوگوں میں ایجی ٹیشن پھیلایا جائے۔ ضرورت تھی کہ اندرونی طور پر اصلاحِ حال کی کوشش کی جائے اور آئندہ کے لیے ایک اسلامی نظام قرار پائے۔ چنانچہ اسی غرض سے طے پایا تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا وفد انگورہ جائے۔ اس کے

اغراض و مقاصد میں اولین مقصد اسی غلطی کی اصلاح تھی۔ علاوہ بریں پرائیویٹ طور پر بھی اعیان انگورہ کو ان کی غلطی پر برابر متنبہ کیا گیا چنانچہ جنوری ۱۹۲۵ء سے اس وقت تک متعدد مراسلات بعض اعیان حکومت کے نام بھیج چکا ہوں اور ان کے عذرات و توجیہات معلوم کر چکا ہوں۔"

مولانا نے نامہ نگار کے ایک سوال کے جواب میں کہ "کیا اب ترکی میں اسلامی خلافت باقی نہیں رہی" جواب دیا کہ :-

"مجھے تعجب ہے کہ میرا اتنا لمبا چوڑا بیان سن کر بھی آپ اسلامی خلافت کا صحیح تخیل پیدا نہ کر سکے۔ خلافت سے مقصود اسلامی حکومت ہے۔ جس وقت تک ترکی میں خود مختار حکومت باقی ہے اور اسے مسلمان حکومت ہونے سے انکار نہیں اس وقت تک اسلامی خلافت بھی وہیں ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری خود مختار طاقت اور مسلمان حکومت موجود نہیں۔ خلافت کوئی مجرد منصب نہیں کہ معزول یا موقوف ہو جائے۔ وہ ایک واقعہ ہے یعنی اسلامی حکومت کی موجودگی۔ جب تک یہ واقعہ غیر واقع نہ نہ ہو جائے ہم اس کے وجود سے کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔ البتہ اس صورت میں ہمارا اعتقاد یہ ہوگا کہ موجودہ خلافت ایسے لوگوں کے قبضہ میں آگئی ہے جو ایک سخت غلطی اور گمراہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور خلافت کا نظام صحیح نہیں رہا۔ اور اس لیے تمام عالم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح اور درستگی کی کوشش کریں۔"

آج پچاس سال کے بعد جب ہم یہ بیان پڑھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی مایوسی میں مولانا یا تو اپنے آپ کو تسکین دے رہے تھے یا ملتِ اسلامیۂ ہند سے مایوسی دور کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ جو دلیلیں مولانا نے دی ہیں وہ ایک لمحہ کا منطقی تجزیہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ ترکوں نے اگرچہ اپنے دستور میں یہ لکھ دیا تھا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہوگا۔ لیکن صرف اتنا لکھ دینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ جس نہج پر انگورہ کی حکومت چل رہی تھی اس سے یہ اندازہ کر لینا چنداں دشوار نہ تھا کہ اب وہاں کی حکومت اسلامی حکومت نہ ہوگی۔ مثلاً بہ یک جنبشِ قلم دینی امور اور اوقاف کی وزارتیں موقوف کر دی گئیں اوقاف کا صیغہ وزارت مال کے سپرد کر دیا گیا۔ اور دینی تعلیم کا انتظام وزیر تعلیم کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ قدیمی دینی مدارس جو قسطنطنیہ اور دیگر شہروں کی مساجد میں قائم تھے توڑ دیے گئے۔ اگرچہ عصمت پاشا نے ان امور کی تاویل کی اور مولانا نے بھی یہی سوچا کہ یہ محض اصلاحات ہیں لیکن وہ یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے کہ میں ترکی کی برسرِ اقتدار جماعت سے اس میں اصلاحات کے لیے کچھ زیادہ خوش آئند توقعات نہیں رکھتا۔"

صرف اس لیے کہ حکومت ترکیہ کے سربراہ مسلمان تھے ترکی اسلامی حکومت نہیں ہو سکتی تھی چہ جائیکہ خلافت جس کا

اصل کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ بقول مولانا آزاد چونکہ دنیا میں کوئی دوسری خود مختار مسلم حکومت موجود نہیں ہے اس لیے ایک حکومت ترکی جو باقی رہ گئی ہے وہ خواہ مخواہ مرکز خلافت بن جائے۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں تھا کہ کوئی خود مختار مسلم حکومت روئے زمین پر موجود نہیں تھی افغانستان کی خود مختار حکومت عالم وجود میں آچکی تھی۔ الغرض یہ محض لفظی کھینچ تان تھی اور اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اکابرین ملتِ اسلامیہ پر یاس و حرمان ناکامی و نامرادی کی بجلی گری تھی اور وہ اسے بیک لخت تسلیم کر لینے کے بجائے اپنی تسکین کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ ایک بڑی چیز جو مولانا آزاد نظر انداز کر گئے وہ اماکنِ مقدسہ کی حفاظت اور آزادی کا مسئلہ تھا۔ عرب باغی ہو چکے تھے اور ترک اپنے وجود کی پریشانی میں عرب پر تسلط کا مطالبہ ہی نہیں کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی جب لندن وفد لے کر گئے تو انھوں نے وہاں اس نکتہ کو بہت اجاگر کیا تھا اور اس بات کا زبردست مطالبہ کیا تھا کہ عراق عرب یعنی اماکنِ مقدسہ ترکوں کے تصرف میں رکھے جائیں۔ لائیڈ جارج کا جواب یہ تھا کہ عرب اندرونی آزادی چاہتے ہیں اور وہ ترکوں کی ماتحتی میں رہنا نہیں چاہتے تو ان کو کس قانونِ انصاف سے اس پر مجبور کیا جائے۔ مولانا محمد علی کا جواب یہ تھا کہ ان کو اندرونی آزادی دے دی جائے لیکن ترکی کا اقتدار نہ چھینا جائے۔ اسی لیے جب لائیڈ جارج سے وہ مایوس ہوئے تو انھوں نے عرب لیڈروں سے رابطہ پیدا کیا اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اپنا موقف بدل دیں اور اندرونی آزادی کے ساتھ ترکوں کے زیرِ اقتدار رہیں۔ مولانا محمد علی کے دلائل کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ ان کا مذہبی جوش ان کی شخصیت ان کے اصرار کا طریقہ اور ان کے منطقی دلائل سب کو مبہوت کر دیتے تھے اور ظاہری طور پر لوگ کہہ دیتے تھے کہ واللہ باللہ ہم خلافتِ مرکزیہ اسلامیہ کے خلاف نہیں ہیں اور کبھی شریف مکہ اور کبھی امیر فیصل کا یہ اعلان اخبار میں آجاتا تھا کہ ہم خلافت کے خواستگار نہیں ہیں اور اس غیر متعلق بات کو لوگ خوب پھیلاتے تھے لیکن اصل مسئلہ سے یعنی یہ کہ وہ ترکی کے زیرِ اقتدار رہنے پر راضی ہیں ہمیشہ اجتناب اور فرار ہی رہا۔ اس لیے ترکی میں خلافت کے قیام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ڈاکٹر کے کرو جر اپنی کتاب کمالسٹ ٹرکی اینڈ دی مڈل ایسٹ کے صفحہ 24 پر لکھتا ہے کہ:۔

ترکی نے 1922ء کے نومبر میں سلطانی کو منسوخ اور ترکی کو آزاد جمہوریہ قرار دیا اس کے اسباب حسب ذیل تھے:

(1) ہندوستانی مسلمان فوجیں شام فلسطین اور خاص کر میسوپوٹامیہ میں اپنے ہم مذہبوں سے عیسائی افسران کی ماتحتی اور نگرانی میں لڑیں اور ایک واقعہ بھی بغاوت یا عدول حکمی کا پیش نہیں آیا۔

(2) زار کے روس میں مسلمان جبریہ فوج میں بھرتی سے بری تھے لیکن قازان تاتاری شروع جنگ عظیم سے آخر تک انقصائے قاف کے محاذ پر جو ترکی کے لیے موت و حیات کی جنگ تھی ترکوں کے خلاف

اور روسیوں کی جانب سے اسی طرح لڑتے رہے۔ یہاں بھی کوئی واقعہ بغاوت یا عدول حکمی کا پیش نہ آیا۔

(۳) عرب جو سلطنتِ عثمانیہ کی آبادی کے سب سے بڑے جزو تھے جنگِ عظیم کے آغاز کے پہلے سے ترکوں کو پریشان کر رہے تھے اور پوری قوت سے ترکوں کے خلاف دولِ متحدہ کے ساتھ لڑتے رہے اگر خلیفہ کا حکم نافذ ہوتا تو شام فلسطین میسوپوٹامیہ اور ممالک عرب اتنی آسانی سے ان سے چھین نہ لیے جاتے۔

(۴) مسئلہ خلافت محض خیال میں رہ گیا تھا۔ اس کا کوئی ماننے والا باقی نہیں تھا۔ صرف وہی لوگ اس کو مانتے تھے جو اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے اس لیے قدرتاً مصطفیٰ کمال نے سلطانی اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

# احیائے خلافت اسلامیہ کی ایک اور کوشش

عزلِ خلافت کے بعد ہندوستان میں خلافت کمیٹیاں قائم رہیں اور یہ اسکیم بنتی رہی کہ حکومتِ انگورہ کو مشورہ دیا جائے وہاں وفد روانہ کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ خلافت کو قائم کریں۔ ان لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ خود مصطفیٰ کمال کو خلیفۃ المسلمین بنا دیا جائے لیکن یہ سب خواب تھے جو نہ شرمندہ تعبیر ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔

انگریزوں نے عالمِ اسلامی کی رائے عامہ کے دباؤ سے نجد اور حجاز پر حکم برداری قائم نہیں کی اس کامیابی میں ہندوستان کی تحریکِ خلافت کا کافی حصہ تھا اور یہ اصل طرۂ امتیاز تحریکِ خلافت کی خدمتِ اسلام کا تھا۔

۱۹۲۴ء میں نجد کے شہزادہ عبدالعزیز نے حجاز پر حملہ کر کے طائف اور مکہ پر قبضہ کر لیا۔ نجد کے شہزادہ عبدالعزیز کے خاندان اور شریف مکہ کے خاندان سے پرانی عداوت تھی۔ اب شریف مکہ کے خلاف جو عام بیزاری پیدا ہوئی تو اس کا فائدہ شہزادہ عبدالعزیز کیوں نہیں اٹھاتے۔ اور فوراً ہی یا کچھ دنوں کے اندر وہاں کے تمام بزرگوں کے مزارات مع مقابر کے ساتھ مآثر بھی ڈھا دیے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مزار بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا روضہ بھی گرا دیا گیا۔ غدار شریف حسین کی ہزیمت سے سب کو خوشی ہوئی تھی اور اب مولانا محمد علی نے یہ امید قائم کی کہ حجاز میں عالمِ اسلامی کے مشورے سے ایک حکومت الٰہیہ قائم کی جائے اور اسی کو مرکز خلافت قرار دیا جائے۔ اور چونکہ اماکن مقدسہ سب یہیں تھے اس لیے یہ بات مناسب نظر آتی تھی۔ یہ امید اس لیے بھی قائم ہوئی تھی کہ سلطان عبدالعزیز نے اعلان

کیا تھا کہ ان کو حکومت کی خواہش نہیں ہے۔ شریف حسین کے نکل جانے کے بعد مسلمان جس کو چاہیں امیر منتخب کرلیں۔ ہمارے ملک کے مسلمان رہنما جو دوسری اسلامی سلطنتوں کو مشورے دینے میں انتہائی فیاض واقع ہوئے تھے شہزادہ عبدالعزیز کو صلاح دی کہ وہ خلافتِ الٰہیہ حجاز میں قائم کریں اور وہاں ایک جمہوری حکومت بنائی جائے۔

شاہ معین الدین احمد لکھتے ہیں:۔

"حجاز میں سلطان عبدالعزیز کے قبضہ کے بعد یہ خبر مشہور ہوگئی کہ نجدی فوجوں نے طائف میں قتلِ عام کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس" کا روضۂ اطہر مسمار کر دیا ہے۔ مکہ پر بھی مظالم کیے ہیں اور یہاں کے مشاہد کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے۔ نجدیوں کے بعض عقائد سے عام مسلمان پہلے سے بدگمان تھے اس لیے اس خبر سے اور تشویش بڑھ گئی اور جمعیتہ الخلافت نے حرمین کے تحفظ ان کے احترام اور قیام امن کے لیے سلطان عبدالعزیز شریف علی جمعیتہ الاقوام برطانیہ اور دوسری طاقتوں کو تار دیے [1]

یہ ملحوظ رہے کہ شریف حسین اپنے لڑکے شریف علی کے حق میں دستبردار ہوگئے تھے اور شریف علی نے جدہ میں جاکر قیام کیا تھا۔

شریف علی نے جواب دیا کہ وہ خود حجاز میں امن وامان چاہتے ہیں اور محض حرم کو خونریزی سے بچانے کے لیے وہ مکہ سے جدہ چلے آئے ہیں۔ اور یہ خواہش کی کہ کوئی شخص درمیان میں پڑ کر دونوں میں صلح کرادے اور سلطان عبدالعزیز نے اپنا مقصد سلطان شریف حسین اور ان کی ذریت سے حجاز کو پاک کرنا بتایا تھا انھوں نے جواب دیا کہ "میرا مقصد مکہ معظمہ پر قبضہ نہیں ہے بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابلِ برداشت ٹیکسوں سے نجات دلانا اور مہبط وحی والہام میں شریعت کا احیاء اور احکام الٰہی کا نفاذ ہے۔ مکہ سے جملہ مسلمانانِ عالم کا تعلق ہے اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق طے ہوگی۔ ہم ان سب کی نمائندہ کانفرنس مکہ میں منعقد کریں گے اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی جس سے بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اعزاض کی تحریکوں سے محفوظ ہو جائے"[2]

بس اس اعلان کا ہونا تھا کہ عاشقِ اسلام وفد ائے خلافتِ الٰہیہ مولانا محمد علی جوشِ مسرت میں آپے سے

---

[1] حیات سید سلیمان ص 23

[2] حیات سید سلیمان ص 23

باہر ہوگئے اور سلطان عبدالعزیز کی پرزور حمایت شروع کر دی۔ اس حمایت میں ان کے ہمنوا وہ تمام لوگ تھے جو غیر مقلدانہ خیالات رکھتے تھے۔ لیکن بریلوی حضرات خواجہ حسن نظامی خانقاہوں کے پیر اور خود ان کے پیرومرشد حضرت مولانا عبدالباری ان کے خلاف ہوگئے۔ مولانا حسرت موہانی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ ہوکر ایک زبردست محاذ قائم کر دیا۔ اب مولانا محمد علی تھے اور یہ دنیا بھر کی مخالفتیں۔ اگر وہ اپنی زبان اور قلم پر ذرا قابو رکھتے تو بات اتنی نہ بگڑتی مگر ان کی یہ فطرت نہ تھی۔ زبردست معرکہ پیدا ہوا اور مولانا محمد علی کو وہابی کا لقب بھی عطا ہوگیا۔ اب جو قبتوں کے انہدام کی خبریں آئیں تو پورا ہندوستان ماتم کدہ بن گیا۔ شیعہ حضرات نے بڑے زور و شور سے زنجیری ماتم لکھنؤ میں کیا۔ آخر حکومت کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنی پڑی۔ صفی لکھنوی نے لکھا ؎

مدینہ ڈھایا مکہ ڈھایا نجدی بدخصالوں نے وہ کافر بھی نہ کرتے جو کیا اسلام والوں نے

مولانا عبدالماجد بدایونی جو ہندوستان کے ممتاز علماء اور قائدین تحریکِ خلافت میں تھے کہتے تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی چکی سلطان ابن سعود نے توڑ ڈالی۔ اس چکی سے کیا بت پرستی ہوتی تھی۔ اگر لوگ ازراہ محبت اسے چومتے تھے تو یہ توحیدِ اسلام پر ضرب کس طرح ہے اور ماناکہ ہے تو جرمنی کے ہاتھ ایک کروڑ روپیہ میں بیچ دیتے توڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی جو ایک محقق اور روشن خیال علماء میں متصور ہوتے تھے سلطان ابن سعود کے سامنے جو تقریر کی اس سے اندازہ ہوگا کہ جذبات کی گہرائیاں کیا تھیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"مذہبی حیثیت سے مقابر و مآثر کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ مقابر کی تعمیر و بنا کے متعلق احادیث و فقہ میں ممانعت کے صریح الفاظ ملتے ہیں لیکن مآثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرامؓ سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا تمام دفتر خالی ہے۔ البتہ ان مآثر میں اگر جاہل مسلمان ایسے اعمال کریں جو خلاف شرع ہوں تو دوسری چیزوں کی طرح حکومت کا فرض ہے کہ وہاں نگراں یا پولیس کے سپاہی مقرر کرے جو زائرین کو ان اعمال سے باز رکھیں۔"

مولانا محمد علی کا عذر یہ تھا کہ سلطان عبدالعزیز کی عدم موجودگی میں یہ قبے گرا لئے گئے ہیں اور ان کو کوئی علم اس کا نہیں ہوا۔ اب مسائل کی بحث چلی۔

(۱) کیا مزارات پر قبے بنانا جائز ہے؟

(۲) اگر ناجائز ہے اور بن گئے تو کیا ان کا گرانا جائز ہے؟

(3) اور اگر گرا دیے گئے تو کیا پھر ان کا بنانا جائز ہے؟

مارچ 1926ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے معارف کے شذرات میں لکھا۔

"گزشتہ ملکی تحریک سرد پڑ جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں پھر فرقہ آرائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی گرم بازاری ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے تو گویا نجد و حجاز کی جنگ خود ہندوستان میں ہو رہی ہے وہاں اگر تیغ و تفنگ کی لڑائی ہے تو یہاں حلق و زبان و دست و قلم کی معرکہ آرائیاں ہیں۔ وہاں اگر یہ مسئلہ سیاسی اور وطنی حیثیت رکھتا ہے تو یہاں دین و مذہب کی۔ مگر اے کاش ہماری قوم کو یہ معلوم ہو سکتا کہ ہم جن کی تائید میں مذہبی دلیلوں اور حجتوں سے جذبات ابھار رہے ہیں ان کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت ہے۔"

جمعیۃ خلافت نے ایک وفد علامہ سید سلیمان ندوی کی قیادت میں روانہ کیا جس کے اراکین مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری بھی تھے۔ اس طرح یہ وفد پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتا تھا۔ مگر شریف علی نے جمعیۃ خلافت کی اس تجویز کو کہ حجاز میں اسلامی جمہوری حکومت عالم اسلامی کی رائے سے قائم ہو نامنظور کر دیا اور وفد کو آگے جانے کی اجازت نہ دی اور وفد واپس آیا۔

نجد و حجاز کی لڑائی جاری تھی اور ہندوستان میں گرم بحثیں ہو رہی تھیں کہ اچانک مستند خبر رساں رپوٹر نے یہ خبر دی کہ سلطان عبدالعزیز نے مدینہ منورہ میں روضۂ مبارک پر گولہ باری کر دی ہے۔ اب تو ایسا ہنگامہ پیدا ہوا جو مولانا محمد علی کے بھی مان کا نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ اصل حالت کی جانچ وہاں جو وفد مقیم ہے اس سے کرائی جائے مگر کون سنتا تھا۔ بالآخر یہ پتہ چلا کہ روضۂ مبارک پر نہیں مدینہ منورہ میں کسی دوسری جگہ اثنائے جنگ میں گولہ باری ہوئی تھی مگر یہ سب تحقیق تو بعد کو ہوئی۔ اس زمانہ میں سلطان ابن سعود سے مخالفت بہت بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ ایک جماعت غدار شریف حسین کی پرزور طرفدار ہو گئی ان میں بریلوی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین آگے آگے تھے۔ خیر یہ جماعت تو زیادہ موثر نہ ہو سکی لیکن مولانا عبدالباری جن کا تمام ہندستان میں بڑا وزن تھا میدان میں آ گئے اور ان کے ساتھ مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا نثار احمد کانپوری وغیرہ تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی، ظفر الملک چودھری خلیق الزماں۔ دونوں کا مرکز لکھنؤ تھا۔ چنانچہ عبدالباری کے ایما سے ایک انجمن خدام الحرمین قائم ہوئی۔ اس انجمن میں شیخ مشیر حسین قدوائی سید جالب دہلوی بھی شریک تھے۔ ارباب فرنگی محل تو تھے ہی جو بذات خود بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک عظیم الشان جلسہ رفاہ عام میں کیا اور دل کھول کر سلطان ابن سعود کو برا بھلا کہا۔ اور جب بعدہٗ مولانا محمد علی نے وہاں جلسہ کرنا چاہا تو وہ کامیاب نہیں ہوئے اور مجمع نے ان کی تقریر سننے سے

دوبار دو جلسوں میں انکار کر دیا۔ اللہ اللہ۔ یہ وہی محمد علی ہیں جن کے لیے قوم آنکھیں بچھاتی تھیں چراغاں کرتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلم قوم کو مخاطب کر کے کیا خوب فرمایا:۔

"تم جس تیزی سے دوڑ کر آتے ہو اسی تیزی سے فرار بھی کر جاتے ہو پس نہ تمہاری تحسین کی کوئی قیمت نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ تم نہ دل رکھتے ہو نہ دماغ۔ وساوس ہیں جنھیں افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جنھیں عزائم کہتے ہو"

اس بحث و تکرار کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ اودھ میں دو خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئیں۔

سلطان عبدالعزیز کو جمعیۃ خلافت نے تار دیا تو انھوں نے جواب دیا کہ مقابر و آثار و مشاہد کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ان کا مقصد حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنا نہیں ہے بلکہ حرم کی تطہیر اور شریف حسین کے مظالم سے اہل حجاز کو نجات دلانا ہے۔ حجاز پر قبضہ کے بعد وہ دنیائے اسلام کے مشورے سے حکومت کا نظام بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے دعوت نامہ بھی جاری کر دیا ہے۔ ایک وفد ہندوستان سے موتمر اسلامی کے انعقاد کی تجویز لے کر گیا۔

بحثیں اور گفتگوئیں جاری رہیں آخر کار رجب 1925ء تک عبدالعزیز نے کل حجاز کو فتح کر لیا تو قاہرہ کے ایک تار مورخہ ۵ جنوری 1926ء سے اچانک اہالیان ہند کو معلوم ہوا کہ ابن سعود نے ملک النجد والحجاز ہونے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ 24 اکتوبر 1924ء کو خلافت کمیٹی کی تجویز کا جواب سلطان ابن سعود یہ دے چکے تھے کہ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ بہر حال پھر بھی سلطان عبدالعزیز نے مصر، بیروت، شام، فلسطین، سوڈان، عسیر، نجد، یمن، روس، ترکی، افغانستان، جاوا اور ہندوستان کو دعوت نامے جاری کیے۔ ہندوستان میں دعوت نامے تین جماعتوں کو بھیجے گئے تھے جمعیۃ علماء ہند جمعیۃ خلافت اور اہلحدیث کانفرنس۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء کا وفد مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں تیار ہوا اس کے اراکین مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید اور مولانا عبدالحلیم تھے۔ جمعیۃ خلافت کے وفد کے رئیس علامہ سید سلیمان ندوی اور اراکین مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

اس وفد کے اراکین مئی 1926ء میں جدہ پہنچے دوسرے دن مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ 27 کو سلطان سے ملاقات ہوئی۔ حسب عادت مولانا محمد علی نے پرزور بے باک اور جذباتی تقریر کی مگر واضح ہو گیا کہ عبدالعزیز سلطان نجد و حجاز بن چکے ہیں اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوگا۔ 30 مئی کو مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی کفایت اللہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی پھر سلطان سے ملے اور کہا کہ مدینہ منورہ کے مقابر و مشاہد کے متعلق ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ موتمر اسلامی کے فیصلے کے بغیر ان کے بارے میں کوئی اقدام نہ کیا جائے

کا لیکن ان کی خلاف ورزی کی گئی اور دنیائے اسلام کے جذبات کے خلاف اس کے استصواب کے بغیر ان کو منہدم کر دیا گیا۔ سلطان نے جواباً کہا کہ اگر ہم مزارات کو منہدم نہ کراتے تو ہماری قوم باغی ہو جاتی اور ان کا یہ مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا۔ سلطان نے یہ بھی کہا آپ نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے میں بھی دل سے یہی چاہتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری قوم سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے متعصب قبائل نے دھمکی دی کہ ہم نے جہاد میں اپنا جان و مال قربان کیا تھا کہ مراسم شرک کا استیصال اور قرآن و سنت کو قائم کیا جائے اس لیے جلد سے جلد ان عمارتوں کو منہدم کر دیا جائے ورنہ ہم خود ان کو گرا دیں گے۔ اس دھمکی کے بعد ہمارے لیے دو صورتیں تھیں یا ان کو بزور روکتے یا گرانے کی اجازت دے دیتے۔ پہلی صورت میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا دوسری صورت میں فتنہ و فساد کا جس سے اہل مدینہ کو بھی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا اور دوسری جماعتوں کو بھی صدمہ پہنچتا۔ ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا بلکہ خدا اور رسول کے حکم اور کتاب و سنت کے مطابق تھا۔ اس لیے میں نے قاضی القضاۃ سے خواہش کی کہ وہ خود مدینہ جا کر اس کام کو انجام دے دیں جو چیز خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے۔ اس میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔

سلطان کا یہ بیان اُس بیان سے قطعی مختلف اور بالکل متضاد تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں بلا ان کے علم و اطلاع کے ایسا ہوا ہے اور جس پر مولانا محمد علی نے پورا قلعہ تعمیر کیا تھا۔

مولانا محمد علی کے دل میں تو آگ جل رہی تھی۔ بڑی امیدوں سے وہ یہاں آئے تھے۔ ان کی غرض تھی کہ یہاں اسلامی جمہوری حکومت قائم ہو جائے اور مزارات اور قبے پھر بنا دیے جائیں۔ لیکن یہاں یہ حال ہوا کہ:

بڑی آرزو تھی گلی کی تری سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دونوں میں ناکامی دیکھ کر وہ ابل پڑے۔ حق گوئی سے باز رہنا تو ان کا شیوہ ہی نہ تھا اور اسی لیے تمام عمر بھگتتے رہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے سلطان سے کہا کہ "آپ سے دنیائے اسلام کی بڑی توقعات تھیں اور وہ آپ کو ملک الحجاز کے منصب سے کہیں زیادہ جلیل القدر منصب پر دیکھنا چاہتے تھے۔ سلطان اس چھوٹے سے منصب پر کیوں راضی ہو گئے اور انھوں نے اس کو کیوں اپنا مطمح نظر بنایا۔ اردو کا یہ شعر

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گوہر نہ ہوا تھا

پڑھ کر کہا کہ وہ قطرہ جو صدف میں جا کر موتی بننے پر قانع ہے۔ پیرس کی رقاصہ کے گلے کی زینت بھی بن سکتا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ سلطان وہ قطرۂ آب ہوں جو ایک مسلمان کی آنکھ سے آنسو بن کر روضۂ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر گرایا جائے۔" مولانا سید سلیمان ندوی نے مآثر اور مقابر کے فرق کو پھر نمایاں کیا اور حاشیہ

کے حوالہ سے مآثر کے قیام دبقا کی ضرورت واضح کی۔ یہ تقریر اتنی عالمانہ فاضلانہ اور پرمغز تھی کہ اس کا جواب کسی سے نہ بن پڑا۔ سلطان نے کہا کہ میں مذہبی عالم نہیں ہوں۔ اس بات کو آپ مجلس علماء میں پیش کیجیے۔

چنانچہ 31 مئی 1926ء مجلس العلماء کا انعقاد ہوا۔ یہاں علامہ رشید رضا مصری نے سلطان کی مدح وثنا میں تقریر کی اور پھر ہر چہار جانب سے یہی سلسلہ شروع ہو گیا اور علامہ سید سلیمان ندوی نے جو مذہبی اور علمی بحث چھیڑی تھی اس کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ نہ جواب دیا اور نہ بحث کی مثل مشہور ہے کہ کامیابی سے زیادہ کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔ حکومت بنا لینے کے بعد انھیں کسی کی کیا فکر تھی۔ مگر اس کو نظرانداز کر دینے کی اہانت مولانا محمد علی برداشت نہ کر سکے تلملا اٹھے اور ایک پرزور تقریر کی۔ کہا کہ:

"ہم اس کتاب وسنت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ آپ ملوکیت چھوڑ کر جمہوریت اختیار کیجیے اور قیصر وکسریٰ کی سنت کے بجائے صدیق وفاروق کی سنت کو تازہ کیجیے۔"

یہ نعرہ مستانہ کتنا عجیب اور کتنا بہادرانہ تھا۔ مولانا عبدالعلیم مفتی کفایت اللہ نے دوسرے فرقوں کے ساتھ رواداری برتنے پر تقریریں کیں۔ ان تقریروں سے سلطان اور قاضی القضاۃ بہت مشتعل ہو گئے۔ اور معاملہ کی کیا نوعیت ہے سب پر ظاہر ہو گئی لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً اسی طرح اجلاس ہوتے رہے۔ تقریریں ہوئیں۔ کچھ تجویزیں منظور ہوئیں جو بہر حال مفید تھیں لیکن قیام خلافت وقیام نظام جمہوریت کا اصل مقصد ناکام رہا اور وفد ناکام ونامراد آخر جولائی 1926ء میں واپس آیا۔ مولانا محمد علی کی یہ آخری کوشش جس کے لیے انھوں نے اپنوں اور بیگانوں کی طنز وتضحیک برداشت کی برباد ہو گئی اور دنیا میں قیام خلافت کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا لیکن خلافت کمیٹی پھر بھی باقی رہی۔ اس سے پہلے ہی جوش ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آخر دسمبر 1925ء میں خلافت کانفرنس کا جلسہ کانپور میں ہوا تھا کوئی جوش وخروش نہ تھا۔ لوگ مرجھائے ہوئے تھے جبکہ اس سے قبل چراغاں تک کیا جاتا تھا۔ لوگ سوچتے تھے کہ ع

اب کیا رہا ہے جس پہ رقیبوں کا غم کریں

اسی وقت وہاں لوگوں نے اصلاحی کاموں پر توجہ مبذول کرنے کی ٹھان لی تھی اور سب سے زیادہ تعلیم کی جانب رجوع ہوئے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام یک گونہ تسکین کے لیے کافی تھا۔ اب سب نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں دماغی انقلاب لانے کی ضرورت ہے تب کوئی بڑا کام کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تک میں مکاتب دارالمطالعہ اور مدارس شبینہ قائم کیے جائیں۔ اس طفل تسلی پہ اجلاس ختم ہوا لیکن بعدہٗ اس محاذ پر کبھی ادنیٰ ترین توجہ بھی کسی نے نہ دی اور نہ اس کو لوازمات

ضروریات واسباب ووسائل پر غور کیا۔ ایک سنہری تجویز جو انتہائی مایوسی کے عالم میں منظور کی گئی تھی اور کاغذ کے قلوب کو قدرے سکون دینے کے لیے درج کر دی گئی تھی اور بس۔

# خلافت کانفرنس لکھنؤ

یہ حال تو دسمبر 1925ء کا تھا جب جولائی 1926ء میں وفد خلافت حجاز سے ناکام واپس آیا تو اب کوئی اسکیم کسی کے پاس نہ تھی لیکن فدا کارانِ خلافت اب بھی اصول کو تھامے ہوئے تھے اور تحریک کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا نہایت پر اثر اور صحیح نقشہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے کھینچا ہے۔ جس کے جستہ جستہ فقروں کو نقل کر دینے کے بعد کسی تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ 1927ء ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

"خلافت والے بے چاروں کو اب پوچھتا کون تھا۔ سارا جوش و خروش 1921 اور 1923ء تک ختم ہو چکا تھا۔ بچا کھچا اثر 1924ء اور 1925ء تک ساتھ دیتا رہا۔ اب نہ کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی اور نہ خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔ ایک خواب شیریں تھا جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھلا بھی چکے تھے۔ شوکت علی غریب بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کو سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے۔۔۔۔ بہر حال 1926ء کے آخر میں مرکزی خلافت کمیٹی نے طے کیا کہ خلافت کانفرنس کا اجلاس ایک بار پھر ہو اور اب کے اس کے ضمیمہ کے طور پر موتمر عالم اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔ خلافت کے صدر سیٹھ ہارون طے پائے اور موتمر کے صدر حکیم اجمل خاں۔ مقام اجلاس کے لیے قرعہ انتخاب لکھنؤ کے نام پر پڑا اور تاریخیں آخر فروری 1927ء کی قرار پائیں۔ ہمارے والنٹیروں (رضا کاروں) کی ٹولی جب بگوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی تو مجھے وزیر گنج کی ایک بوڑھیا کا فقرہ نہیں بھولتا۔ شہر پر یہ مختصر جلوس دیکھ کر وہ بولی 'اے لو خلافت پھر نکلی'، عوام کے دل سے اس کا تصور مٹ چکا تھا اب جو نام سنا تو جیسے بھولا ہوا خواب پھر یک بیک یاد پڑ گیا۔"[1]

اور وہ خلافت کمیٹی کے صدر مولانا عبدالماجد دریا آبادی تھے ان ہی کو مجلس استقبالیہ کا صدر مقرر کیا گیا۔

اب پھر مولانا ہی کا بیان سنیے۔

"بارات کے دولھا اب بھی یہی دو بھائی (علی برادران) تھے۔ تحریکِ خلافت کا اب دم واپسیں تھا۔ خلافت خود بھی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کی زندہ لاش کا سہارا یہی دو بھائی تھے۔ اتفاق سے خلافت کانفرنس کے صدر منتخب آ سکے اور نہ موتمر عالم اسلامی کے صدر منتخب۔ سیٹھ صاحب

---

[1] محمد علی حصہ اول ص 396

کی قائم مقامی مولوی حاجی شفیع داؤدی مظفرپوری نے کی۔ حکیم اجمل خاں کی جانشینی ڈاکٹر انصاری کے حصہ میں آئی:

"اب ذیل میں اپنا پورا خطبہ مجلس استقبالیہ درج کیے دیتا ہوں اس سے ایک اجمالی خاکہ اس زمانہ کی سیاست اور اس وقت کے مسائل کا نظر کے سامنے آجائے گا۔ (ہم اس کے جستہ جستہ فقرے نقل کریں گے)

"آج مختلف سمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی اور کچھ ضرورت ہو بھی تو کیا ضرور ہے کہ اس کو اسی نام کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ حیران ہوں کہ ان سوالات کا کیا جواب دوں۔ اس سے زیادہ بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ یہ سوالات کسی مسلمان کے دل میں پیدا کیونکر ہوئے؟

"ہم سے پوچھا جاتا ہے طنز اور بے دردی کے لہجہ میں پوچھا جاتا ہے کہ اب تک خلافت کمیٹی نے کیا کیا ہے۔ سوال ہم سے پوچھا جاتا ہے اس کا جواب ہم دیں؟ اس کا جواب اگر لینا ہے تو انگریزی عدالتوں کے در و دیوار سے پوچھو، پولیس کے رجسٹروں سے پوچھو، جیل خانوں کے دروازوں اور پھاٹکوں سے پوچھو، لوہے کی بنی ہوئی ہتھکڑیوں سے پوچھو اور ڈاکوؤں اور خونیوں کے سروں پر لگنے والی بھاری بھاری بیڑیوں سے پوچھو۔ اس کا جواب مصر سے لو، فلسطین سے لو، حجاز سے لو، ٹرکی سے لو، افغانستان سے لو، جاوا سے لو، ہر آزاد اور نیم آزاد اسلامی ملک سے لو ساری دنیائے اسلام سے لو اور اس پر بھی تشفی نہ ہو تو اللہ کے پاک فرشتوں کی زبان سے سنو اور انھیں آپس میں یہ چرچا کرتے ہوئے سنو کہ جب آزمائش کا وقت آیا، جب خلافتِ اسلامیہ کے لیے خطرے کی گھڑی آئی، جب اسلام کی موت و زیست کا سوال پیش ہوا تو اس وقت اللہ کے نام پر، اس کے آخری رسول کے پیام پر، اس کی شریعت کے احترام پر اپنا مال لٹا دینے والے، اپنی عزتیں اور شہرتیں قربان کر دینے والے، اپنا عیش و آرام نثار کر دینے والے، اپنی دنیا تاراج و برباد کر دینے والے، اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر لبیک کہنے والے بیڑیاں پہننے کے شوق میں طوق و زنجیر کے ذوق میں ننگے اور بھوکے رہنے کے اشتیاق میں پھانسی کے تختہ پر چڑھنے کی تمنا میں سینہ پر گولیاں کھانے کی طلب میں میدان میں اپنی تڑپتی ہوئی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانے کے ارمان میں جو خاک کے پتلے سب سے پہلے آگے بڑھے وہ غلام ہندوستان کے غلام مسلمان وہ مجبور ہندوستان کے مجبور فتیان رسول وہ اسی ظلمت کدہ کے بسنے والے خدمت گزارانِ خلافت ہی تھے۔ زود فراموش انسان، حیلہ باز انسان اور صبر و ضبط سے گھبرا جانے والا انسان ممکن ہے کہ ان واقعات کو آج بھول جائے یا قصداً بھلا دے لیکن اوراقِ لیل و نہار پر، روئے زمین کے ذرات پر، صحیفۂ کائنات کے ایک ایک صفحہ پر جس وقت تک ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فداکاری، اسماعیل ذبیح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی اور حسینؓ ابن علیؓ کے ذوقِ شہادت کے واقعات ثبت ہیں۔ اس وقت تک ان نامور سرداروں کے ادنیٰ سپاہیوں خلافتِ اسلامیہ کے خدمت گزاروں اور تحریکِ خلافت کے

علم بر داروں کی حقیر و ناچیز کوششوں کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔"

آخر میں مولانا دریاآبادی نے خلافت کمیٹی کے دو کام بتلائے۔

(۱) خلافت کمیٹی کو اپنی بساط و مقدرت کے موافق آج خلافتِ راشدہ کی جانشینی کرنا ہے اس لیے اس کے پھیلاؤ میں ساری دنیائے اسلام آجاتی ہے۔ ہندوستان بھی ہندوستان کے باہر بھی۔ لیکن اس کا اصلی اور مرکزی تعلق قدرتاً اسلام کے مرکزِ اصلی سے ہے..... ہندوستان پر اگر کوئی مصیبت آئی تو وہ یقیناً ہماری مصیبت ہوگی۔ ٹرکی و مصر و افغانستان و مراقش میں ہمارے بھائیوں کو دکھ پہنچا تو وہ دکھ بھی ہمارا دکھ ہوگا لیکن اگر خدانخواستہ اس مرکزِ اسلام قبلۂ دین مرکزِ ایمان کو ذرا بھی گزند پہنچا تو یہ ہمارے جسم کا صدمہ نہ ہوگا۔ خطرہ ہوگا ہماری جان کا، پامالی ہوگی ہماری روح کی، حملہ ہوگا ہمارے ایمان کا!... ہمارے ایمان پر سینکڑوں ہندوستان اور ہزارہا افغانستان، صدہا مصر اور بے شمار ٹرکی قربان ہیں۔ اس ارضِ پاک کے چپہ چپہ پر نثار ہیں۔ اس دیارِ حبیب کے ذرہ ذرہ پر کارلائل کا شمار اگر یہ کہہ کر بھی کہ "برطانوی قوم کو برطانیہ کی سلطنت چھن جانا قبول ہے مگر شیکسپیئر سے دست بردار ہو جانا قبول نہیں" وہ داناؤں میں باقی رہ سکتا ہے تو ایک مسلمان بھی ارضِ حجاز کے متعلق اس والہانہ عقیدت کو بیان کرنے سے نادانوں کے زمرہ میں نہیں آجاتا۔ لیکن اگر یہ نادانی ہے تو اس پر ہزاروں دانائیاں قربان اور اگر جنون ہے تو اس جنون پر ہزاروں خردمندیاں تصدق۔"

آج اس ارضِ نور کے مطلع پر..... ملوکیت اور استبداد کا بادل چھایا ہوا ہے اس کو جائز اور مناسب تدبیروں سے دور کرنا اور سرزمینِ قبلہ کو پھر اہلِ قبلہ کے سپرد کر دینا خادمانِ خلافت کا پہلا اور سب سے بڑا فرض ہونا چاہیے یہ جائز اور مناسب تدبیریں کیا ہیں اور کیونکر اختیار کی جائیں اس کا فیصلہ کرنا قوم کے اہلِ حل و عقد کا فرض ہے۔

(۲) ارضِ حجاز کی اس خدمت کے ساتھ ہی ساتھ خود اپنے وطن میں کام کا نہایت وسیع میدان موجود ہے یہ مشکل کیا ہے کہ ایک طرف موتمر کے ذریعہ ہم خدمتِ حجاز میں لگے رہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف اپنے ملک میں اپنی تعلیمی، تنظیمی، معاشرتی، سیاسی، دینی ہر قسم کی کوششوں کو بھی جاری رکھیں۔ ہر ہر مقام پر لڑکوں کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے رہیں۔ بے روزگاروں کو روزگار سے لگائیں، دوکانیں کھلوائیں چرخہ اور کھدر کی ترویج کرتے رہیں۔"[1]

اتنا لکھ کر شاید مولانا کو خیال آیا کہ ان کاموں کے لیے تو اور بھی انجمنیں پہلے سے موجود ہیں چنانچہ فرمایا کہ خلافت کمیٹی کسی کی حریف و رقیب نہیں ہے اور اس لیے مسلم اور غیر مسلم تمام انجمنوں کی جانب اشتراک کا ہاتھ بڑھایا جائے۔

---

[1] محمد علی حصہ اول ص 395

ان سب کا منشا یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کو مولانا محمد علی زندہ رکھنا چاہتے تھے اور حجاز میں اسلامی جمہوریہ سلطنت یا بالفاظ دیگر خلافت الٰہیہ کے قیام کی سعی کرنا اب بھی چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی نے یہ غور نہیں کیا کہ اگر سلطان ابن سعود راضی بھی ہو جاتے تو حجاز میں خلافت الٰہیہ کا بار اٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔ مسلمان حکومتوں کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ یہ جلتی بجھی ہوئی شمع کی آخری لو تھی اور اس کے بعد اگرچہ خلافت کمیٹی برائے نام قائم رہی اور اب بھی کہیں کہیں یہ نام سنا جاتا ہے۔ لیکن اصلاً و عملاً خلافت کمیٹی کا کام ختم ہو چکا تھا اور وہ از سرِ نو زندہ نہ ہو سکی۔ لیکن جو اہل دل ہیں وہ ان کے بانیوں اور کارکنوں کے بارے میں یہی کہیں گے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

# ایک آخری سوال

اس سے پیشتر ہم لکھ چکے ہیں کہ مہاتما گاندھی جو ایک مذہبی آدمی تھے اور اپنے کو سناتن دھرمی اور کہتے تھے اور پنڈت مدن موہن مالویہ جو ہندو قوم کے مسلمہ لیڈر اور بڑے ہی دھارمک انسان تھے جگت گرو شنکر آچاریہ آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھانند اور دوسرے کل ہند سیاسی لیڈروں مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ نے بقائے خلافت میں مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ ایک بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ خلافت کے قیام سے کسی وطنی جذبہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔

خلافت اور ...... EXTRA TERRITORIAL PATRIOTISM (بیرون ملکی حب الوطنی) دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ غیر ملکی وطن پرستی میں جارحانہ وطنیت کا عنصر شامل ہے اور اس کی بنیاد مادی ہے جبکہ خلافت خالص مذہبی اور دینی اور روحانی چیز ہے اور اس کا وطن دوستی سے ذرہ برابر بھی تصادم نہیں ہے۔

وقت کے تقاضوں نے انگریز کی سو سال کی محنت کو اگر اکارت نہیں کیا تو کم از کم پوری طرح وہ پھل نہیں لایا۔ یہ تو ہوا کہ ترکی اپنی عظیم مملکت سے محروم ہو گیا۔ یہ بھی ہوا کہ عرب ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ بھی ہم نے دیکھا کہ جن عربوں نے ترکی سے بغاوت کی وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ اور شام وغیرہ پر یورپ کی حکم برداری اس ذلت خیز شرط کے ساتھ حاوی کی گئی کہ ان کو تہذیب اور اپنا انتظام خود کرنے کا فن سکھانا ہے۔ لیکن آج ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ سب آزاد ہو چکے ہیں۔

حکم برداری کے قیام کے کچھ ہی دن بعد وہاں احتجاج شروع ہو گیا تھا اور فرانس پیک بینی و دو گوش جانے والا تھا۔ اسی پر علامہ اقبال نے لکھا تھا ؎

شام سے ہونے کو رخصت ہے وہ رندِ لم یزل — رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ حیرت کا مقام — رنگ یک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو کچھ فکرِ مداوا ہے ضرور — حکم برداری کے معدے میں ہے دردِ لایطاق

# تحریکِ خلافت کے انعامات و تاثرات

تحریکِ خلافت نے ہندوستان کو اور ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا دیا اس کا تذکرہ جستہ جستہ مختلف مقامات پر آیا ہے لیکن یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجملاً کل کو اس طرح نمبروار یکجا کر دیا جائے کہ بات مکمل اور ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ ذیل میں اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) تحریکِ خلافت نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو خواہ وہ کسی مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں ہندو ہوں یا بودھ یا جینی یا برہمو سماجی سناتن دھرمی ہوں یا آریہ سماجی سکھ عیسائی پارسی ہوں یا مسلمان سب کو پروانہ صفت آتشِ فرنگ کا طواف کرنے کی جبلّت سے آزاد کر کے اپنی فطرت کی تجلّی گاہ میں آباد ہونا سکھایا اس بات کی مزید وضاحت کے لیے اس زمانہ کے ماحول اور عام فکر اور دماغی اور نفسیاتی حالات پر گہری نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ آج ہم ذہنی آزادی کی جس بلندی پر پہنچ گئے ہیں اس کے پیشِ نظر اس پستی کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا ہر فرد انگریز کے اس جادو کا شکار ہو گیا تھا کہ انگریز اپنی تعلیم اور تہذیب میں ہم سے بہت بلند ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ مہذّب اور ہم غیر مہذّب ہیں اور وہ صرف دنیا کو جہل و کم فہمی سے نکال انسانیت کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچانا چاہتے تھے جہاں سفید فام باشندے پہنچ گئے ہیں اس لیے ہم اس پر راضی ہو گئے تھے کہ ان معلّمان تہذیب سے اکتساب فیض کریں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے کو ہندوستانی کہنے میں شرم اور تاج برطانیہ کی رعایا قرار دینے میں عظمت محسوس کرتا ہے۔ اس میں کسی کی تخصیص یا تمیز نہ تھی اور نہ کوئی استثنا تھا مسلم لیگ وغیرہ کی تو بات ہی کیا تھی سرسید خصوصیت سے اس کے شکار تھے۔ ان کی تحریک علی گڑھ کا مفصّل ذکر آچکا ہے۔ جس کسی نے سرسید کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید انگریزوں کو بہت مہذّب اور شریف اور ہندوستانیوں کو غیر مہذّب اور گنوار سمجھتے تھے۔ مثلاً وہ انگریزوں کے میز پر چھری کانٹے سے کھانے کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کے دستر خوان کا طریقہ قابلِ مذمت اور لائقِ تضحیک قرار دیتے ہیں۔ خلال کرنے کے طریقہ کا، طشت میں ہاتھ منہ دھونے اور کلّی کرنے کے انداز کا طرح طرح سے مذاق اڑایا ہے۔ انگریزوں میں جو بے جا شرم اور تکلّف کسی سے ملنے میں ہے کہ جب تک کوئی تعارف نہ کرائے وہ کسی اجنبی سے خطاب نہیں کرتے۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کی پرگوئی اور بے تکلفی

سے کرتے ہوئے اس طرح مذاق اڑاتے ہیں کہ ہندوستانی یہاں تک دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ برہ کے دن انڈے کھاتے ہیں۔ یہی حال خط نویسی کا ہے۔ انگریز اگر کم شناسائی ہو تو صرف "ڈیر سر" لکھ دیتے ہیں۔ اور ہندوستانی بہت لمبے القاب و آداب میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اسی کتاب میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ اور ہر مجلس میں ایک جذبہ کارفرما ہے کہ ہم برطانیہ کی رعایا ہیں گویا کہ ایک طے شدہ بات ہے اور اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔ انگریز کا جال ایسا پھیل گیا تھا اور ہمارے سب لوگ اس طرح احساسِ کمتری کے شکار ہوگئے تھے کہ اگر کسی کو گورنمنٹ راجہ کا خطاب دے دیتی تھی تو وہ تلوار لگا کر مسند پر اس طرح بیٹھتا تھا گویا وہ واقعی مطلق العنان راجہ ہے اور اس کے بزرگ (چچا وغیرہ) سب اس کے سامنے مؤدب آتے تھے اور اس کو "مہاراج" کہتے تھے۔ دماغوں میں اس طرح کا خلل ڈال دینا مدبّر کی عظیم فسوں کاری تھی۔

کانگریس کے معتدل لیڈر جو مطالبے کر رہے تھے وہ چند حقوق کے بارے میں تھے۔ انگریز کی غلامی سے نجات کے بارے میں نہیں تھے اور اسی کو اس وقت بڑی سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا مولانا حسرت موہانی نے جب آزادیِ کامل کا نعرہ لگایا تو ان پر انگریز ججوں کی عدالت میں بمبئی ہائی کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا ماسوا اللہ سے خوف نہ کرنے والا یہ درویش بوریہ نشین مرد خود آگاہ و حق پرست ذرا بھی نہ سہما اور اپنا مقدمہ خود بحث کیا۔ وکیل بھی نہ رکھا۔ انگریز جج نے فیصلہ دیا کہ محض خیال کی تبلیغ کوئی جرم نہیں ہے اور چونکہ ملزم نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جس سے آزادیِ کامل قائم ہو جائے اس لیے بری کر دیا۔ لیکن شاید یہ واحد استثناء ہے۔ لوکمانیہ تلک نے ضرور کہا کہ "سوراجیہ ہمارا حق ہے" اور وہ ضرور انتہا پسند تھے لیکن کانگریس میں ہمیشہ ان کی اقلیت رہی۔

تحریکِ خلافت نے علی گڑھ تحریک کو پارہ پارہ کر دیا۔ برطانیہ کے رعایا ہونے کے خیال کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ہندوستانی ہونے اور اپنے کو ہندوستانی کہنے پر فخر کرنا سکھایا، دلوں کی کدورتوں کو دھویا اور ارفع و اعلیٰ خودداری اور خود اعتمادی کے خیالات پیدا کیے۔ تحریکِ خلافت نے ان سب کا بیج بو دیا تھا جو پروان چڑھ کر اب تناور درخت بن گیا ہے۔ اس نے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا سکھایا اور انسان کو غلامی سے نکال کر آزادیِ کامل کی وادی میں لا کھڑا کیا۔ میدان تحریکِ خلافت ہی نے آراستہ کیا۔ منزل کی نشاندہی اسی تحریک کی بدولت ہوئی۔ یہ دیوانگی از خود رفتگی، یہ اپنے وجود کے احساس کی نعمت خلافت تحریک کی دین ہے۔ انفرادی قربانیوں اور آزادی کے لیے مرمٹنے کی آرزو دوسرے سے مفقود نہ تھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ غنچۂ بیداری جمہور تحریک خلافت ہی سے پیدا ہوا

اور اس کی دو وجہیں تھیں۔

(الف) پہلی جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست اور دولِ متحدہ کی اسلام دشمنی سے اب آخری وقت آگیا ہے اور مسلمانانِ ہند میں یہ احساس پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں ایک ملت کی حیثیت سے جس کے پاس طاقتِ دفاع بھی ہو ان کا وجود خطرے میں ہے اور اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اماکنِ مقدسہ کی حفاظت کا بھی سامان برباد ہونے والا ہے۔ واللہ اعلم کیا ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں نے آخری خندق کی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا اور برطانیہ کے مقابلہ میں بڑے جوش و اشتعال کے ساتھ میدان جما دیا۔

(ب) تحریکِ خلافت کو مردِ میدان گاندھی درویش خو، جیسا عظیم راست گفتار و راست کردار بلند ہمت اور جری قائد مل گیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید محمد فاخر الٰہ آبادی وغیرہ جیسے شعلہ بیان مقرر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مفتی کفایت اللہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں جیسے اہل علم اور ہندوستان کے تمام مسلم، غیر مسلم لیڈر بلا کسی استثنار کے گاندھی جی کے ساتھ آگئے اور تحریکِ خلافت تحریکِ آزادیِ ہند میں تبدیل ہوگئی۔ اپریل 1924ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے خود لکھا:

"خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا"

اور واقعہ ہے کہ اس عظیم انسان نے قوم کو جاگتے ہی رکھا تا آنکہ آزادی کا آفتاب طلوع ہوگیا۔

## وطنی جذبہ

تحریکِ خلافت نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا۔ ان کو محسوس ہوا کہ وہ ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ اس طاقت کو استعمال کریں تو برطانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں سے اتحاد و اتفاق لازمی ہے ہجرت کی تحریک جس طرح ناکام ہوئی اس نے بھی مسلمانانِ ہند میں اپنے ملک اور وطن سے محبت کے احساس کو تیز کر دیا۔

جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے سامنے آیا اس کو پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔ تحریکِ آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب صرف ایک جذبہ کارفرما

تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اس لیے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں ننگے سر اور ننگے پیر دا ے رضا کاروں سے بھر گیا۔ لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرے ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے "اللہ اکبر" مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے۔ کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے اور ردوش بدوش کام شروع کر دیا۔ ایک لہر تھی جو موج دریا کی طرح رواں دواں تھی کہیں اختلاف یا نفرت کا ایک دوسرے سے نام ونشان نہ تھا۔

حب الوطنی کا یہ بھی تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے وطن کی بنی ہوئی چیزوں سے محبت ہو۔ انگریز اپنے بدیشی مال اور خاص کر کپڑے سے جو لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیے ہوئے تھا اس کا پورا جواب کھدر چرکھے اور سودیشی سے دیا گیا۔ بدیشی کپڑوں کی گاؤں گاؤں ہولی منائی گئی، اس کی مذمت میں گانے لکھے گئے۔ ہائے ہائے، توبہ توبہ کے نعرے لگے اور ہندوستان اپنے کو کپڑوں کے معاملے میں خود کفیل بنانے کی منزل کی طرف چل پڑا۔

تحریکِ خلافت نے ہندوستان کے اندر ایک عام جذبہ منزلِ آزادیِ کامل کی جانب عزم وہمت سے چلنے کا اور راہ کی مشکلات ومصائب پر استقامت بالحق اور تمنائے سرفروشی سے کام کرنے کا عملی سبق دیا ہم چلے اور گرے ہم کو ٹھوکریں لگیں ہمارے لیڈروں نے غلطیاں کیں لیکن جو کارواں روانہ ہوا تھا اس کا بانگِ جرس خاموش نہیں ہوا۔ اور اس جذبہ کو تحریکِ خلافت نے جنم دیا تھا۔

شعرا نے اپنے کلام سے لہو گرما دیا۔ علامہ شبلی تو راہیِ ملک بقا ہو گئے مگر ان کی نظم ولولۂ تازہ دینے کے لیے باقی رہ گئی۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے ٹکڑے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

مولانا ظفر علی خاں ایک بڑے لیڈر اور ایک عظیم صحافی بھی تھے مگر سب سے پہلے وہ شاعر تھے۔ ہندوستان کے ایک ممتاز اور نامور عالم مولانا داؤد غزنوی جب گرفتار ہوئے تو انھوں نے خود اپنے پیروں سے چل کر جیل جانے اور جیل سے آنے سے محض تفننِ طبع اور انگریز سے اظہارِ حقیقت کے لیے انکار کر دیا تو ان کو دو کانسٹبل کندھے پر اٹھا کر لاتے اور لے جاتے۔ ظفر علی خاں کو اس سے اچھا مواد کہاں مل سکتا تھا۔ فرمایا

احباب نے پوچھا بہ تبسم کہ یہ کیا ہے
دی حضرت داؤد کو چوڑی جو لوگی نے

کیوں روشِ حکومت پہ چلیے ہو کے سوار آپ　　حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے
سن کر کے یہ فرمایا کہ میں عالمِ دیں ہوں　　اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے
کیوں آج نہ خوش ہوں کہ مری ران کے نیچے　　خود حضرتِ عیسٰی کی سواری کا گدھا ہے

لاہور میں لارنس کا مجسمہ کھڑا تھا۔ پبلک اسے توڑنا چاہتی تھی۔ گورہ فوج کا پہرہ لگا رہتا تھا۔ اسی درمیان ہندو اور مسلمانوں نے مل کر میونسپلٹی کی زمین پر مسجد اور مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے مندر بنوایا اور ہندوؤں نے مسجد۔ گورنمنٹ نے مسجد اور مندر دونوں کو گرا دیا۔ ظفر علی خاں کا طنز دیکھیے۔

اک روز میں نے عرض یہ سرکار سے کیا　　اے وہ کہ مجھ کو تجھ سے مجالِ سخن نہیں
اے وہ کہ ہے زمیں تری ہیبت سے دم بخود　　اور آسماں کو حوصلۂ دم زدن نہیں
سنتے ہیں تیرے دور میں قانون کا ادب　　شرمندۂ روایتِ عہدِ کہن نہیں
پھر کیوں خدا کے گھر ہی کو ڈھایا حضور نے　　بت پر حضور کس لیے لوہے بزن نہیں
مجرم یہ بت بھی ہے جو خدا ہے قصور وار　　اس کا بھی اعتراض سے خالی چلن نہیں
ٹالا مرے سوال کو اس عذرِ لنگ سے　　سرکار سے جواب کچھ آیا جو بن نہیں

انگریز وحشیانہ تعصب سے پاک ہے
محمود غزنوی کی طرح بت شکن نہیں

علامہ اقبال اس تحریک پر کچھ نہیں لکھ رہے تھے تو ظفر علی خاں نے ان پر بھی نظم لکھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا:

ع　تو خلافت کے مضامین تو پامال نہیں

مسلم لیگ اگرچہ مخالف نہیں تھی مگر تھی نوابوں، تعلقداروں اور سرمایہ داروں کی جماعت۔ اس کے اراکین کوئی عملی حصہ نہیں لے رہے تھے اور اصلیت تو یہ تھی کہ خلافت کمیٹی نے مسلم لیگ کو عضوِ معطل بنا دیا تھا۔ 1922ء میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سر آغا خاں ہندوستان صلح کرانے کے لیے آ رہے ہیں۔ اور وہ مسلم لیگ کو آلۂ کار بنا دیں گے۔ ظفر علی خاں نے فوراً کہا ؎

سنتے ہیں کہ کرزن کے اشارے پہ سر آغا　　ظلمت کدۂ ہند کو آباد کریں گے
وہ لیگ برس بھر میں بدلتی ہے جو کروٹ　　اس مرتبہ آپ اس میں کچھ ارشاد کریں گے
خسرو سے چھڑائیں گے ادھر دامنِ شیریں　　شیریں کو ادھر مائل فریاد کریں گے
کہہ دو یہ سر آغا سے کہ اسلام کے فرزند　　خود اپنے خدا سے طلب امداد کریں گے
ہرگز نہ گدائی کے لیے جائیں گے لندن　　ترک آج سے یہ شیوۂ مُنہاد کریں گے

اسلام کے دربار سے جو فیصلہ ہوگا
انگریز اسی فیصلہ پر صاد کریں گے

مولانا حسرت موہانی تو پکے سیاسی آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد حصولِ آزادیِ کامل تھا۔ ان کی شاعری تو انگریز دشمنی اور مجاہدانہ عمل کے جذبہ سے بھری ہوئی ہے ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

روح کو محوِ جمالِ رخِ تاباں کرلیں　　ہم اگر چاہیں تو زنداں کو گلستاں کرلیں

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ رقیباں کا رنگ　　اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے
حسرت و آزاد پر جورِ غلامانِ وقت　　از رہِ بغض و عناد دیکھیے کب تک رہے

گاندھی جی کے بعد حسرت بھی گرفتار ہوئے اور سابرمتی جیل میں بند کیے گئے۔ وہاں ایک غزل کہی۔

کچھ یاد بھی ہے وہ عہدِ سابق　　اے دشمنِ دوستانِ صادق
کچھ بات ہے میرے حسنِ ظن کی　　ہے جور ترا کرم پہ فائق
حسرت کو دیارِ عاشقی کی　　زنہار نہیں ہوا موافق

یہ تو بڑوں کا حال تھا۔ ایک ظریف شاعر "احمق پھپھوندوی" نے زمیندار میں اپنی مزاحیہ نظمیں بھیجیں۔ غلام رسول مہر جو میرے ساتھ وہاں جوائنٹ ایڈیٹر تھے ان کی رائے ہوئی کہ ان کو بڑھاوا دیا جائے۔ چنانچہ ان کی نظموں پر وہ اصلاح دے کر اسے شائع کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ اکثر اخبار زمیندار میں ان کی نظمیں آنے لگیں اور وقت کے ساتھ کلام پختہ ہوتا گیا اور آخر میں تو بہت اچھے مزاحیہ شاعر ہوگئے تھے۔ نثر بھی خوب لکھی جیل بھی گئے۔ اب انتقال ہوچکا ہے۔ ان کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ ع

جیل خانہ میں ہے سسرال کی لذّت احمق

تک بندیاں تو اتنی ہوئیں کہ ان کا شمار نہیں۔ ہر شخص اپنی طبیعت کی جولانی دکھاتا تھا۔ ایک صاحب نے جب حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے امیر فیصل پر اعتراض کرنا چاہا تو کہا کہ ع "امیر فیصل جو اک مردِ فضول ہے"

## انگریز سے دشمنی

عیسائیوں کا ایک اصول ہے اپنے دشمنوں سے محبت کرو۔ مہاتما گاندھی تو خیالات و افکار

اور اصول کی ایورسیٹ کی چوٹی سے بات کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں انگریزوں سے کوئی عداوت نہیں رکھتا میں تو صرف نظامِ حکومت کی مخالفت کرتا ہوں جو شیطانی ہے۔ مگر جب ہماری عوام کا مرحلہ سامنے تھا تو اس بلندی پر تو کام ہو نہیں سکتا تھا۔ اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے آقایانِ فرنگ سے نفرت پیدا ہو جانا لازمی تھا جو اس شیطانی حکومت کے بانی تھے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے خلافت تحریک کا ایک تحفہ انگریز دشمنی بھی تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن تو اس معاملہ میں سب سے آگے تھے اور اسی کے ساتھ تمام تحریکِ خلافت میں کام کرنے والے اس معاملہ میں ان کے پیرو تھے۔ چنانچہ انگریز سے دشمنی پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کے افسانے اور واقعات گڑھے جاتے تھے۔

گاندھی جی تو روحانیت، اخلاقِ فاضلہ کردارِ اعلیٰ عفو وکرم کی بات کرتے تھے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ ان باتوں پر مضبوط تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگر کوئی تمہیں دھوکا دے تو پھر اس پر بھروسہ کرو اور پھر دھوکا دے تو پھر بھروسہ کرو۔ دھوکا دینے والا گھاٹے میں ہے دھوکا کھانے والا فائدہ میں ہے۔ اور گاندھی جی کی تعلیم بے اثر بھی نہیں رہی۔

ہندوستان اس خون خرابے سے بچ گیا جس سے فرانس، روس اور چین اپنے انقلاب کے دوران گزرے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اسامیوں نے زمینداروں کا اور مزدوروں نے سرمایہ داروں کا خون نہیں بہایا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا۔ تحریکِ خلافت نے وہ پردہ جو زبانوں پر پڑا ہوا تھا ہٹا دیا اور مسلمان کھل کر سامنے آگیا۔ جو پیغام تحریکِ خلافت نے دیا وہی ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد بنا اور اسی پر آئندہ جدوجہد کا قصر تعمیر ہوا جس سے ہم آزادیٔ کامل سے دوچار ہوئے۔ گاندھی جی کی قیادت میں مسلمانوں نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد اور سودیشی کھدر چرخہ کی راہ سے وہ انگریز کو نکال سکیں گے۔ ان کی اسکیم یہ تھی جو مولانا محمد علی بار بار دہراتے تھے کہ اگر ہم انگریز کو ہندوستان سے خارج کر دیں تو اس کا نوآبادیاتی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے ممالک بھی آزاد ہو جائیں گے تو انگریز اپنے چھوٹے سے جزیرہ میں جاکر بند ہو جائے گا جو یوپی سے بھی کم ہے اور جس میں آلو کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح انگریزوں نے بلادِ اسلامیہ کو جو زبردست نقصان پہنچایا ہے اس کا بھرپور انتقام بھی مل جائے گا اور آئندہ کے خطرے سے بھی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ مولانا محمد علی بار بار کہتے تھے کہ چرخہ ایک توپ ہے جس کا گولہ براہ راست برطانیہ کے قلب پر گرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تحریکِ آزادی میں آگے آگے ہو گیا اور سارا ہندوستان جاگ اٹھا۔ تحریکِ خلافت کا یہ سب سے بڑا عملی نتیجہ تھا۔ یعنی تحریکِ خلافت ختم ہو کر کل ہندوستان کو تحریکِ آزادیٔ وطن دے گئی۔

# سادگی اور خود آگاہی

علم النفس کا یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ ہر انسان کا باطن اس کے ظاہر سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے انگریزی کی ایک مثل ہے "درزی انسان کو شریف بناتا ہے"، یعنی کسی کو اچھے کپڑے پہنا دو تو وہ مہذب کلام اور مہذب عمل کرنا شروع کر دے گا۔ ہندوستان کی غلامی کا نتیجہ یہ تھا کہ اپنی تمام روایات سے بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ اسی میں اپنا لباس بھی شامل تھا۔ انگریزوں کی طرح کا لباس پہننا۔ انگریزی بولنا اور ہر بات میں انگریز کی تقلید کرنا طرۂ امتیاز شمار ہوتا تھا۔ یہ گاندھی جی کی عظیم ذہانت اور ان کے تفکر و تدبر کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے چرخہ کھدر اور سودیشی کو رواج دیا اور بیک جنبش سارا مغربیت کا قلعہ مسمار ہوگیا۔

مسلمانوں میں تقلید فرنگ اور امارت پسندی و جاہت طلبی کا زور دوسروں سے زیادہ تھا گاندھی جی کی تعلیم کے ما درار مسلمانانِ ہند جو دل کھول کر طرابلس الغرب اور بلقان کی جنگ میں اپنے جذبات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اب اس وقت جب ترکی کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو رہی تھی اور حجازِ مقدس تک اغیار کے قبضہ میں جانے والا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ یہ سب محض ان کی بد اعمالیوں اور سیہ کاریوں کے نتائج تھے۔ اس لیے سب کی جبینِ نیاز بارگاہِ قدس کی چوکھٹ پر جھک گئی تھی اور سب نے احکامِ الٰہیہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا تھا۔ اس میں پہلی چیز جو نظر آتی تھی وہ یہ کہ تقریباً سب نے سروں کے انگریزی بال کٹا دیے۔ کرتا پائجامہ بغل میں ایک جھولا اور گاندھی ٹوپی اختیار کر لی اور سادہ سے سادہ زندگی گزارنے لگے۔

لباس کی سادگی اسلام کی خصوصیات میں ہے۔ مسلمانوں نے یہ سادگی مذہبی نقطۂ نظر سے اختیار کی تھی۔ اس سے خیالات میں بلندی، فکر میں پختگی اور ذہن میں حق شناسی کے جذبات پیدا ہوتے۔ مسلمانوں نے گاندھی ٹوپی بھی اختیار کر لی۔ انگریز کے پٹھو جو ہر جگہ اسلام کا نام محض انگریز کی حمایت کے لیے لیتے تھے فوراً دوڑ پڑے اور کہا کہ گاندھی ٹوپی کا پہننا جائز ہے؟ جواب دیا گیا۔ لیکن سب سے زیادہ موثر جواب یہ تھا کہ خود علمار نے گاندھی ٹوپی پہن لی ہے۔

# عصرِ جدید

خلافت کی تحریک نے اس عہد نو کی خبر دی جو پرانے معتقدات اور اندازِ زندگی کو پارہ پارہ کر کے ایک نئے زمانہ کو جدید خیالات و افکار کے ساتھ وجود میں لانے والا تھا جب انسان استبداد اور استعماریت جاگیرداری اور غلامی کی تاریکی سے نکل کر آزادی انصاف مساوات اور خودگری و خودنگری کی شعاعِ نور میں

داخل ہونے والا تھا۔ علامہ اقبال کی دیدہ وری نے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک نوجواں اقوامِ نو ملت کے ہیں پیرایہ پوش

آج ایشیا اور افریقہ خواب سے بیدار ہو چکے ہیں بے شمار آزاد سلطنتیں بن گئی ہیں۔ یورپ کی استعماریت ان کا غرور، علمی تہذیب ان کی طاقت و قوت کا زور ان کا سیاہ فام باشندوں پر حکومت کرنے کا حق غرضیکہ ہر وہ چیز جو در اصل بلا اور آفت تھی لیکن شرافت اور خدمت کا فرضی لبادہ اوڑھے تھی فنا ہو چکی ہے۔ برطانیہ کو ناز تھا کہ ان کی مملکت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ آج ان کے چھوٹے سے ملک پر کہر چھایا ہوا ہے۔ غرضیکہ خلافت کی تحریک وہ پہلا قدم تھا جس نے افریقہ اور ایشیا کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے دیکھا جس سے وہ آج تک بے خبر تھے کہ:۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اس نقطۂ نگاہ سے تحریکِ خلافت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ناشکری ہوگی اگر مہاتما گاندھی کا بھی ذکر نہ کیا جائے جس عہد نو کا پیغام لے کر تحریک خلافت آئی تھی اسے عملی جامہ پہنانا اور اسے فروغ دینے کا کام اسی مردِ خود آگاہ اور درویش خو کا کام تھا جو تدبّر و فراست کے ساتھ حقانیت، سچائی، جرأت اور بہادری، انسانیت سے محبت اور جد و جہد میں پامردی کا مجسمہ تھا اور اس کی قیادت نے وہ کام انجام دیا جس کا نعرہ تحریکِ خلافت نے دیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اگر تحریکِ خلافت کو اس عظیم انسان کی قیادت میسّر نہ ہوتی تو نہ تحریکِ خلافت کا وجود ہوتا اور نہ اس کے ہمہ گیر اثرات پیدا ہوتے اور غالباً یہ ملک ہندوستان بھی آزادیٔ کامل سے اس قدر جلد ہمکنار نہ ہوتا۔

# کتابیات


| | | |
|---|---|---|
| 1 | آپ بیتی، حصہ اول | ظفر حسن ایبک |
| 2 | آپ بیتی، حصہ دوم | 〃 〃 |
| 3 | آتم کتھا | ڈاکٹر راجندر پرشاد |
| 4 | آثار جمال الدین افغانی | قاضی محمد عبد الغفار |
| 5 | ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء | شاہ ولی اللہ محدث دہلوی |
| 6 | امارت شرعیہ | مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی |
| 7 | اسرار خودی | علامہ اقبال |
| 8 | اسبابِ بغاوتِ ہند | سر سید احمد خاں |
| 9 | پیامِ مشرق | علامہ اقبال |
| 10 | تاریخ انگورہ | محمد الدین فوق |
| 11 | تبرکاتِ آزاد | غلام رسول مہر |
| 12 | جمعیۃ العلماء پر ایک تاریخی تبصرہ | مولانا حفیظ الرحمٰن |
| 13 | جمعیۃ العلماء کیا ہے حصہ اوّل | مولانا سید محمد میاں |
| 14 | جمعیۃ العلماء کیا ہے حصہ دوم | 〃 〃 |
| 15 | حسرت | ڈاکٹر احمر لاری |
| 17 | حیات سلیمانی | شاہ معین الدین احمد ندوی |
| 18 | خلافت اور انگلستان | ڈاکٹر سید محمود (ترجمہ از انگریزی) |
| 19 | خطبۂ صدارت مولانا محمد علی مونگیری (اجلاس جمعیۃ علماء بہار) | مرتبہ سید شاہ نور الحسن ناظم مجلس استقبالیہ |
| 20 | خلفاء راشدین | شاہ معین الدین احمد ندوی |
| 21 | خلافت و ملوکیت | ابو الاعلیٰ مودودی |
| 22 | ذکرِ آزاد | عبد الرزاق ملیح آبادی |

| | |
|---|---|
| 23۔ رموزِ بے خودی | علامہ اقبال |
| 24۔ روداد چمن | مولانا محمد علی مرتبہ محمد شمس العارفین |
| 25۔ رئیس الاحرار | عزیز الرحمٰن جامعی |
| 26۔ سیاسیاتِ ہند 1832 لغایتہ 1932 | ترجمہ سرجان کنگ |
| 27۔ سیرۃ محمد علی | رئیس احمد جعفری |
| 28۔ علمائے حق حصہ اول | مولانا سید محمد میاں |
| 29۔ علمائے حق حصہ دوم | " " |
| 30۔ کمال اتاترک | محمد توفیق |
| 31۔ محمد علی حصہ اوّل ( ذاتی ڈائری کے چند ورق) | مولانا عبدالماجد دریابادی |
| 32۔ محمد علی حصہ دوم ( ذاتی ڈائری کے چند ورق) | " " |
| 33۔ محمد علی کی یاد میں | صباح الدین عبدالرحمٰن |
| 34۔ مقالاتِ محمد علی حصہ اوّل | مرتبہ رئیس احمد جعفری |
| 35۔ مقالاتِ محمد علی حصہ دوم | " " |
| 36۔ محکمۂ قضا | مولانا عبدالصمد رحمانی |
| 37۔ مسئلہ امارت | " " |
| 38۔ مسئلہ خلافت | امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد |
| 39۔ مضامین محمد علی | مرتبہ محمد سرور |
| 40۔ مقالاتِ جمال الدین افغانی | سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے |
| 41۔ مولانا محمود حسن | اقبال حسن |
| 42۔ نقشِ حیات جلد اوّل | مولانا حسین احمد مدنی |
| 43۔ نقشِ حیات جلد دوم | " " |
| 44۔ برہان ستمبر 1972ء | دہلی |
| 45۔ زمیندار 1921ء لغایتہ 1923ء | لاہور |
| 46۔ مشرق 1918ء لغایتہ 1922ء | گورکھپور |
| 47۔ معارف نومبر 1972ء لغایتہ 1973ء | اعظم گڑھ |